حیاتِ اجمل

مرتبہ
قاضی محمد عبدالغفار



مسیح الملک حکیم اجمل خان

۶۰ برس میری زندگی جس مسلسل نشیب و فراز سے گزری اُس کی حالت یہ رہی کہ اگر شام کو "نشیب" ہے تو صبح کو "فراز" اور صبح کو "فراز" ہے تو شام کو "نشیب"! اِسی لئے میری زندگی میں میرے ارادوں کا عمل دخل ہمیشہ بہت کم رہا! — ارادوں کی پیہم تحلیل اور مقاصد کے مسلسل انہدام کا یہ سلسلہ کبھی رُکا ہی نہیں! اور اس حالت میں جب صورت یہ تھی کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

میں خود اپنے ادھورے عزائم سے ہمیشہ لڑتا رہا ہوں اُس کی ایک مثال یہ کتاب بھی ہے جس کا مسودہ آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے تیار کیا گیا تھا۔ میری طرح وہ مسودہ بھی بہت سے نشیب فراز سے گزرا۔

اِس کتاب کی اشاعت کا سوال عرصہ تک ایسے اصحاب کے اختیار میں رہا جو یا تو اس کی اشاعت پسند ہی نہ کرتے تھے یا حکیم اجمل خاں مرحوم کی زندگی کی عظمت سے بے پرواہ ہو چکے تھے۔ یہ غنیمت ہے کہ میری زندگی کے انقلابوں میں یہ مسودہ ضائع نہ ہوا۔ مگر یہ احسان مجھ پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کا ہے، جنہوں نے عرصہ تک اُسے اپنے پاس محفوظ رکھا اور کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح وہ شائع ہو جائے۔ حکیم صاحب مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں ہونے کی وجہ سے اُن کی یہ تمنا تھی کہ جلد یہ کتاب شائع ہو جائے۔ اُنہوں نے خود اس مسودہ کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا۔ آخری دفعہ جب وہ جیل میں تھے تو اُس فرصت میں اُنہوں نے اس مسودہ پر گہری نظر ڈالی۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا اس کتاب کی ترتیب میں بڑا حصہ ہے۔ حکیم صاحب کے سیاسی مشاغل کے متعلق اُنہوں نے جو یادداشت مرتب کر کے مجھے دی تھی اس کے بہت سے دلچسپ اقتباسات پر کتاب کا ایک اہم جزو مبنی ہے۔ جس وقت یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ مسودہ میرے قبضہ سے نہ نکل جائے تو مرحوم نے اُسے اپنے پاس جیل میں منگا لیا تھا اور پھر آٹھ دس سال یہ اُن ہی کے پاس رہا اور وہ کوشش کرتے رہے کہ اُس کے شائع ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اُس وقت اس مسودہ کا پھیلاؤ ہزار صفحات بھی زیادہ تھا، بعد میں طباعت کے اخراجات میں تخفیف کر کے کتاب کی قیمت کو کم سے کم کرنے کی غرض سے مسودے کے بعض اجزا نکال دینے پڑے۔

اپنی عمر میں آخری دفعہ جب ڈاکٹر صاحب مرحوم حیدرآباد گئے تو

وہاں میں نے اُن سے کہا کہ اب میں حیدر آباد ہی سے یہ کتاب شائع کرنے کا کچھ انتظام کرسکتا ہوں۔ اُنہوں نے دہلی واپس جاتے ہی یہ مسودہ مجھے بھیج دیا ـــــ اُس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے میری امانت مجھے واپس کررہے ہیں! ـــــ چند ہی روز بعد اُنہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا اور اس طرح حکیم صاحب کے بعد میری زندگی کا یہ دوسرا ستون بھی منہدم ہوگیا۔

(٥)

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد جب میں نے اس مسودہ کے اوراق کو کھولا تو دیکھا کہ میرے لکھے ہوئے پورے دو باب غائب ہیں۔ اُن کے دوبارہ لکھنے کے لئے میرے پاس مواد موجود نہ تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر میرے ارادوں نے حالات سے شکست کھائی۔ تین سال ہوئے کہ یکایک مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ گم شدہ اوراق ڈاکٹر صاحب کے کاغذات سے برآمد ہوگئے ہیں۔ لہذا پھر میں نے کتاب کی اشاعت کا ارادہ کیا اور بمبئی کے ایک پبلشر کو وہ مسودہ دے بھی دیا۔ لیکن چند روز بعد پھر حالات نے ایک پلٹا کھایا اور مجھے یہ مسودہ پبلشر سے واپس منگانا پڑا۔

(٥)

ان تین شکستوں کے بعد میرے ارادوں پر مایوسی چھاگئی اور اب خود میری صحت اور عمر اس منزل پر تھی جب ولولے اور حوصلے ضعیف ہوجایا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کتاب کے شائع کرنے کی آرزو سے تقریباً دست بردار ہوچکا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم کی بے پایاں محبت اور شفقت کہ جو قبضہ مجھ پر عائد ہے اُسے میں اب کبھی ادا نہ کرسکوں گا۔ لیکن پھر

ایک دفعہ میری اس آرزو کا "نشیب" مائل بہ "فراز" ہوا۔ اس دفعہ اول تو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے میری ہمت بندھائی اور اس طرح سوکھے ہوئے چشمہ میں پھر پانی آیا۔

حضرت مولانا اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں دونوں حکیم صاحب مرحوم کے حلقہ محبت میں اپنا اپنا مقام رکھتے تھے۔ مولانا ایک مخلص دوست اور شریک کار کی حیثیت سے اور ڈاکٹر صاحب ایک عزیز نوجوان کی حیثیت سے جنہیں مرحوم بہت چاہتے تھے۔ اس دفعہ ان دونوں کی تائید نے اس سوکھے کھیت کی آبیاری کردی اور بالآخر وہ وقت آہی گیا کہ میں ایک ایسے بڑے انسان کی یاد کو تازہ کروں جس نے آزاد ہندوستان کے تصور پر اپنی زندگی کا سب کچھ قربان کردیا تھا۔

———— (٭) ————

اس کتاب کی ترتیب میں، جو سوانح حیات بھی ہے اور ایک حد تک ہندستان کے ایک دور کی سیاسی تاریخ بھی، میں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں حکیم صاحب کی تصویر اس طرح لگائی ہے کہ جو کوئی ان کی زندگی کے حالات پڑھے وہ اس زمانہ کے سیاسی ماحول سے بھی واقف ہوتا جائے۔ یہ دور مہاتما گاندھی کی قیادت کا دور تھا جس میں مہاتما جی کے حلقہ میں ملک کے جانباز فدائیوں کا ایک نورتن جمع ہوگیا تھا۔ اُس نورتن میں سے سوائے حضرت مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اب کوئی باقی نہیں ہے۔ اگر اس زمانہ کے ان تمام لیڈروں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے جو مہاتما جی کے ساتھ کام کر رہے تھے تو وہی تحریک آزادی کی تاریخ ہوگی۔ اب قیادت کے اس نئے دور کا بڑا المیہ یہ ہے کہ گزرے ہوئے دور کی روایات کی

حفاظت کرنے والا بھی.....سوائے پنڈت جواہرلال نہرو، مولانا آزاد اور مہاتما کے دو چار اور ساتھیوں کے کوئی نظر نہیں آتا۔ آزادی کی صبح کا آفتاب کتنا دھندلا ہے!!

(۵)

اپنی زندگی کی آخری منزل پر جب آزاد ہندوستان کے موجودہ حالات نے میرے اور مجھ جیسے لوگوں کے دل کی تسکین کا بہت سا سرمایہ برباد کر ڈالا ہے مجھے صرف اس خیال سے کچھ تسکین حاصل ہوتی ہے کہ میں نے ان اوراق میں اپنے قلم کی حقیر پونجی سے محبت، نیازمندی اور اخلاص کا خراج ادا کیا ہے۔ اگر کسی دوسری دنیا میں بھی حکیم صاحب مرحوم اس دنیا والوں سے دور نہیں ہیں — اور ہمارے دلوں سے تو یقیناً دور نہیں ہیں۔ تو ان کی روح یہ دیکھ کر بہت غمگین ہوگی کہ اُن کے زمانہ میں ملک کی آزادی کے سپاہیوں کا قافلہ کس سمت میں سفر کر رہا تھا اور اب کہاں پہنچا ہے! آج آزادی کا اقتدار کچھ اس طرح تقسیم ہوا ہے کہ اگر اجمل خاں اور موتی لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری اس دنیا میں واپس آئیں تو وہ اُسے پہچان نہ سکیں! بہرحال حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا ایک گوشہ ان اوراق میں پیش کر کے میں نے یہ چاہا ہے کہ جو کم مایہ لیڈر آج سب کچھ اپنے ہی لئے اور اپنا سمجھ رہے ہیں انہیں معلوم ہو کہ پچھلے دور کے اُن لیڈروں نے جن کے پیشوا مہاتما گاندھی تھے حق پرستی اور مخلصانہ قربانیوں کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ آج بھی بہت سی آنکھوں کو جنہیں روشنی کی ضرورت ہے، روشنی عطا کر سکتے ہیں؛

اگر وہ آنکھیں حقیقتوں کو دیکھنا گوارا کریں!

اس کتاب کے کسی ایک لفظ سے بھی اگر حقیقت کی روح کسی سوئے

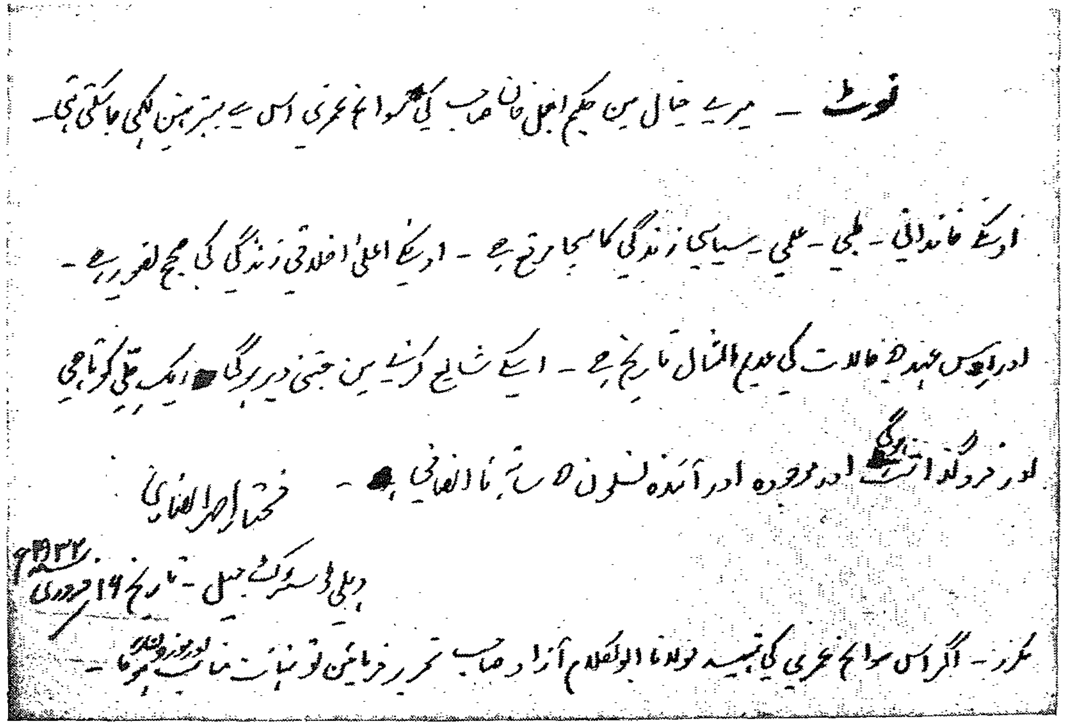
ہوئے ضمیر کو بیدار کرسے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں اپنی محنت کا صلہ پا لیا!

علی گڑھ

۱۷ ستمبر سنہ ۵۰ء

محمد عبدالغفار

تاریخی پس منظر



نوٹ — میرے خیال میں حکیم اجمل خاں صاحب کی سوانح عمری اس سے بہتر نہیں لکھی جا سکتی تھی —

اور یہ خاندانی — طبی — علمی — سیاسی زندگی کا سچا مرقع ہے — اور ان کی اعلیٰ اخلاقی زندگی کی صحیح تصویر ہے —

اور اس عہد کے حالات کی عدیم المثال تاریخ ہے — اس کے شائع کرنے میں جتنی دیر ہوگی ایک قومی گناہ ہی

ہوگی اور فرو گذاشت اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے ساتھ ناانصافی ہے —

مختار احمد انصاری

دہلی ڈسٹرکٹ جیل — تاریخ ۱۹ فروری ۱۹۳۲ء

مکرر — اگر اس سوانح عمری کی تمہید مولانا ابوالکلام آزاد صاحب تحریر فرمائیں تو نہایت مناسب اور موزوں ہوگا —

عکس تحریر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم

اندرپرست

تین ہزار تین سو برس — اس سے بھی کچھ زیادہ — اتنے دن گذرے جب جمنا کے کنارے اندرپرست آباد تھا۔ اُس کے افسانے راماین کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں۔ حساب تو لگائیے کہ اُس دن سے آج تک جمنا کے دھارے پر کتنا پانی بہ چکا ہوگا! اُس بہتے ہوئے پانی میں اگر دو آنکھیں ہوتیں تو اُنھوں نے اندرپرست کی پہاڑیوں پر انسانی آبادی کے کیا کیا تماشے دیکھے ہوتے!۔ کلجگ کا سارا دَور اُن آنکھوں کے سامنے گذرا ہوتا!

دو ہزار تین سو برس گذرے جب سکندر نے آریہ ورت کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور اس طرح دنیا کی دو قدیم اور عظیم الشان قوموں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی تھی۔

ایک ہزار برس سے زیادہ نہیں گذرے کہ محمود غزنوی متھرا اور قنوج کی فصیلوں تک آیا تھا۔ پھر اس سلسلہ کے کتنے ہی فاتح وسط ایشیا سے اندرپرست کی سرزمین کی طرف آتے رہے۔ مگر گذشتہ صدیوں میں لوگ وسط ایشیا کے نام سے بھی ناواقف ہوگئے تھے تاآنکہ جدید اشتراکیت کے طوفان نے قدیم تاریخ کے تمام پردے چاک کر ڈالے۔

غزنوی کے حملہ کو ابھی پورے ۲۰۰ سو برس نہیں گذرے تھے کہ غوری نے ملتان و گجرات و سندھ پر دھاوا کیا۔ اُس وقت راجپوتوں کی چار طاقتور حکومتیں دلی اجمیر قنوج اور گجرات میں قایم تھیں۔ ان سب نے مل کر وسط ایشیا کی طرف سے آنے والی آندھیوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ یہ مقابلہ محض تیغ و تفنگ اور تیر و تبر ہی کا نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دو مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں، ایک طرف قدیم

آریہ ورت کا تمدن تھا اور دوسری طرف وسط ایشیا کی جدید تہذیب۔ پہلی دفعہ دریائے سرسوتی کے کنارے غوری نے شکست کھائی۔ پھر دوسری دفعہ اُس نے رائے پتھورا کو شکست دی۔ اس دفعہ راجپوتوں کے باہمی نزاع نے انہیں کمزور کر دیا تھا اور اس لئے غزنی سے جو آندھی اٹھی اُس کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔

غوری کے غلاموں نے ایک نئی شاہی اور شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا۔ اسی دور میں ہندستان نے پہلی دفعہ مغلوں کا نام سُنا۔ ان ہی مغلوں اور تاتاریوں کے ابتدائی قافلوں کا ایک سردار چنگیز خاں تھا جو سنہ ۱۲۲۱ء میں دریائے سندھ تک بڑھ آیا، لیکن اُس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

خلجی خاندان صرف ۳۰ سال کے اقتدار کے بعد سنہ ۱۳۲۰ء میں ختم ہو گیا، لیکن یہ اقتدار ہندوستان کے اکثر جنوبی اور ساحلی صوبوں تک نئے تمدن کے جھنڈے گاڑ چکا تھا۔ غیاث الدین تغلق اور خاندانِ تغلق نے خلجیوں کے مقام پر قبضہ کیا۔ وہ بھی وسط ایشیا کا ترکی النسل خاندان تھا۔ سنہ ۱۳۲۰ سے سنہ ۱۳۹۸ تک اس خاندان نے اُس عمارت کے نقشے بنائے جس کے مینارے، بابر، ہمایوں اور اکبر تعمیر کرنے والے تھے۔ سنہ ۱۳۹۸ء میں تیمور لنگ کے حملے نے خاندان تغلق کی تاریخ کے آخری صفحے پر تمت لکھ دیا۔ نئے فاتح کا سلسلۂ نسب بھی چنگیز کی نسل سے مربوط تھا۔ وسط ایشیا اور ایشیائے کوچک اُس کے زیر نگیں تھا۔ جمنا کے اُس پار فیروز آباد کے قریب یہ معرکہ ہوا اور محمود تغلق شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے دلّی میں اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر کے

اور خضر خان کو اپنا نائب السلطنت مقرر کرکے اپنے گھوڑے کی باگ سمرقند کی طرف پھیر دی، اس طرح خضر خان سے خاندانِ سادات کی ابتدا ہوئی۔ ۴۰ سال بعد خاندان لودی نے اقتدار حاصل کیا اور اور ۷۵ سال تک بابر کی آمد کا راستہ تیار کرکے وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس طرح آخر ۱۵۲۶ء میں چنگیز اور تیمور کا جانشین اور وسط ایشیا کے چغتائی خاندان کا اقبالمند علمبردار بابر، ابراہیم لودی کو پانی پت کے میدان میں شکست دیکر شمالی ہندستان کی سلطنت پر قابض ہوا۔

جب وسط ایشیا سے سمرقند و بخارا کے یہ دَل بادل دہلی کی طرف اُمنڈ رہے تھے تو اُن کے ساتھ ساتھ اُس ملک کے لاکھوں سپاہی اور اہلِ لشکر جن میں ترکان تیموری اور اُس ولایت کے ہزارہا خوانین اور سردار بھی شامل تھے اپنی تہذیب و تمدن کا سرمایہ لیکر ہندستان میں داخل ہوئے۔ اس ہنگامہ خیز عہد میں جب سمرقند سے دلی اور دلی سے دکن و گجرات و بنگال تک ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا ساز و سامان تیار ہو رہا تھا خدا جانے ہندستان میں کتنے مشاہیر وقت علما، فضلا، سپاہی، اور مفکر بابر کے ہمرکاب آئے۔ ان لوگوں کی کوئی تفصیلی فہرست اُس عہد کا مورخ پیش نہیں کر سکا۔ واقعاتِ بابری اور ایسی ہی دوسری تاریخیں اس معاملہ میں خاموش ہیں۔

خاندانِ شریفی کے مورثِ اعلیٰ

اجمل خاں اور خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ بابر کے ساتھ ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ ہندستان آئے۔ اس حقیقت پر سب سے بڑی سند حکیم محمود خاں اعظم کی ایک تحریر ہے جو اُن کے قلم سے ایک خاندانی کتاب

کے مسودہ میں ہمیں ملی۔ اس تحریر کا عنوان "درحال بزرگانِ خاندانی و سرگذشت خود از ابنائے زمانہ" ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"مکشوف خاطر باد کتابیکہ درآں سلسلہ خاندانی درج بود ہنگام تقسیم کتب خانہ جدی (حکیم محمد شریف خاں) کہ بہ شش پسران منقسم شدہ بود درحصہ عموی صاحب کلاں حکیم محمد اشرف خاں مرحوم رفتہ و از آنجا بمعرض تلف درآمد۔ لہذا از ضبط تحریر حال ابتدائی خاندانی معذور ماندم۔"

یہ کتاب گم نہ ہوئی ہوتی تو بلاشبہ وہ ابتدائی عہد مغلیہ کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر کی بڑی فتح وہ نہ تھی جو پانی پت کے میدان میں اُسے حاصل ہوئی بلکہ اصلی فاتح وہ لوگ تھے جو بابر کے لشکر کے ساتھ ساتھ ہندستان آئے اور اپنی تہذیب اور اپنے علوم و تمدن کا سرمایہ اپنے ساتھ لائے اُن ہی کے سرمایہ سے ہندستان کی ایک جدید اور مشترک تہذیب کا نقشہ مکمل ہوا۔ بقول حکیم محمود خاں بابر کے ہمراہیوں ہی میں سے وہ دو بزرگ تھے جو ہرات سے آئے اور حیدرآباد (سندھ؟) پہنچے۔ ان کے نام خواجہ محمد قاسم و خواجہ محمد ہاشم تھے۔ گو کہ حکیم محمود خاں نے اپنے والد کے بیان کا حوالہ دیکر ان ہر دو بزرگوں کے حیدرآباد سندھ میں بود و باش اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حکیم محمد احمد خاں مرحوم کو کسی تاریخی سلسلہ سے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ غالباً جس حیدرآباد کا ذکر آیا ہے وہ حیدرآباد سندھ نہیں بلکہ حیدرآباد دکن ہے۔ مزید تحقیقات کرنے پر یہ بھی پتہ چلا کہ موضع منمٹلہ نواح اورنگ آباد (دکن) میں اُس زمانہ کا ایک قدیم مزار موجود ہے جو خواجہ قاسم کے نام سے منسوب ہے۔

ایک اور سمت سے بھی اس گمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے حکیم بدرالدین خاں نے جو حکیم اجمل خاں کے یک جدی تھے "اصحاب الاولیا" کے ترجمہ اُردو "بدرالدجی" میں اپنے جو خاندانی حالات لکھے ہیں اور جو شجرہ نسب نقل کیا ہے اُس میں بھی خواجہ محمد قاسم اور خواجہ محمد ہاشم کا نام آتا ہے۔ حکیم محمد احمد خاں مرحوم نے اپنی ایک یادداشت میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس زمانہ میں بابر آیا اور اُس کے بعد بھی ایک عرصہ تک سندھ میں کسی شہر حیدرآباد کا وجود نہ تھا، مگر حیدرآباد دکن موجود تھا، اسی لئے ان بزرگوں کو حیدرآباد سندھ کا باشندہ بتانا غلط ہے۔ خود حکیم اجمل خاں بھی بہت کچھ تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان دونوں بزرگوں نے حیدرآباد سندھ میں نہیں بلکہ اورنگ آباد دکن کے قریب موضع منمٹہ میں سکونت اختیار کی تھی۔

ہندستان میں سلسلہ نسب

خواجہ محمد قاسم اور خواجہ محمد ہاشم سے خاندان شریفی کے ان بزرگوں کا سلسلہ ملانا جو عہد مغلیہ میں موجود تھے آسان نہیں ہے اس لئے کہ بعض درمیانی کڑیاں گم ہیں۔ تاہم یہ حقیقت تو مسلمہ اور مستند ہے کہ ملا علی قاری اور ملا علی داؤد کے والد سلطان محمد جو ہرات کے رہنے والے تھے بابر کے بعد اور غالباً ہمایوں کے زمانہ میں ہندستان میں سکونت پذیر ہوئے اور بقول حکیم محمود خاں آگرہ میں اُن کا مکان ۱۸۵۷ء کے بعد تک موجود تھا۔ حکیم اجمل خاں کے بیان کے بموجب ملا علی ہی اس دور میں خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ تھے اور وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے۔ اکبر اعظم ہی کے عہد

میں اس خاندان کا تعلق دربار شاہی سے قایم ہوا - چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانہ تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد دربار شاہی سے وابستہ رہا - ملا علی قاری کے علم و فضل نے اُن کے خاندان میں طب یونانی کے فضل و کمال کی راہ اختیار کی -

حکیم محمد واصل خاں

اس خاندان کے سب سے پہلے طبیب حکیم محمد فاضل خاں تھے جن کے بیٹے حکیم محمد واصل خاں اوّل عہد عالمگیری میں اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی آئے اور غالباً اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں دربار کے عہدہ طبابت پر فائز ہوئے - یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال تیموری کا آفتاب نصف النہار سے گزر کر مائل بہ انحطاط تھا - اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا اور ۱۷۴۸ء تک ۴۱ سال کی مدت میں اورنگ زیب کے بعد چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت شاہی پر آئے اور گذر گئے - ان میں سے دو قتل ہوئے اور تین کو بمشکل ایک ایک سال مسند تیموری پر سانس لینے کی مہلت نصیب ہوئی -

اس دورِ انقلاب کو واصل خاں اوّل نے اپنی آنکھ سے دیکھا - اغلب یہ ہے کہ شروع عہد محمد شاہ میں انھوں نے وفات پائی - اُن کے بعد اُن کے دونوں لڑکے اجمل خاں اور اکمل خاں دربار شاہی سے وابستہ ہوئے -

حکیم اکمل خاں

حکیم محمود خاں اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ حکیم اکمل خاں کو جو اُن کے جد اعلیٰ تھے دربار شاہی سے اعظم آباد (پٹنہ) میں دو لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی اور



مہر حکیم محمد شریف خان

حاذق الملک کا خطاب ملا تھا۔ اس طرح خاندان شریفی میں حکیم اکمل خاں حاذق الملک اوّل تھے۔ ولادت و وفات کی صحیح تاریخیں تو معلوم نہ ہو سکیں لیکن چونکہ یہ ثابت ہے کہ اکمل خاں کی مشہور کتاب "علاج الامراض" ۱۱۴۷ھ ہجری میں لکھی گئی تھی اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ وہ شاہ عالم ثانی کے ابتدائی زمانہ تک ضرور زندہ رہے۔ اور اُنہوں نے نہ صرف عہد محمد شاہی کے انقلاب انگیز واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ ہندستان میں خاندان تیموری کے مرض الموت کا آغاز بھی اُن ہی کی زندگی کے دوران میں ہو گیا تھا۔

حکیم شریف خاں

مغلیہ دورِ آخر کے اسی طوفانی سمندر میں ایک موتی کی طرح اکمل خاں کے بیٹے شریف خاں پیدا ہوئے ان کا سن ولادت ۱۷۲۲ء ہے۔ حکیم محمود خاں اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں اُن کے "جدامجد" حکیم شریف خاں کو پانی پت اور ڈاسنہ کے علاقوں میں ۲۵ ہزار کی جاگیر ملی تھی اور شاہ عالم کی وفات کے چار ماہ بعد اُن کا انتقال ہوا۔ شریف خاں کی زندگی کا یہ دور وہ تھا کہ اقبال تیموری کا آخری کنگرہ گر رہا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کر دئے تھے۔ دہلی میں اُس وقت مرہٹوں کا اقتدار دربار شاہی پر مسلط تھا۔ اُس وقت کی حالت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ شریف خاں کو جاگیر کی جو سند عطا ہوئی تھی اُس میں بادشاہ کی مُہر کے اندر "مادھو راؤ سندھیا" کا نام "وکیل مطلق، مختار الملک، عمدۃ الامرا" اور "فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" کے عنوان سے درج ہے۔ اس سند کی

تاریخ ۲۷ سال جلوس یعنی ۱۷۸۶ء ہے۔

اقبال تیموری اور طنطنہ بابری کا دم واپسیں غلام قادر روہیلے کے خنجر سے بادشاہ کی آنکھیں نکالے جانے کا واقعہ ہے۔ اسی کے بعد ۱۸۰۳ء میں سارا اثاثہ شاہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا۔ افسوس ہے کہ خاندان شریفی کے بہت سے قدیم کاغذات ضائع ہوچکے ہیں ورنہ ہم شاید حکیم شریف خاں کی آنکھوں سے اس آخری دور کے بہت سے مناظر دیکھ سکتے۔ علاوہ فنی کمالات کے اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی طب یونانی کی بربادی کو بڑی حد تک روک لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب شاہی دربار کی سرپرستی سے اُن کا فن محروم ہوگیا ہے اُنھوں نے سوچنا شروع کردیا کہ بغیر اس سرپرستی کے بھی طب یونانی کو کس طرح باقی رکھا جا سکتا ہے۔

بقول صاحب قاموس المشاہیر حکیم شریف خاں نے ۱۲۳۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ قطب صاحب میں مجلس خانہ کے قریب باولی کی طرف جاتے ہوئے اُن کا مزار موجود ہے۔

حکیم صادق علی خاں

جس وقت تیمور کی اولاد دلّی کے قلعہ میں انگریزوں کی وظیفہ خوار تھی اور ابوالنصر محمد معین الدین اکبر شاہ ثانی لال قلعے میں بجھتے ہوئے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے تھے اُس زمانہ میں حکیم شریف خاں کے فرزند اور اجمل خاں کے دادا حکیم صادق علی خاں برائے نام اس دربار سے وابستہ تھے۔ بقول حکیم محمود خاں اُسی زمانہ میں انگریزوں نے اس خاندان کی جاگیر بھی ضبط کرلی اور اُس کے بجائے حکیم صادق علی خاں کے

۲ بیٹوں کی کچھ تنخواہیں مقرر کر دی گئیں چونکہ دربار میں کچھ دم باقی نہ تھا اس لئے لال قلعہ سے حکیم صادق علی خاں کا تعلق محض برائے نام تھا۔ البتہ وہ اپنے والد کی طرح اپنے فن کی خدمت میں بہت مصروف رہا کرتے تھے۔ اُن کی متعدد تصانیف میں سے "زادِ غریب" "کلیات خورد و کلاں"، "شرح معالجات" "قانونچہ و شرح تشریح اعضاء مرکبہ" "قانون"، "رسالہ در خواص ادویہ و اغذیہ و نسخہ مرکبہ در طب" "رسالہ تقویتہ العقاید" بہت مشہور ہیں۔ فن طب اور زبان عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت کا پتہ اُن کی ان تصانیف سے چلتا ہے۔ اُس وقت تک دودمان تیموری کی عظمت رفتہ کو جو زرین کفن پہنائے جا رہے تھے اُن کی مثال بھی حکیم صادق علی خاں کی تحریروں میں ملتی ہے۔ جہاں وہ بادشاہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

"مہر سپہر گیتی ستانی، مرکز دایرہ جہانبانی، سلالہ خاندانی رفیع المکان گورگانی، خلاصہ دودمان عظیم الشان صاحبقرانی، خسرو سکندر نشان دادر دارا ب دودمان خدیو جمشید شوکت کیوان رفعت برجیس مرتبت السلطان بن السلطان بن السلطان الخاقان ابن الخاقان اسد المعارک والمغازی معین الدین ابو النصر محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ و افاض علی العالمین برّہٗ و احسانہٗ ۔۔۔۔"

درحقیقت القاب و آداب کا یہ ہجوم اس عہدِ زوال کی ماتم داری تھی۔ ۲۹ر صفر ۱۲۶۴ھ ہجری کو ۸۰ سال کی عمر میں حکیم صادق علی خاں نے وفات پائی۔ اُسی زمانہ میں اکبر شاہ ثانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے

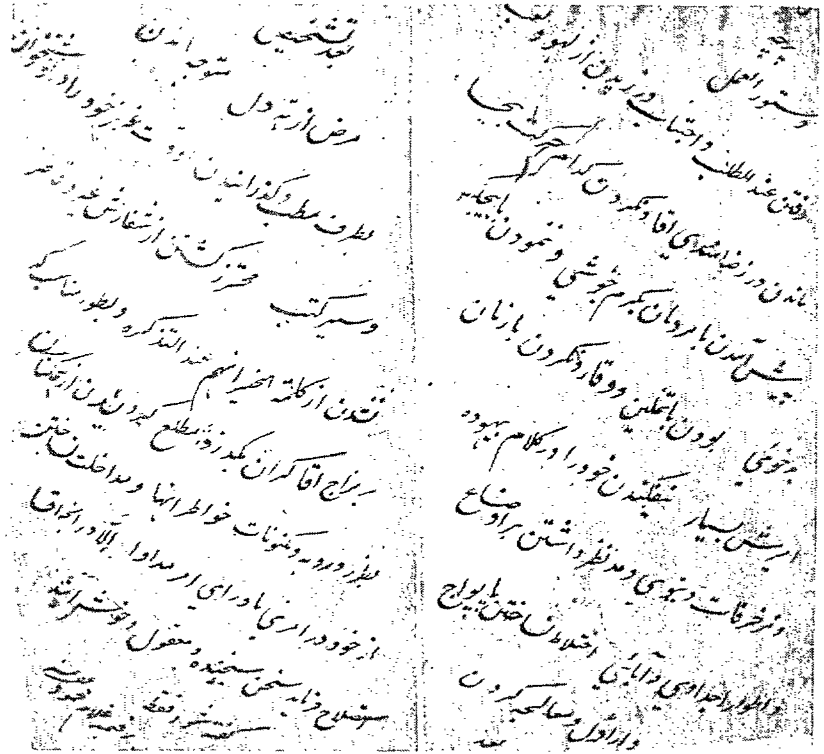
بعد خاندان شریفی کا کوئی تعلق دربار شاہی سے باقی نہ رہا۔

حکیم محمود خاں اعظم

حکیم صادق علی خاں کے تین فرزند تھے، حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں اور حکیم غلام مرتضے خاں۔ حکیم غلام محمد خاں اپنے والد ماجد کی زندگی ہی میں بعمر ۴۴ سال وفات پا گئے تھے حکیم غلام مرتضے خاں نے ۱۲۹۲ھ ہجری میں بعمر ۴۵ سال انتقال فرمایا۔ حکیم محمود خاں کو اپنی خاندانی عظمت کا ورثہ سب سے زیادہ ملا۔ اپنے ایک مکتوب میں اس کا سبب اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"از ابتداے طفولیت تا عنفوانِ شباب بلہو و لعب
گذرانیدم ہر قدر کہ جناب فیض مآب، فطانت آیات، کرامت
انتساب حضرت قبلہ کونین و کعبہ دارین ولی نعمی ام مغفور
...... تعلیم فرمودہ بودند بہجوم دیگر کردہات فراموش
کردم کہ ناگاہ بعمر کمتر از ۱۴ سال صرصر مخالفت درزند
و موج فتن دررسید۔ اعنی جناب ممدوح ودیعت حیات
بجاں آفریں سپردند و عہدہ طبابت نامزد خاندانی بنام ایں
گمنام مقرر گشت از آنکہ جناب بھائی صاحب قبلہ حکیم غلام محمد
خاں صاحب در حیات جناب ممدوح رحلت فرمائے عالم بقا
بودہ باشند و برادر از جان بہتر حکیم غلام مرتضے خاں بوجہ
ملازمت بہ سرکار پٹیالہ قیام داشت ......"

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اپنی کم عمری میں مزید علم حاصل کرنے کے لئے حافظ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے روبرو زانوئے ادب تہ کیا۔ اس بیان سے جس میں حکیم محمود خاں نے اپنی ابتدائی زندگی کی جدوجہد



عکس تحریر حکیم محمود خان

کا ذکر کیا ہے اُن کی زندگی کے بعض دلچسپ حقایق ظاہر ہوتے ہیں مثلاً فرماتے ہیں کہ طریقہ علاج میں وہ بہت محتاط تھے اور اپنے علم و فضل پر مغرور نہ تھے۔ قطع نظر فنی کمالات کے، یہ تحریر اُن کے ذاتی خصائص کی بھی آئینہ دار ہے چنانچہ اپنے اہلِ خاندان کے لئے موصوف نے جو کچھ بطور وصیت تحریر فرمایا اُس کے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :-

(۱) "انصاف از دست ندہند و یگانگت و دوستی را ملحوظ خاطر دارند و ہرگز کسے را بہ بدی یاد نہ کنند و غیبت روا نہ دارند..........

(۲) مال بغیر وجہ حلال نگیرند و خصوص بہ مال یتیم خیال بد نہ کنند.........

(۳) واز قمار بازی و دزدی و شراب خوری و دیگر مسکرات از قسم افیون و بنگ و چرس وغیرہ ازیں احتراز جویند.........

(۴) در امور خیر کوشش و سعی موفورہ بکار برند.... علی الخصوص بکار محتاجان و درماندگاں.....

(۵) و ہرگز بے تشخیص مرض معالجہ نہ کنند کہ غلطی در آں علاوہ از رسوائی دنیا بمواخذہ عقبیٰ گرفتار می کند......

(۶) پابندی صحبت زناں ثمر بربادی دو جہاں است، بغیر ضرورت اختیار کردنش روا نبود...... خصوص صحبت زناں فاحشہ بازاری......

(۷) کثرت ازدواج روسیاہی دو جہانے می بخشند......

محمود خاں کی فطرت کے یہ نقوش اجمل خاں کی زندگی میں بہت نمایاں نظر آنے والے تھے، اسی لئے اُن کا ایک خاکہ ان اوراق میں محفوظ کیا گیا۔

ترتیب بیان کسی قدر غلط ہوگئی، لیکن بہتر یہی تھا کہ سب سے پہلے حکیم محمود خاں نے خود اپنی تحریروں میں اپنی جو معنوی تصویر پیش کی ہے اُسے نقل کر دیا جاتا۔ اب پھر اپنے سلسلہ داستان کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

علم و فضل کا جب کوئی مرکز باقی نہ رہا تو خاندان شریفی کے افراد دیسی ریاستوں سے وابستہ ہونے لگے۔ دہلی کے یہ ارباب کمال لکھنؤ، رام پور، پٹنہ، کلکتہ اور حیدرآباد میں پھیل گئے اور قدر دانوں نے عہد مغلیہ کے اِن جواہر ریزوں کو جہاں پایا چُن لیا۔ حکیم محمود خاں کے بھائی حکیم غلام محمد خاں پٹیالہ سے پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے اور اکثر وہیں رہتے تھے۔ اُن کے بعد اُن کے لڑکے غلام اللہ خاں (حکیم اجمل خاں کے خسر) بھی پٹیالہ میں رہے۔ حکیم مرتضیٰ خاں بھی عرصہ تک پٹیالہ سے وابستہ رہے۔ خود حکیم محمود خاں ریاست جیند سے وظیفہ پاتے تھے۔

اُن کے علم و فضل کی داستان ایک علیحدہ تالیف چاہتی ہے۔ ہندوستان میں آج تک اُن کے علم و فضل اور کمال فن کے افسانے زبان زد ہیں۔ اُن کی تشخیص اور معالجہ کے عجیب و غریب قصے بیان کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا نے اُن کو غیر معمولی شخصیت عطا نہ کی ہوتی تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس خاندان اور اُس کے ساتھ طب یونانی کی بقا ناممکن تھی۔

محمود خاں اپنے خاندان میں ایک غیور، گرد دردمند طبیعت لیکر آئے تھے۔ غریبوں کے حال پر خاص التفات فرماتے تھے، لیکن امیروں

کے لئے بہت تند خو تھے۔ مطب میں مجال نہ تھی کہ کوئی امیر کسی غریب سے آگے بڑھ کر نبض دکھا دے، اہل دول سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے اور والیانِ ریاست اگر علاج کے لئے بلاتے تھے تو ہزار خوشامد وں اور التجاؤں کے بعد تشریف لے جایا کرتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور بہادر شاہ کی نام نہاد تاجداری کا پورا زمانہ گزار کر ۱۹۰۲ء میں انتقال فرمایا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کا غدر اُن کی جوانی کا زمانہ تھا خوش قسمتی سے خاندان شریفی اُن تباہیوں کی زد میں نہیں آیا۔ اس کا ایک سبب خود محمود خاں کا شخصی اعزاز تھا۔ جس وقت برطانوی فوجیں دلّی میں داخل ہوئیں تو نابہ پٹیالہ اور جیند کی فوجیں اُن کے ساتھ تھیں اور ان مہاراجگان نے برطانوی افسران سے کہہ دیا تھا کہ شریف خانی خاندان کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ قلعہ سے اُس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ انگریزی فوج نے دلّی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت کے لئے پہرہ بٹھا دیا اور تمام خاندان اس دار و گیر سے محفوظ رہا۔ مرزا غالب نے بھی حالات غدر کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

۸ رجون ۱۸۵۷ء کو دلّی پر انقلابیوں کا (جنہیں اُس زمانہ میں باغی کہا جاتا تھا) قبضہ ہوا اور ۱۴ ستمبر کو انگریزوں نے فتح پائی۔ اس اس کے بعد مہینوں تک ہنگامہ دار و گیر گرم رہا۔ "باغیوں" کی شکست کے وقت جب دلّی والے بھاگے تو ہزارہا اشخاص نے حکیم محمود خاں کی حفاظت میں اپنا اثاثہ چھوڑ دیا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور اور جواہرات محفوظ کرنے کے

لئے لاتے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھڑی[1] بتا دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ۔ چنانچہ یہ کوٹھڑی چھت تک لوگوں کے پلندوں گٹھڑیوں اور بکسوں سے بھر گئی۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اُس وقت اس کوٹھڑی میں دو کروڑ روپیہ سے زیادہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مرتبہ دلّی میں محمود خاں ہی کا تھا کہ لوگ اُن کی کوٹھڑیوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال جاتے تھے۔ غدر کے بعد جب لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اُس کوٹھڑی کا دروازہ کھلوا دیا اور فرمایا کہ جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کر لے جائے۔ اسی طرح دلّی میں اور خصوصاً بلّی ماروں کے محلہ میں جو ہزارہا جائدادیں ضبط ہوئیں اُن کے لئے محمود خاں حکام کے پاس جاتے تھے اور اُنہیں واگذاشت کرا دیتے تھے۔ جو لوگ گرفتار تھے انہیں رہا کرانے کے لئے کوتوالی جایا کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ یہ میرے عزیز ہیں انہیں رہا کرا لیتے تھے، حالانکہ عام طور پر کچہری اور عدالت میں جانے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ تاہم غدر کی مصیبت میں دن رات مخلوق کی جو خدمت انجام دی اُس کے قصّے عرصہ تک دہلی میں زبان زد خاص و عام تھے۔ ایک طرف مزاج کی وہ سختی اور تمکنت کہ اہلِ دول کی صورت دیکھ کر چیں بجبیں ہو جاتے تھے اور دوسری طرف طبیعت کی یہ نرمی اور گداز

---

[1] اُس زمانہ میں خاندانی دیوانخانہ کے سامنے یہ کوٹھڑی اُسی مقام پر تھی جہاں اجمل خاں صاحب نے بعد کو اپنا ایک کمرہ تعمیر کیا، یعنی وہ کمرہ جس میں زیادہ تر مرحوم کی نشست تھی اور جو اب بھی موجود ہے۔

کہ غریبوں اور گرفتاران بلا کی خاطر کوتوالی کے چکّر لگاتے تھے محمود خاں کی فطرت کی بلندی کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر مرزا غالب اس طرح کرتے ہیں کہ:۔

> ۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر واپس آنے لگے۔ اسی اثنا میں حاکم شہر کو چغلی خوروں نے خبر دی کہ راجہ نرندر بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خاں کا مکان مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی اُن لوگوں میں ہوں۔ چنانچہ ۲ فروری سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑ لیکر آگیا اور مالک خانہ کو معہ ساٹھ آدمیوں کے پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور اُن کے چچازاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہوگئی۔ ۱۲ فروری کو کچھ اور لوگ چھوڑ دیے گئے ۱۳ فروری کو تین اور نے رہائی پائی........

باپ کے اندر خدمت خلق کا جو بے پناہ جذبہ کار فرما رہا وہی بیٹے کو وراثتاً ملا اور اُسی نے اجمل خاں کو انسانیت کے اُس ارفع مقام پر پہنچایا، جہاں تک چند ہی خوش نصیب اہلِ نظر پہنچ سکتے ہیں۔

حکیم محمود خاں ۷۲ سال زندہ رہے اور مسلسل اپنے فن کے متعلق تصنیف و تالیف میں مصروف رہے فنی تصنیف و تالیف کی محرک جو خواہش

محمود خاں کو بیچین رکھتی تھی وہی چنگاری عبدالمجید خاں، واصل خاں اور اجمل خاں کے دل میں روشن تھی۔ سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خاں نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑی وہ صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی، ایک اخلاق انسانی اور جذبہ خدمت خلق اور دوسرے اپنے فن کی محبت۔ دنیا کے مال و متاع سے انہوں نے بہت کم حصہ پایا تھا۔ باپ دادا نے جو کچھ دربار مغلیہ کی یادگار چھوڑا تھا وہ سب سرکار انگریزی کی نذر ہو چکا تھا چنانچہ جب وہ حکومت کی توجہات سے بالکل بے نیاز ہو گئے تو پھر کبھی اُنہوں نے اُس طرف رخ نہیں کیا۔ جاگیروں کے ضبط ہو جانے کے بعد تو وہ بالکل یکسو ہو گئے تھے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

لیکن اخلاق و اعمال کی جو دولت وہ چھوڑ گئے تھے اُس سے اُن کے جانشینوں کو بڑی بڑی سعادتیں حاصل ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ بلحاظ فن کے محمود خاں اس دور آخر کے مسیحا تھے۔ مزاج بہت آزاد اور بے پروا پایا تھا، لالچ، طمع، غرور اور خود نمائی سے نفرت تھی لیکن خود داری کا جذبہ بہت قوی تھا۔ اُن کے فنی معجزے بہت ہیں اور اس قابل ہیں کہ کتاب کی صورت میں محفوظ کئے جائیں۔ مثلاً ایک واقعہ رسالہ زبان نے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا تھا:

"ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ٹھیک دوپہر کے وقت جناب والدہ ماجدہ کو کسی مرض کا دورہ ہوا۔ یکایک ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ گلے میں بلغم بولنے لگا، منہ بند ہو گیا، آنکھیں پھر گئیں

اور وہ بیہوش ہوگئیں۔ مکان کے برابر ہی منوہر مشر نامی ایک تجربہ کار وید رہتے تھے۔ اُن کو بلا کر دکھایا گیا۔ اُنھوں نے تجویز کیا کہ سردی اور ہوا کی خرابی ہے مگر مرض بہت بڑھ گیا ہے جانبری کی کوئی امید نہیں۔ بہر حال اُنھوں نے بھیروں کی گولی دی مگر وہ کسی طرح حلق سے نیچے نہیں اُتری۔ ناچار والد صاحب گھبرائے ہوئے حکیم محمود خاں کی خدمت میں پہنچے۔ حکیم صاحب مکان کی چھت پر ایک حجرہ میں تسبیح بدست بیٹھے تھے اور وظیفہ خوانی میں محو تھے۔ والد صاحب چونکہ بے تکلف تھے وہیں پہنچ گئے اور عرض حال کیا۔ آپ نے جھڑک کر فرمایا کہ جا! شربت عناب پلا دے۔ اب سوچئے کہ کجا شربت عناب اور کجا بھیروں۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر خیر اُس وقت تو چلے آئے۔ پھر تھوڑی دیر میں پہنچے اور جا کر کہا کہ حضرت! شربت عناب کے دیتے ہی مریضہ کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہوگئی میں نے آپ کے کہنے سے شربت پلایا ہے۔ اگر خدا نخواستہ وہ مرگئی تو میں قیامت میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔ فرمایا میاں کیوں جھوٹ بولتا ہے تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں دق کرنا چاہتا ہے۔ اچھا چل یہ کہہ کر آپ پا پیادہ ساتھ ہو لئے۔ گھر پر آتے ہی ایک لوہے کی نالی سے منہ کھول کر شربت عناب پلوایا اور اس کے پیتے ہی مریضہ کو آرام ہوگیا۔"

ایسی مثالوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو حکیم محمود خاں کے فنی کمالات پر سند ہے محمود خاں کو خدا نے حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں عطا فرمائے تھے۔ ترکمانی خون کی جھلک سے اُن کا چہرہ روشن تھا۔ پیرانہ سالی

میں بھی مردانہ وجاہت اُن کے چہرہ پر نمایاں تھی۔ لانبا قد، تناسب اعضا جسم کی رنگت سرخ وسفید، بارہ مہینے، گرمی اور جاڑے وہی شربتی کا انگرکھا اور سفید پگڑی، یہ اُن کی وضع تھی۔ گھوڑے پر سوار ہوکر نکلتے تھے تو وضع قطع بالکل سپاہیانہ ہوتی تھی۔

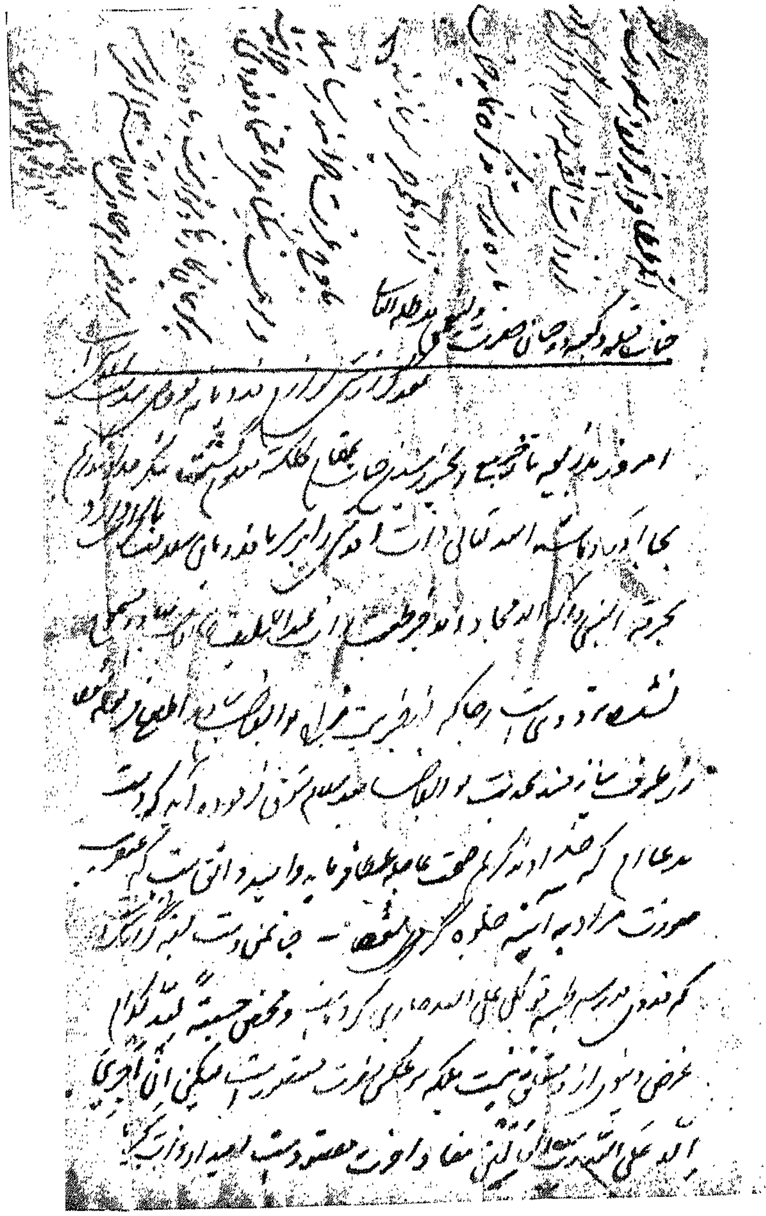
سنہ ۱۳۰۹ ہجری میں اُنہوں نے رحلت فرمائی۔ تمام ملک میں اُن کی رحلت پر ماتم ہوا۔ حالی نے ایک دردانگیز مرثیہ لکھ کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس مرثیہ کے ابتدائی بند حکیم محمود خاں کے متعلق عام احساسات کے آئینہ دار ہیں۔

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے　　واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے　　کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جِلا کر چل دیے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گیا سیلِ فنا اُس کو بھی لے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی　　ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ ایک محمود خاں کے دم سے تھی بپت قوم کی　　اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائیگا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کریگا اے جہاں آباد تو

حکیم عبدالمجید خاں

اجمل خاں ۲۵ سال کے تندرست توانا، علم و فضل سے بہرہ ور نوجوان تھے جب اُن کے برادر معظم حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے باپ دادا کے مطب کو سنبھالا۔ محمود خاں نے پانچ اولادیں چھوڑی تھیں۔ دو لڑکیاں اور تین صاحبزادے عبدالمجید خاں سب سے بڑے، واصل خاں منجھلے اور اجمل خاں سب سے چھوٹے۔



عکس تحریر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں

یوں تو محمود خاں کے جانشیں کی حیثیت سے بھی حکیم عبدالمجید خاں کا مقام بہت بلند تھا لیکن فنِ طب میں اُن کا مرتبہ عالی اس حیثیت سے خاندان شریفی کے لئے بہت زیادہ مایہ افتخار ہو گیا کہ اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے فن کے متعلق اپنے والد ماجد کے عزائم کو عملی صورت میں منتقل کیا۔ حکیم محمود خاں نے خود ہی اپنے درس کو جس میں طلبا کسب فن کرتے تھے ایک مدرسہ طبیہ کی صورت میں منتقل کر دیا تھا۔ لیکن عمر نے انہیں اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اس مدرسہ کے استقلال اور استحکام کی تدبیریں اختیار کر سکتے۔ یہ کام عبدالمجید خاں نے شروع کیا اور اجمل خاں نے اُس کی تکمیل کی۔ اِن اوراق میں جا بجا اس طبی تحریک کا ذکر آئے گا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ اس فن کا زوال بھی یقینی تھا لیکن محمود خاں نے بادشاہوں اور حاکموں کی سرپرستی کے بغیر بھی اپنے فن کو ترقی دینے کا ارادہ کیا۔ اس تحریک کا سنگ بنیاد مدرسہ طبیہ تھا جو انھوں نے جاری کیا۔ عبدالمجید خاں نے اس مدرسہ کے استحکام کی تدابیر اختیار کیں اور اجمل خاں نے اس ڈوبتی کشتی کو وقت کے بے پناہ طوفانوں سے بچا کر ساحل مراد تک پہنچایا۔ ۱۸۸۳ء میں اس مدرسہ کی ابتدا اور ۲۳ جولائی ۱۸۸۹ء کو اُس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اُس کے لئے ایک مکان مخصوص کیا گیا جہاں حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں طلبا کو درس دیتے تھے۔ اوّل ہی دن سے مختلف گوشوں میں اس تحریک کی مخالفت بھی ہونے لگی۔ اخباروں میں مضامین لکھے جانے لگے۔ ان اعتراضوں کے جواب میں اکمل الاخبار نے مدرسہ کے مقاصد کی پوری پوری توضیح کی۔ اُس نے لکھا کہ چونکہ ملک کے لاکھوں افراد طب یونانی سے اس لئے مستفید ہوتے

ہیں کہ وہ بمقابلہ طب انگریزی کم خرچ ہے اور اُن کے مزاجوں سے زیادہ سازگار ہے اس لئے اس مدرسہ کا قیام ضروری تھا علاوہ بریں اس مدرسہ میں انگریزی طب اور جراحی کی بھی ضروری تعلیم دی جائے گی۔

> ڈاکٹری کی تعلیم کو بھی مدرسہ میں لازمی قرار دیا گیا ہے ..... اور نقشوں کی تشریح اور مختلف اقسام کی جراحیوں کو دیکھنے کے لئے سول ہسپتال میں طلبا کو بھیجنے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہے اور طلبا کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ لازمی طور سے ہسپتال میں حاضری دیں۔ علم طبعی اور جدید سائنس کے لکچروں کو سننے اور طبیعات کے تجربے دیکھنے کا بھی ذریعہ پیدا کیا گیا ہے ......

اکمل الاخبار کے اِن الفاظ میں جو خاندان شریفی سے تعلق رکھتا تھا مدرسہ طبیہ کے بنیادی اصولوں کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ شروع ہی سے یونانی طب کو زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق بنانا اور سائنس کی ترقیوں کے دوش بدوش آگے بڑھانا اس طبی تحریک کا مقصد تھا۔ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئیے کہ آج سے نصف صدی پہلے جب محمود خاں اعظم کے تین وارث اپنے عزیز فن کے تحفظ اور ترقی کی فکریں کر رہے تھے تو اُن کی وسعت نظر کیا تھی اور وہ زمانہ کی ضرورتوں اور سائنس اور علوم جدیدہ کے لوازمات سے کس قدر باخبر تھے۔ پچاس سال پہلے وہ زمانہ کا رخ دیکھ رہے تھے اور فراخدلی کے ساتھ جدید علوم کے مقابلہ میں اپنے فن کی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی اعتراف کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ زمانہ کی دوڑ میں جدید علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُن کا فن بھی ترقی کرے۔ یہی وجہ تھی کہ اوّل

دن سے انہوں نے تشریح، جراحی اور طبعیات جدیدہ کو اپنے مدرسہ میں تعلیم کا جزو لازمی قرار دیا۔ آج عام نظروں کے لئے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ۱۸۵۷ء کے دور انحطاط میں عبدالمجید خاں، واصل خاں اور اجمل خاں مستقبل کو کس قدر تیز اور دوربیں نظر سے دیکھ رہے تھے۔

سید احمد خاں کی تحریک

فن طب کے متعلق حکیم محمود خاں اور اُن کے جانشینوں کی تحریک اُسی عام بیداری کا ایک پہلو تھا جو غدر کے صدمے اُٹھائے ہوئے مسلمانوں میں سر سید احمد خاں پیدا کر رہے تھے۔ سر سید تمام شمالی ہندستان میں اپنی اس تحریک کے لئے دورہ کر چکے تھے۔ غدر کے دو ہی برس بعد اُنہوں نے مراد آباد میں ایک مدرسہ قایم کر لیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں اُنہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا، پھر علی گڑھ آکر تمام صوبہ میں تعلیمی کمیٹیاں قایم کرنے لگے۔ اسی جوشِ عمل کو ساتھ لیکر انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے واپس آکر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا نقشہ تیار کرنا شروع کیا۔ اُس کا سنگ بنیاد اوائل ۱۸۷۷ء میں رکھا گیا۔ اس طرح سر سید کی تحریک نے ہندستان کے مسلمانوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہ ذکر بعد میں آئے گا کہ اس قومی تحریک سے بھی خاندان شریفی متاثر ہوا اور حکیم اجمل خاں نے تو سر سید کی جد و جہد میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ خاندان شریفی کی ان کوششوں میں ریاست رام پور کے رئیس مرحوم نواب حامد علی خاں کی توجہ اور سرپرستی کو بھی بہت دخل تھا۔ نواب صاحب اوّل دن سے مدرسہ طبیہ کی تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے اس لئے کہ وہ خود طب یونانی کے بہت بڑے حامی تھے۔ درحقیقت طبیہ کالج کی تاریخ میں نواب حامد علی خاں

والئ رام پور کا نام محض ایک ایسے والئ ریاست کی حیثیت سے نہیں آتا جو رسماً کبھی کبھی ملکی تحریکوں پر نظرِ عنایت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک سچّے ہمدرد، معاون اور سرپرست کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس طبی تحریک سے اُن کے تعلقات کا ان صفحات پر بار بار ذکر آئے گا۔

محمود خاں اعظم کے بعد حاذق الملک اوّل کا مرتبہ بحیثیت طبیب کے ملک میں بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔ والیانِ ریاست اور اکابر اُن سے رجوع کرتے تھے۔ ریاست رام پور میں بھی وہ اکثر تشریف لے جاتے تھے مگر حکیم اجمل خاں جن کا تقرر طبیب خاص اور افسر الاطبا کے عہدہ پر ہو گیا تھا بہت زیادہ نواب صاحب کی صحبتوں میں شریک رہتے تھے۔

۱۸۹۴ء میں حکیم عبد المجید خاں اپنے مدرسہ طبیہ کے متعلق ایک وفد لے کر نواب صاحب کی خدمت میں گئے۔ اس وفد میں شمس العلما مولانا نذیر احمد خان بہادر ڈپٹی الٰہی بخش، شمس العلما مولوی ذکا اللہ اور دہلی کے دیگر معززین شریک تھے۔ ان ہی اصحاب کی ایک جماعت اُس وقت سرسید احمد خاں کی تحریک میں بھی بہت نمایاں حصہ لے رہی تھی۔

۱۸۹۲ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو اُس کے بڑے کارکن حکیم عبد المجید خاں اور حکیم اجمل خاں ہی تھے۔ اجمل خاں مجلس استقبالیہ کے سکرٹری تھے اور عبد المجید خاں اُس کے رکن۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں متعصب مولویوں کی جانب سے کانفرنس کی سخت مخالفت کی جا رہی تھی۔ مسجد جامعہ میں جلسے کر کے سرسید اور اُن کے ساتھیوں پر ہزاروں اتہام لگائے جاتے تھے، اشتہارات شائع کئے جا رہے تھے کہ جو کوئی کانفرنس میں شریک

ہوگا وہ کافر اور مرتد۔ لیکن حکیم عبدالمجید خاں اور اجمل خاں ان مخالفتوں کی پروا نہ کرکے سرسید کی تعلیمی تحریک کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں طب یونانی کے متعلق حکیم عبدالمجید خاں نے خود ایک قرارداد پیش کی اور اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے اور مختلف اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے جو قدامت پرست اطبا کی طرف سے کئے جا رہے تھے اپنی طبی تحریک کا صحیح عکس ملک کے سامنے پیش کر دیا۔

انہوں نے فرمایا کہ

"ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندستان میں سوائے ویدک کے اور کسی طریقہ علاج کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ پھر دوسرے انقلاب میں جبکہ ہم غریب الوطن مسلمان ہندستان میں آئے یونانی طب نے رواج پایا اب تیسرے دور کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جس میں ویدک برائے نام اور ڈاکٹری اور یونانی کی رقابت جاری ہے جس کا نتیجہ وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

او باز تیز پنجہ و من صعوہ ضعیف
روزے نہ ہم فرو شکند بال و پر مرا

پھر فرمایا کہ:۔

میں یونانی کو عیوب سے پاک نہیں سمجھتا اور نہ ڈاکٹری کو بے عیب جانتا ہوں۔ اگر یونانی کی تشریح ڈاکٹری کے مقابلہ میں ناقص ہے یا یونانیوں نے اعمال ید کو چھوڑ دیا ہے تو ساتھ ہی

اُس کے ڈاکٹروں نے نبض کی طرف کچھ بھی التفات نہیں کیا اور اس بدن کے جاسوس سے اندرونی حالات معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہ نکالا۔ حالانکہ یہ جاسوس سچی سچی خبریں اور صحیح صحیح حالات بیان کرتا ہے .... جزو عملی میں اعمال یدبھی شامل ہیں، جیسے ٹانکے لگانا عضو کاٹنا، زخم کو چیرنا، ٹوٹے ہوئے اعضا کو جوڑنا۔ داغ دینا ...... یہی اعمال ید ہیں جنھیں ترک کرنے کی وجہ سے ہم آدھے طبیب رہ گئے۔ اور جب تک ہم طب کے دونوں ٹکڑوں سے کام نہ لیں ہرگز پورے طبیب کہلانے کے مستحق نہیں۔

اسی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی تحریک کا اصلاحی پروگرام بھی بیان فرمایا:۔

''میری اس ساری تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ ہم اپنے علم طب کی اصلاح کریں اور اس میں اعمال یدعملی طور پر جاری کریں جہاں جہاں سے اُس کی تشریح ناقص ہے اُسے مکمل کریں اور ہندستان کی جڑی بوٹیوں کو جو بعض امراض میں اکسیر کا کام دیتی ہیں اپنی کتابوں میں مدون کرکے یونانی کو وسعت دیں اور نئے نئے ایجادات و اختراعات کو اس میں شامل کریں''

مدرسہ طبیہ اور طبیہ کالج کے بنیادی تخیل کا یہی نقشہ تھا جس پر حکیم عبدالمجید خاں کے بعد حکیم اجمل خاں نے طبیہ کالج کی شاندار عمارت کی دیواریں اُٹھائیں۔

اُس وقت سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک اور حکیم عبدالمجید خاں کی طبی تحریک اس قدر شانہ بشانہ بڑھ رہی تھیں کہ نواب سعیدالدین احمد خاں

نے تو اس کانفرنس کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کر دی تھی کہ مدرسہ طبیہ کو دارالعلوم علی گڑھ کی شاخ بنا دیا جائے۔ لیکن یہ تجویز منظور نہیں ہوئی اور دونوں تحریکیں اپنی اپنی جگہ ترقی کرتی رہیں۔

۱۱ر جولائی ۱۹۰۱ء کو ۳۵ سال کی عمر میں محمود خاں کا وحید العصر بیٹا، حکیم صادق علی خاں کا پوتا، اشرف الحکما کا پڑپوتا اور اکمل الحکما کا نگڑپوتا اس دنیا میں اپنا کام ختم کر کے رخصت ہو گیا۔

حکیم واصل خاں

خاندان کے عزو شرف کی وراثت اب واصل خاں کی سپرد ہوئی اور خاندانی مطب اور مدرسہ کے اہتمام کے ذمہ دار اب واصل خاں قرار پائے، لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد تین برس سے زیادہ زندہ نہ رہینگے اور اتنی جلد تمام ذمہ داریاں حکیم اجمل خاں کی طرف منتقل ہوں گی۔

دنیا میں خاندانوں اور نسلوں کو یہ سعادت بہت کم نصیب ہوتی ہے کہ ساڑھے تین سو برس تک ایک ہی نسل اور ایک ہی خاندان میں علم و فضل جاری رہے اور نسلوں کے تسلسل میں اس زنجیرہ کی کوئی کڑی نہ ٹوٹے۔ فاضل خاں سے اجمل خاں تک علم و کمال کا یہ دریا بغیر رکے بہتا رہا اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان گلہائے فضل و کمال کے رنگ و بو میں کوئی کمی ہو جاتی اور یہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر فرد اپنے عہد کی تاریخ کے صفحات پر اپنا ایک بہتر نقش چھوڑ گیا۔

محمود خاں نے ایک انقلابی دور میں خدمت خلق کا سکہ چلایا تھا، عبدالمجید خاں نے مدرسہ طبیہ کے تخیل میں جان ڈالی، اس کو واصل خاں نے پرورش کیا اور اجمل خاں نے اس خاندانی سرمایہ سعادت کو بہت بلند درجے تک پہنچایا۔

مدرسہ طبیہ کے متعلق شروع ہی سے یہ سوال سامنے تھا کہ اُس کے اخراجات کس طرح پورے کئے جائیں۔ محمود خاں اعظم اُن کے بعد عبدالمجید خاں، واصل خاں اور اجمل خاں ان سب کے پاس بڑا سرمایہ صرف اُن کا فن تھا۔ اُنہی کے بہترین نتائج کو اپنے تجربات اور مجربات کی صورت میں اُنہوں نے مدرسہ کے لئے وقف کر دیا اور اس طرح ایک دواخانہ کی بنیاد ایک مشترکہ سرمایہ کی کمپنی کی صورت میں ڈالی گئی۔ یہی دواخانہ بعد میں مدرسہ کی سب بڑی جائداد بن گیا۔ اس یونانی اینڈ ویدک مڈیسنز کمپنی کا مقصد یہ تھا کہ مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کا بہترین انتظام کیا جائے۔ اُسی کو تمام خاندانی نسخے بھی دیدئے گئے۔ حکیم واصل خاں کی زندگی ہی میں دواخانہ کی مالی حالت بہت امید افزا ہوگئی تھی لیکن اُس کا سب سے کامیاب زمانہ حکیم اجمل خاں کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ درحقیقت خاندان شریفی کی عظمت کا نصف النہار اجمل خاں کی زندگی تھی۔

واصل خاں کا مزاج اپنے والد ماجد کی طرح بے پروا اور آزاد تھا۔ وہ بہت آتش مزاج مگر رحم دل تھے۔ حکیم محمود خاں "منجھلے" ہی کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، شاید اس لئے کہ اُن کے مزاج اور طبیعت سے زیادہ حصہ واصل خاں ہی نے پایا تھا۔ جوانی میں اپنے والد کی طرح واصل خاں کو ورزش کا بہت شوق تھا مگر یہ شوق اُن کا اور اجمل خاں کا مشترکہ شوق تھا۔

اس تمہید کے بعد جو دراصل ہے تو جزو داستان مگر جان داستان نہیں ہے ہم اپنے مخصوص موضوع تک پہنچتے ہیں۔

نمودِ صبح

حکیم صاحب ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی پر جو دور ادبار گزرا اُس کی فضا کسی بھی قدیم خاندان کے لئے سازگار نہ تھی۔ مگر حکیم محمود خاں اپنے فن کے ذریعہ سے خدمت خلق انجام دیکر اور خود اپنے شخصی کردار کی وجہ سے اس زمانہ میں بھی اپنے لئے ایک اعلیٰ مقام محفوظ رکھ سکے تھے۔ اس لئے جس ماحول میں اُن کے تیسرے بیٹے نے سورج کی روشنی میں آنکھیں کھولیں وہ خاندانی وقار کی روایات سے محروم نہ تھا۔

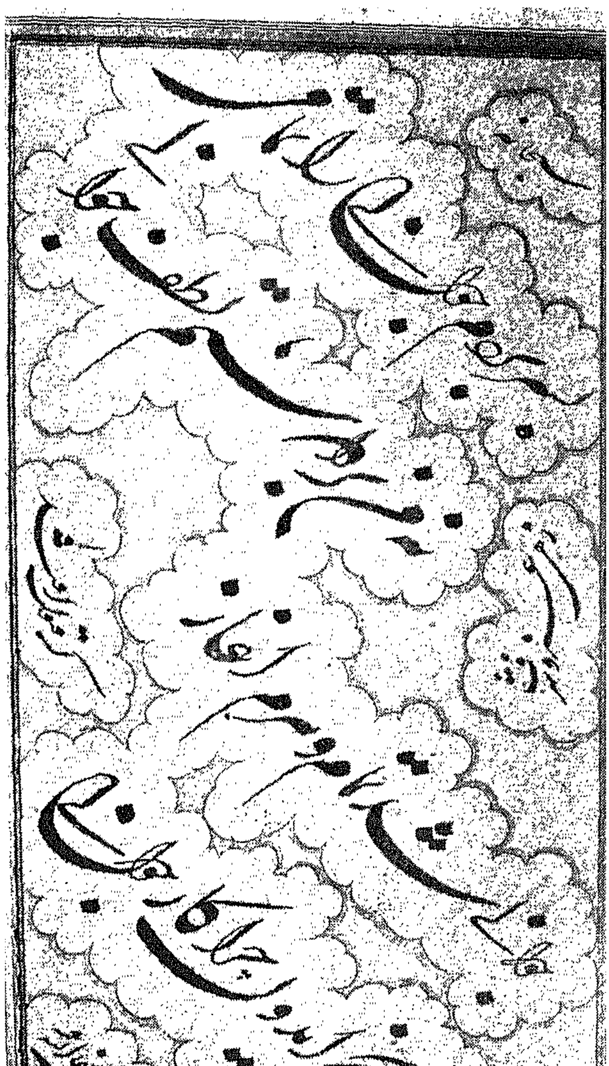
اکابر کی ابتدائی زندگی کے حالات کو اُن کے سوانح نگار بہت محنت سے تلاش کیا کرتے ہیں اور اُن کی تفصیلات پر بہت کچھ زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کی زندگی کا ابتدائی دور اگر تاریخ اور سوانح نگاری کی روشنی میں زیادہ واضح نہ بھی ہوسکے تو سوانح نگاری کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اکابر کی سوانحعمری تو دراصل عبارت ہوتی ہے اُس سوانح سے جس کا تعلق خاندان سے باہر اُس بڑے خاندان سے ہو جس کو ملت اور انسانیت کہتے ہیں۔ اس لئے حکیم صاحب کی پیدائش کی داستان تو محض ضمناً اور محض سرِراہ ہے۔ لہٰذا اُسے ان اوراق میں زیادہ سے زیادہ مختصر کیا گیا ہے۔

حکیم عبدالمجید خاں کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی دایم علی تھے جو بعد میں مراد آباد کی جامع مسجد کے پیش امام ہوگئے تھے انہوں نے اجمل خاں کو قرآن حفظ کرایا۔ اُن کا بیان ہے

کہ تین سال میں اجمل خاں نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا اور بقول حکیم جمیل الدین کے (وہ بھی حکیم صاحب کے استاد تھے) اُس وقت اُن کی عمر پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔ دوسرے علوم کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل ہوئی۔ اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تک وہ منطق، طبیعات، ادب، فلسفہ، حدیث، تفسیر۔ فقہ کی تمام تعلیمی منزلوں سے گزر چکے تھے۔ منطق و فلسفہ کا درس مولوی عبدالحق دہلوی اور مولوی عبدالرشید رام پوری سے لیا، دیگر علوم مرزا عبداللہ بیگ سے پڑھے۔ انگریزی کی تعلیم پورانے خاندانوں میں معیوب سمجھی جاتی تھی پھر بھی اُس کی طرف خود ہی توجہ کی اور اتنی واقفیت حاصل کر لی کہ تار وخطوط واخبار پڑھ لیتے تھے اور گفتگو سمجھ لیتے تھے۔ عربی ادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اور اُسے اُنھوں نے زیادہ تر مولوی طیب صاحب رام پوری سے حاصل کیا تھا جو عربی کے بہت بڑے ادیب تھے۔

عربی اور فارسی اور ادب کی طرح خوش نویسی کا مذاق بھی بہت اعلیٰ رکھتے تھے۔ ابتدائی ایام میں خلیفہ محمد امیر پنجہ کش اور مولوی رضی الدین سے خوش نویسی کی مشق کی اور ایک زمانہ میں اس کا شوق اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ سینکڑوں وصلیاں لکھ ڈالیں۔ حکیم جمیل الدین کا یہ بیان ہے کہ

> ہاتھ میں ایسا لوچ تھا کہ استاد سے تو صرف نستعلیق ہی سیکھا تھا مگر بلا استاد کے خط نسخ اور خط ثلث بھی بہت اچھا لکھ لیا کرتے تھے .... حکیم غلام گیلانی نے جو دربار



خوشنویسی کی مشق

اکبری کے نورتن میں سے تھے جب قانون شیخ کی عربی زبان
میں شرح لکھی تو اپنے غلاموں کو ایک خاص طرح کے خط
نسخ کی مشق کرا کے شرح مذکور کی متعدد نقول اُن سے لکھوائیں
۔۔۔۔۔۔ ان میں کا ایک نسخہ مرحوم کے کتب خانہ میں بھی تھا۔
اُس شرح کا خط حکیم صاحب کو بہت پسند آیا اور اُس کی
پوری پوری نقل کر لیا کرتے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں مزاحاً
اُن کے اس شوق کو کار غلامان کہا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کے انتقال کے وقت اُن کے کتب خانہ میں ہندستان
ایران و عراق کے بہترین خوش نویسوں کی سینکڑوں وصلیاں موجود
تھیں۔ خدا جانے کہ اب ان میں سے کچھ باقی ہیں یا نہیں۔

خاندانی فن کی کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھیں۔ قانون کے
سبق زیادہ تر حکیم غلام رضا خاں سے پڑھے تھے۔ مطب بھی محمود خان
اعظم اور حاذق الملک اوّل کے پاس بیٹھ کر سیکھا کرتے تھے مگر معالجات
میں زیادہ تر حکیم واصل خاں مرحوم کی رائے سے متاثر ہوا کرتے تھے۔
فن طب کے متعلق حکیم صاحب کے کمالات کی تفصیلات اس کتاب
کے مقصد سے باہر ہیں۔ اُس کے لئے تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب
کی ضرورت ہے۔ علاوہ بریں کسی مجتہد فن کے متعلق ابتدائی تعلیم و
تربیت کی تفصیل اُس کی قدرتی صلاحیتوں کے سمجھنے میں زیادہ مدد
نہیں کر سکتی۔ مجتہد تو وہی ہے جو رسم و راہ کی قیود سے آزاد ہو کر اپنا
راستہ خود پیدا کرے اور پیچھے مڑ کر بہت کم دیکھے۔ اس لئے حکیم صاحب
کے علم و فضل کی بنیادوں کا ذکر کسی تفصیل کے ساتھ ضروری نہیں۔

بچپن کا زمانہ جب ختم ہونے لگا اور جوانی شروع ہوئی تو اُن کے ذوقِ علم نے بھی نئی اُمنگیں اور نئی دلچسپیاں پیدا کیں۔ رسمی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر وہ ذوقِ علم کے ناپیدا کنار سمندر کی لہروں سے کھیلنے لگے۔ کتابوں کی دنیا میں کبھی کبھی بالکل گوشہ نشیں ہو جاتے تھے۔ اہلِ علم کی صحبتوں کو عزیز رکھتے تھے۔ محمود خاں جیسے آزاد منش باپ اس کتاب کے کیڑے کو خاص انداز محبت کے ساتھ "ملّا" اور "قل اعوذیا" پکارتے تھے۔

جوانی کے ساتھ ہی ساتھ ورزش جسمانی کے شوق نے بھی ترقی کی۔ گھر ہی میں ایک اکھاڑا تھا وہاں حکیم احمد سعید خاں، واصل خاں، حکیم ناصر خاں وغیرہ ورزش اور کشتی کیا کرتے تھے۔ اکھاڑے کے استاد الف خاں اور اُن کے خلیفہ اسمٰعیل اینچھو تھے۔ ابتدائی عمر میں تمام ہم عمر افراد خاندان انھیں اجنّ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

جوانی کی ابتدائی وضع قطع کو بھی اُن کے استاد حکیم جمیل الدین کی نظر سے دیکھیے:-

جسم نہایت سڈول مائل بہ فربہی۔ لباس کبھی انگرکھا کبھی کرتہ، دوپلّی ٹوپی، چست پاجامہ، ہندستانی جوتہ، کبھی سادہ کبھی کامدار۔ کبھی سر پہ عمامہ بھی۔

رفتار مزاج کے متعلق بھی اُن کے استاد کی تشخیص یہ تھی:

مزاج سنجیدہ، دھیما، خود دار، صلح جو، واصل خاں کا مزاج آتشگیر تھا مگر مسیح الملک کی حکمت عملی کہیے یا اُفتاد مزاج اُس آگ پر پانی کا کام دیتی تھی۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی

کہ خاندان میں جب فریقین کی کشمکش ہوتی تو اُن سے
ہر فریق خوش رہتا۔

بچپن نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُن کی طبیعت کا وہ پہلو بھی نمایاں ہونے لگا جو آیندہ انہیں عوامی زندگی کے میدان میں سرخرو کرنے والا تھا۔ خاندان شریفی میں ملکی یا قومی حالات سے دلچسپی لینے والا اب کوئی باقی نہ تھا۔ فن کی حدود سے آگے کوئی نہ بڑھتا تھا۔ محمود خاں اعظم اور حاذق الملک ویم فن کے ذریعہ سے خدمتِ خلق میں اس درجہ مصروف رہے کہ انہوں نے عوامی زندگی کے مدوجزر کی طرف کبھی نظر نہ اٹھائی البتہ غدر کے حالات محمود خاں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اُن مناظر سے جو جذبہ پیدا ہو سکتا تھا وہ اُن کے دل میں موجود تھا۔ بعد کو اُسی جذبہ سے اجمل خاں نے حصہ پایا۔ لیکن وہ عوامی زندگی کے کھلے میدان میں نکل آئے۔

حکیم محمود خاں ابھی زندہ ہی تھے کہ شریف منزل میں ایک مطبع اکمل الاخبار کے نام سے جاری کیا گیا جس کے روحِ رواں یقیناً اجمل خاں تھے۔ حکیم جمیل الدین کہتے ہیں کہ

> اب جو مجھے اُن کے بچپن کے حالات یاد آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملکی حالات سے اُنہیں قطعاً تعلق تھا۔ محمود خاں کے وقت سے اُن کے یہاں ایک مطبع تھا جس کا نام اکمل المطابع تھا اور اُس سے ایک اخبار بھی نکلتا تھا جس کا نام اکمل الاخبار تھا۔ منشی

بہاری لال مشتاق شاگرد مرزا غالب مرحوم اُس مطبع کے
مہتمم تھے اور کبھی کبھی اخبار کی کاپی بھی لکھا کرتے تھے۔
وہیں بیٹھ کر مرحوم مجھ سے سبق پڑھا کرتے تھے تو میں دیکھتا
تھا کہ بیرونی اخبار جو اکمل الاخبار کے تبادلہ میں آتے
تھے اُن سے ملکی مضامین و مباحث کا انتخاب خود
مسیح الملک مرحوم کرکے اپنے اخبار میں نقل کرنے کے لئے
نشان لگا کر دیا کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی جل کر کہہ دیا کرتا تھا
کہ ان مضامین میں کیا دھرا ہے جس سے اکمل الاخبار
کو سیاہ کرتے ہو تو کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے اور کبھی
کہہ دیتے تھے کہ آپ کیا جانیں ....

مکتب غم دل کا یہ پہلا سبق تھا جو اجمل خاں پڑھ رہے تھے! وہ زمانہ تو گذر چکا تھا جب سیاست کے فیصلے تلوار سے ہوا کرتے تھے، اب تو قلم ہی سیاست کی شمشیر آبدار تھا اور چونکہ خود انہیں ایک دن اسی میدان میں آنا تھا اس لئے قدرتاً ان کی طبیعت شروع ہی سے ان چیزوں سے مانوس تھی۔ افسوس ہے کہ اکمل الاخبار کا کوئی مکمل فائل میسر نہ آیا۔ تاہم جو متفرق اوراق مل سکے وہ اُس زمانہ کی اخبار نویسی کا اندازہ کرنے کے لئے ناکافی نہیں ہیں صحیح تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اکمل الاخبار کی ابتدا سنہ ۱۸۶۵ء اور سنہ ۱۸۶۷ء کے درمیان ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ حکیم صاحب کے بچپن کا زمانہ ہوگا اور قراین یہ ہیں کہ اُس وقت واصل خاں مطبع اور اخبار کی نگرانی کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۴ء کے بعد تک یہ اخبار جاری تھا اور غالباً سنہ ۱۸۸۲ سے سنہ ۱۹۰۰ تک

اجمل خاں کے خیالات اُس کے صفحات پر ظاہر ہوا کرتے تھے ۱۸۸۲ء کے بعد سے انہوں نے اس اخبار میں دلچسپی لی اور بعد کو اُس کی ادارت بھی اُن ہی کی نگرانی میں ہونے لگی۔ اُس کے صفحات زیادہ تر خبروں اقتباسات اور اڈیٹر کی تحریروں سے بھرے ہوتے تھے پھر بھی مراسلتیں اور دوسرے اصحاب کے مضامین بھی درج ہوتے تھے اور ان مضامین کے لکھنے والوں میں ہم اُس زمانہ کے بعض مشہور اہل قلم کے نام پاتے ہیں، مثلاً شمس العلما منشی ذکا اللہ، سید جالب دہلوی حکیم سید احمد حسین، نواب سعید الدین خاں طالب، محمد بشیر مرزا دہلوی، مرزا غلام احمد قادیانی۔

اس گمان غالب کی بنا پر کہ اکمل الاخبار میں اکثر مضامین خود حکیم صاحب لکھا کرتے تھے بے موقع نہ ہوگا اگر ایڈیٹوریل مضامین کے چند نمونے پیش کر دئے جائیں۔ اُن سے اس امر کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ حکیم صاحب کے خیالات کا ارتقا کیونکر ہوا، آغاز کیا تھا اور انجام کی بلندی کہاں تک تھی۔ یہ مضامین درحقیقت اُن کے ابتدائی سیاسی اور عمومی افکار کا پس منظر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ذیل کی چند مثالیں اُن کے اُس زمانہ کے افکار کو پیش کرتی ہیں:-

(۱) میں اُن لوگوں کی زندگی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ جنہوں نے قومی خدمات کیں۔ اپنے ملک کی بہبودی کی خاطر جان ومال سے دریغ نہ کیا اپنی زندگی میں قوم کو ادبار اور پستی سے نکالا اور اُن عزتوں کے مستحق ہوئے جو کبھی برباد

اور فنا ہونے والی نہیں"

(۵ جنوری ۱۸۹۴ء)

(۲) ہندستانیوں کے دل خدا نرم کر دے ورنہ یہ تو کبھی امید نہیں پڑتی کہ وہ ایسی محبت اپنے ملک کی طرف سے پیدا کر سکیں گے .... انگلستان کی عورتوں کے علمی و اخلاقی مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کی عورتیں اس قدر عالمہ اور قابلہ ہوں اُن کی اولاد کو کس قدر تربیت یافتہ ہونا چاہیئے۔ کسی کا کچھ قصور نہیں۔ ہمارا اپنا قصور ہے یہ سستی کاہلی اور ہماری مشیخت اور نخوت اور ہماری احسان فروشی اور آوارگی خدا معلوم ہم کو کس درجہ تک پہنچائے گی۔

(۵ جنوری ۱۸۹۴ء)

(۳) اگر ہم سنہ ۹۲ کے کل واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ضرور ایک عبرت بھری نظر مسلمانوں پر پڑتی ہے۔ اس سال کے صفحات میں مقلدوں اور غیر مقلدوں کے شرمناک مقدمات کثرت سے ملیں گے۔ ہزاروں روپیہ ہمارے ناعاقبت اندیش بھائیوں نے آپس کے جھگڑوں میں صرف کئے اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد اسلامی نگاہ سے جیسا کہ ایک سچا مسلمان اجر آخرت کا مستحق ہوتا ویسے ہی ہماری دلّی کے مسلمان ذلت اور رسوائی کے پورے مستحق ہوئے۔

(۵ جنوری سنہ ۹۴ء)

(۴) لاہور میں جس شان اور امن کے ساتھ نیشنل کانگریس کے اجلاس ختم ہوئے اُس کے لحاظ سے ہم اُس سے کسی مفید نتیجہ کی امید کر سکتے ہیں۔

(۵ رجنوری ۹۴ء)

(۵) ایسے اخبارات بہت کم ہیں جو ہمیشہ گورنمنٹ انگریزی کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گورنمنٹ ہمارے لئے ابر رحمت ہے اور ہم کو گورنمنٹ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اُسی کی اطاعت میں اپنے جان و مال کو قربان کرنا چاہیئے۔ اس قسم کے اخبارات مسلمانوں کے قلم سے لکھے جاتے ہیں —— مگر سچ یہ ہے کہ ایسے اخبارات جس قدر تعداد میں کم ہیں اسی قدر ان اخبارات پر بھروسہ اور یقین کرنے والے بھی کم ہیں۔

(۱۲ رجنوری ۹۴ء)

(۶) قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ کانگریس کامیاب ہوتی جارہی ہے ہندستان کا سب سے زیادہ معزز اور تعلیم یافتہ گروہ جس کی رعایت گورنمنٹ کرتی ہے وہ اُس کا حامی ہے۔ ان لوگوں کی جماعت کو خبطی نہیں کہا جا سکتا۔ گورنمنٹ کی اعانت ان لوگوں کی طرف اس قدر زیادہ ہے کہ ممبر کونسل اور اعلیٰ عہدہ دار اُن ہی کو بنایا جاتا ہے اُن کی گالیوں کو حکومت سنتی ہے اور چپ رہ جاتی ہے بلکہ اُن گالیوں کے صلہ میں ان کو معزز سروس دیتی ہے۔

(۳۰ رجنوری ۹۴ء)

(۷) اخبارات ایک طاقت رکھتے ہیں جو گورنمنٹ یا رعایا کے کسی فرد کی طاقت سے بدرجہا زیادہ ہے۔ اسی باعث سے گورنمنٹ کو ملک کے طرز تحریر ملک کے مذاق اور سب سے زیادہ ملک کے اخبارات اور ملک کے مصنفین کا ازحد خیال رہتا ہے۔ جہاں اخبارات میں مخالفت پھیلی اُسی وقت گورنمنٹ خائف ہو جاتی ہے۔ حاکم وقت یا پارلیمنٹ اخبار کی آزادی کو نہیں روک سکتی کیونکہ آزاد رایوں کا بند ہونا ہی ملک کو ازحد نقصان دیتا ہے بلکہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔"

(۲۶ جنوری ۹۴ء)

(۸) اگر واقعی یہ خبر صحیح ہے کہ قلمرو سرکار نظام میں کوئی شخص بلا منظوری رزیڈنٹ مقرر نہ کیا جائے گا تو سخت افسوسناک بات ہے .... اس بات سے تمام عہدنامے جو نظام دکن اور گورنمنٹ کے درمیان تھے خاک میں مل جائیں گے اور حکومت کے اختیارات حضور نظام کے ہاتھ سے نکل کر رزیڈنٹ کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ یہ حکم سخت ظلم اور جابرانہ زبردستی سے مملو ہے ...."

(۲ مارچ ۹۴ء)

(۹) جیل خانوں میں عیسائی قیدیوں کے پاس پادریوں کو جا کر تعلیم دینے کی اجازت ہے۔ مگر ہندستانی قیدی کہ

جن سے جیل خانے پُر ہیں اُن کے مولویوں اور پنڈتوں
کو اُن کے پاس جا کر وعظ کرنے کی اجازت نہیں ....
بات صرف اتنی ہے کہ جب تک ہم لوگ اپنی رعایا ہونے
کے حقوق سے واقف ہو کر کسی انتظام کے ساتھ اپنے
حق نہ مانگیں گے ہمیں کچھ نہیں مل سکتا۔

(۳ر اگست ۱۹۰۴ء)

"اعتدال" اور "آزادی" اور "حقوق" کے اس مرکب کے ساتھ ہی لاٹ صاحب کی تعریف، ڈپٹی کمشنر کی توصیف، وفاداری کی تلقین، سرکار کی انصاف پسندی کا اعتراف، والیانِ ریاست کی مدح یہ سب بھی اکمل الاخبار کے اوراق پر موجود ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے — آج سے نصف صدی پہلے — جب سوائے ایک دو اخباروں کے ملکی زبان کا کوئی اخبار بھی قومی اور ملکی مسائل پر آزادانہ اظہارِ خیال کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ سرسید کی تحریکوں کو بھی عام اخباروں کی مخالفت کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اکمل الاخبار کے بعض اقتباسات صرف یہ دکھانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں کہ اس زمانہ میں جب خاندانِ شریفی کا طرۂ امتیاز بھی وفاداری سرکار تھی، حکیم صاحب کے قلم سے کچھ اور باتیں بھی نکلتی تھیں جو دبے دبے الفاظ میں نکل جاتی تھیں۔ دوش کے اس دھندلے آئینہ میں بھی خاندان شریفی کے اس نوجوان کے افکار کا "فردا" ایک پرچھائیں کی طرح ہمیں نظر آتا ہے۔ کانگریس کی تحریک کے لئے کلمہ خیر — اس زمانہ میں جب

سرسید کے زیرِ اثر ہر مسلمان کانگریس کی پرچھائیں سے بھی بچتا تھا۔ رعایا اور عوام کے حقوق کی تائید اور آنجباری آزادی اور آزادیِ رائے کی توصیف ـــــ اُس عہد میں جب بارگاہِ حکومت میں ایسے اشارے ناپسند کئے جاتے تھے ـــــ حکیم صاحب کے ابتدائی ترقی پسند رجحانات کی دلیل ہے۔ ان ہی رجحانات کو اُن کا سوانح نگار بعد کی عوامی زندگی میں اُن کے اُس شاندار مستقبل کا دیباچہ قرار دے سکتا ہے جس کی وسعت میں ایک درماندہ قوم اور ایک غلام ملک نے اجمل خاں کے زبان سے حیاتِ نو کا پیغام سنا۔

دورِ اوّل

عہد انتظار خیالات کی پرورش اور عزایم کی نمو اور تخیل کی سربلندی کے لئے عافیت اور خاموشی اور سکون کا ایک ابتدائی دور بڑوں کی زندگی کو بڑا بنانے والا مقرر ہے۔ پیغمبروں کے لئے بھی پہاڑ کی چوٹیوں کا سفر، غاروں کے اندر اعتکاف اور فضائے فکر میں خاموش تنہائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ زمانہ علوئے مراتب و مناصب کی امیدواری کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ملت و ملک کے رہنماؤں کی زندگی کا ابتدائی عہد بھی ایک امتحان عظیم کی تیاری کا زمانہ ہوتا ہے۔ قدرت جو کام اُن سے لینا چاہتی ہے اُس کے لئے مناسب قوائے دماغی اُن کو عطا فرماتی ہے اور پھر زندگی کے ابتدائی عہد میں کچھ فرصت اور کچھ اطمینان خاطر بخشتی ہے کہ وہ قوی نمو پائیں قوت حاصل کرلیں اور اُس دن جب خدا کی دنیا میں اس شخص کو مخلوق خدا کی خدمت کے لئے بلایا جائے تو اس جہاد زندگی میں کام آئیں۔

نو برس تک ریاست رام پور میں اجمل خاں کا سلسلہ ملازمت وہی عہد انتظار تھا۔ اُن کی نوجوانی کا وہ دور ایک ایسا دور تھا جب انہوں نے دولت اور طاقت کے رنگا رنگ تماشے دیکھے اور راستے دیکھے کہ دولت اور ثروت کی سحر کاریوں سے بالکل بے نیاز اور بے پروا ہو گئے۔

ریاست رام پور سے خاندان شریفی کا تعلق زیادہ تر محمود خاں اعظم کے زمانہ سے شروع ہوا تھا۔ اجمل خاں کے یہ تعلقات محض طبی نہ رہے بلکہ ذاتی اور دوستانہ ہو گئے۔ یوں تو حاذق الملک اوّل

اکثر رام پور بلائے جاتے تھے اور اُن کا ایک وظیفہ بھی مقرر تھا لیکن ۱۸۹۲ء میں نواب صاحب نے چاہا کہ خاندان شریفی کا ایک رکن مستقلاً اُن کے پاس رہا کرے، چنانچہ حکیم محمود خاں نے اجمل خاں کو اس کام کے لئے نامزد فرمایا۔ رام پور سے جو وظیفہ اجمل خاں کو ملتا تھا اس سے بہت زیادہ وہ رام پور میں صرف کیا کرتے تھے۔ اُن کا دسترخوان بہت وسیع تھا اور اُن کے خاص خاص احباب کا بیان ہے کہ اُس ابتدائی زمانہ میں بھی اہل حاجت کا ایک ہجوم اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور اُس میں سے ہر ایک کی وہ امداد فرمایا کرتے تھے۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ نواب حامد علی خاں مرحوم نے شروع ہی سے مدرسہ طبیہ اور بعد کو کالج کی اس درجہ سرپرستی کی کہ واصل خاں اور اجمل خاں کے لئے یہ کام بہت آسان ہوگیا۔ اس سرپرستی کی وجہ سے مرحوم نواب صاحب رام پور کا نام طبی تحریک کے ساتھ ساتھ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

رام پور کی زندگی میں حکیم اجمل خاں کو اپنے علمی ذوق کے لئے ایک وسیع میدان میسر آیا۔ یعنی ریاست کے قدیم اور بے مثل کتب خانہ کا اہتمام بھی اُن ہی کے سپرد ہوا۔ بلاشبہ اُن کے علم و فضل کی ترقی میں اس مصروفیت نے بڑی مدد کی ہوگی۔ جس کتب خانہ میں ۱۸ ہزار قلمی نسخے اور ۱۳ ہزار قدیم مطبوعہ کتابیں رکھی ہوں اُس میں اجمل خاں کے ذوق کامل نے کیا کیا مزے نہ لوٹے ہونگے۔ اُس زمانہ میں اُن کے علمی ذوق و شوق کا یہ حال تھا کہ اُنھوں نے اس کتب خانہ کے بہت سے نادر نسخوں کی نقلیں حاصل کرکے اپنے خاندانی ذاتی

اور مدرسہ طبیہ کے کتب خانوں کو مالا مال کر دیا۔

آغاز کار اجمل خاں کی زندگی کا یہ دور انتظار ہی آغاز کار بھی تھا۔ ملک کی قومی تحریکوں پر اُس وقت بھی اُن کی نظر تھی۔ علی گڑھ کی تحریک سے اُن کی دلچسپی اُسی زمانہ میں شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں جب پہلی دفعہ نواب محسن الملک رام پور گئے تو اُن سے اجمل خاں کی ملاقات ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں جب پھر علی گڑھ کا ایک وفد وہاں گیا تو حکیم صاحب نے اُس کی بہت امداد کی۔ ۱۹۰۲ء میں وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مقرر کئے گئے اور تحریک ترک موالات تک ٹرسٹی رہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے قیام رام پور کے اس دور میں اجمل خاں کے جوہر علمی نے بہت فروغ پایا۔ علاوہ کتب خانہ کی مصروفیات کے وہ علوم کی تکمیل سے بھی غافل نہ تھے۔ عربی کے ایک بلند پایہ ادیب مولوی طیب صاحب اُس وقت رام پور میں موجود تھے۔ اُن کی صحبتوں میں حکیم صاحب نے اپنے عربی ادب کو چار چاند لگا دئے چنانچہ ملک کے بڑے بڑے ادیب اُن کی خوش بیانی اور فصاحت و بلاغت کے قائل تھے۔

رام پور میں دوسری ریاستوں کی طرح درباری سازشوں کا سلسلہ بھی جاری رہا کرتا تھا۔ لیکن حکیم صاحب اس کشمکش سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہیں نواب صاحب کا انتہائی اعتماد حاصل تھا اور اُن کا ذاتی وقار بھی اتنا بلند تھا جتنا کہ اہل دربار میں سے کسی کا نہ تھا۔ حکیم صاحب کی خودداری بعض اوقات دوسروں

کے لئے بدمزگی کا باعث بھی ہوتی تھی لیکن اپنی خودداری کے معاملہ میں وہ کسی کی پروانہ کیا کرتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں اُن کی زندگی کی اس دلچسپ داستان میں ملیں گی۔ بڑی بات یہ تھی کہ ریاستوں میں اہل مناصب جو فائدے حاصل کیا کرتے ہیں اُن سے حکیم صاحب قطعاً بے نیاز تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خصوصیات میں اور اپنے بے لاگ ذاتی کیریکٹر میں وہ نواب وقارالملک مرحوم سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ لیکن جہاں حکیم صاحب اپنی بیباک خودداری کے معاملہ میں سخت تھے وہاں اُن کے دل میں نرمی اور وسعت بھی بہت زیادہ تھی۔ دربار رام پور کی سازشوں کے سلسلہ میں منجملہ بہت سے واقعات کے ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان اوراق کے پڑھنے والوں اور اُن لوگوں کو جنہوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں اُن کے اور علی برادران کے اتحادِ عمل کو دیکھا تھا یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ ایک دفعہ رام پور کے اس دور میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مرحوم سے حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات بہت زیادہ خراب ہوگئے تھے۔ خود مولانا محمد علی مرحوم بیان فرماتے تھے کہ یہ باہمی بدمزگی بہت ہی بدنما طریقوں سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ "علی برادران" اُس وقت "علی برادران" نہ تھے اور نہ مولانا محمد علی "مولانا" تھے۔ بلکہ ریاست کے ایک بارسوخ خاندان شیخاں کے نوجوان رکن تھے۔ وہ ریاست کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور رخصت لے کر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں نواب حامد علی خاں کو اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق جو انگلستان میں مقیم تھے

یہ تردد پیدا ہوا کہ کہیں وہ ہندستان آکر ریاست پر قبضہ کرنے کی فکر تو نہیں کر رہے۔ اس بنا پر وہ مولانا محمد علی کے سفرِ انگلستان کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ خاندان شیخاں کو یہ گمان ہوا کہ نواب صاحب کے دل میں یہ تردد حکیم صاحب نے پیدا کیا ہے۔ یہی گمان آگے چل کر بہت سی ناخوشگوار پیچیدگیوں کا باعث ہوا۔ لیکن محمد علی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ اس تمام بدمزگی کے بعد اجمل خاں جب پہلی دفعہ اُن سے دہلی میں ملے تو یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کبھی کوئی بدمزگی پیدا ہوئی تھی۔ گو کہ اخبار ہمدرد کے ابتدائی دور میں محمد علی صاحب حکیم صاحب سے کھچے رہے لیکن بعد کو زندگی کے آخری لمحہ تک اُن کے برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات میں کبھی کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی۔

•

۱۹۰۲ء میں حکیم صاحب نے رام پور میں اپنی مستقل ملازمت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ ایک حیثیت سے حکیم صاحب کی زندگی میں رام پور کے تعلقات کا یہ پہلا دور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ رام پور میں ایک طرف تو اُن کو اپنے علم و فضل کے میدان کو وسیع کرنے کا بہت اچھا موقعہ ملا اور دوسری طرف وہ ریاستوں اور رؤسا کی زندگی کے ماحول سے بھی بخوبی واقف ہو گئے۔ بلاشبہ یہ واقفیت آئندہ زندگی میں اُن کے کام آئی۔ اُس زمانہ میں چونکہ تمام قومی اور تعلیمی تحریکیں اہلِ دول کی توجہات کا سہارا ڈھونڈا کرتی تھیں اس لئے ہر قومی تحریک کے داعی رام پور آیا کرتے تھے اور اس طرح اجمل خاں اُس دنیا کے ایک گوشہ سے واقف ہوتے جاتے تھے

جس دنیا کے وسیع میدان میں انہیں ایک دن اپنی فضیلت اور حوصلہ مندی کا پرچم بلند کرنا تھا۔

اس کے بعد رام پور کے تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ گو کہ نواب صاحب نے چاہا کہ حکیم صاحب پھر رام پور میں قیام کریں لیکن انہوں نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔ رام پور سے واپس آنے کے چند روز بعد حکیم صاحب اس عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے جس نے بالآخر ۱۹۲۷ء میں دوبارہ عود کرکے اُن کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ قلب کے پہلے دورہ کے بعد وہ تبدیل آب و ہوا کے خیال سے عراق چلے گئے اس سفر کا تذکرہ بعد کے اوراق میں آئے گا۔

عراق سے واپس آنے کے بعد رام پور سے تعلقات کا سلسلہ پھر جاری ہوا۔ لیکن اب اس تعلق کی نوعیت فنی بھی تھی اور دوستانہ بھی۔ وہ بہت زیادہ رام پور آتے جاتے تھے مگر پابند نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حامد علی خاں صاحب والئ رام پور اور اجمل خاں کے ذاتی تعلقات عجیب و غریب تھے۔ دونوں مختلف قسم کے انسان تھے اور مختلف خصوصیات رکھتے تھے۔ اکثر امور میں دونوں کا نقطہ نظر بھی متضاد تھا۔ ایک دولت کا لاڈلا بیٹا تھا' دوسرا علم و فضل اور انسانیت کے اعلیٰ کمالات کا سرمایہ دار تھا۔ طنطنۂ حکومت اور رئیسانہ دبدبہ ایک کی زندگی کا جزو اعظم تھا تو دوسرے کی زندگی سادگی' سنجیدگی اور غیرتِ انسانی کا نمونہ تھی۔ ایک اپنے بلند حوصلوں کو سونے چاندی کی ترازو میں تولتا تھا تو دوسرا اپنی زندگی کے وقار کی ضمانت اپنی خالص انسانیت سے حاصل کرتا تھا۔ دونوں بلند مرتبہ تھے مگر مختلف وجوہ

سے۔ دونوں عالی حوصلہ تھے مگر جداگانہ نوعیت کے ساتھ۔ دونوں بڑے آدمی تھے مگر مختلف صورتوں میں۔ علم کی دولت حامد علی خاں کے پاس بھی تھی مگر علم نوازی اُس سے زیادہ تھی اور باوجود اختلافِ مزاج و حالات علم و فضل اور فہم و ذکا کا یہی اشتراک اِن دونوں کے درمیان محبت کی ریشمی ڈوری بن گیا تھا۔ بلاشبہ دونوں اپنے مختلف مذاقِ زندگی سے واقف تھے اور دونوں اس اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے جھجکتے تھے، لیکن شاید یہی اختلاف اتحاد کا باعث بھی تھا۔ یہ ایک عجیب اجتماعِ ضدین تھا۔ اور یہ کوئی ایک دو سال یا دس پانچ سال کی بات نہ تھی۔ تقریباً ۳۵ سال تک اِن عجیب دوستوں کا یہ اجتماع قایم رہا۔ تاآنکہ موت کے بے پناہ ہاتھ نے اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ جس وقت اجمل خاں برطانوی حکومت کے سخت ترین مخالف، تارکِ موالات اور "باغی" تھے رام پور کی صحبتوں میں جہاں کھدر اور گاندھی کیپ ممنوع تھی اُن کے تمام سیاسی امتیازات قایم رہتے تھے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد نواب صاحب نے کہدیا تھا کہ اُن کا ایک بازو ٹوٹ گیا اور وہ اب زیادہ زندہ نہ رہ سکیں گے اور ½ ۲ سال سے زیادہ زندہ نہ رہے۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "میں مذہباً شیعہ ہوں اور پیری مریدی کا قائل نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں اگر دنیا میں کسی کا مرید ہوتا تو اجمل خاں کا ہوتا۔ میں نے اُن کے اندر جو بات پائی وہ بڑے

بڑے ولیوں میں نہیں ہوسکتی۔"

قیام رام پور کے ابتدائی دور میں حکیم صاحب کا ایک علمی کارنامہ یہ بھی تھا کہ اُنہوں نے سرکاری کتب خانہ کی فہرست مکمل کردی اور اُس پر ایک عالمانہ دیباچہ لکھا۔

یوں تو ان اوراق میں بار بار رام پور کا ذکر آئے گا لیکن دراصل رام پور کے اس دور کے ساتھ حکیم صاحب کی زندگی کا ابتدائی دور جسے ہم نے "عہدِ انتظار" کہا ہے ختم ہوگیا تھا اور اب انہوں نے اجتماعی اور قومی زندگی کے وسیع تر میدان میں قدم اُٹھایا تھا۔

مدرسہ طبیہ

حاذق الملک اوّل کے انتقال کے بعد حکیم صاحب کو سب سے زیادہ فکر مدرسہ طبیہ کی ہوئی جس کی نگرانی کا تمام بار اب اُن کے کاندھوں پر آگیا تھا۔ ۱۴ راگست ۱۹۰۱ء کو دہلی کے ٹاؤن ہال میں ڈپٹی کمشنر کے زیر صدارت ایک عام جلسہ ہوا اور حکیم صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کے لئے ایک اپیل شائع کی۔ اُنہوں نے اس اپیل میں بتایا کہ اُس وقت ۶۵ طلبا اس مدرسہ سے سند حاصل کرچکے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ۶۵ اطبا کو اپنی روزی کمانے کے قابل بناکر مدرسہ نے ابنائے وطن کے لئے گویا ۱۳ لاکھ کی جائداد پیدا کردی ہے۔ اگر مدرسہ طبیہ نے اپنے اُس ابتدائی دور میں عوام کے لئے ۱۳ لاکھ کی جائداد پیدا کردی تھی تو اندازہ کیجئے کہ حکیم صاحب نے مدرسہ کو کالج بنا دینے کے بعد اس قومی جائداد میں کتنا زیادہ اضافہ کیا ہوگا۔ افسوس کہ حکیم صاحب

کے بعد اس قومی جائداد کا بڑا حصہ اُن لوگوں کی غفلت سے ضائع ہو چکا ہے جنہیں غافل نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اپنے اس اپیل کے سلسلہ میں حکیم صاحب نے مختلف اضلاع کا دورہ کیا اور علی گڑھ میں اُن کی اس تحریک کا پرجوش استقبال کیا گیا۔

سنہ ۱۹۰۳ و سنہ ۱۹۰۴ء میں مدرسہ کے متعلق مصروفیت کی وجہ سے حکیم صاحب کا زیادہ وقت دہلی میں گذرا۔ لیکن یہ زمانہ اُن کے لئے بے لطف رہا اس لئے کہ مقامی فرقہ بندی کے بعض جھگڑوں نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔ دہلی کے ایک مشہور طبیب حکیم رضی الدین مرحوم اور حکیم صاحب کے درمیان بعض درمیانی لوگوں نے بہت بے لطفی پیدا کر دی تھی۔ اس قضیہ کی تفصیلات ہمیں قاری سرفراز حسین مرحوم کے قلم سے معلوم ہوئی ہیں جو دونوں فریقوں سے قریبی ربط رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُس وقت تک چونکہ حکومت اور کسی فریق کے درمیان کوئی سیاسی اختلاف نہ تھا اس لئے یہ فریق بندی زیادہ تر شخصی تھی۔ قاری صاحب مرحوم اپنی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

> حکیم اجمل خاں مرحوم سے جتنی مرتبہ میں نے ایک درمیانی شخص کی حیثیت سے گفتگو کی تو اُن کو خلوص اور قوم کی ہمدردی سے پُر پایا۔

اب نہ اجمل خاں اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ شفاء الملک، لہذا اس قضیہ کی تفصیلات کا اُن اوراق میں ذکر کرنا محض فضول ہے۔ اس قدر کہدینا کافی ہوگا کہ اجمل خاں کی زندگی کے کسی دور

میں بھی مقامی اور شخصی کشمکش اُن کی نظر میں کوئی قیمت نہ رکھتی تھی۔
۱۹۰۴ء میں حکیم صاحب عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس علالت نے اتنا طول کھینچا کہ ماہ ستمبر میں اُنہوں نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے سفر شروع کیا۔ وہ اپنی صحت سے مایوس ہوگئے تھے مگر انہیں کیا خبر تھی کہ کارپردازان قضا و قدر نے ابھی ۲۳ برس کی باعزت و اقبالمند زندگی اُن کے لئے محفوظ رکھی ہے۔ اُس وقت ہندستان کی سیاسی دنیا میں ایک انقلاب نمودار ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اور سیاست کے سمندر میں ایک نیا طوفان آنے والا تھا۔ اُس طوفان کی موجوں سے کھیلنے کے لئے ابھی حکیم صاحب کی عمر کے ۲۳ برس اور باقی تھے۔

سفر عراق

۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور براہ کراچی عراق گئے۔ افسوس ہے کہ اس سفر کے حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہ آیا۔ جو لوگ اُس زمانہ کے جاننے والے تھے وہ بھی اب باقی نہیں ہیں۔ مرحوم کے کتب خانہ میں البتہ ایک پرانی بیاض ہاتھ آئی جس میں اخراجات سفر اور نقل و حرکت کے بعض اشارے خود حکیم صاحب کے قلم سے پائے گئے۔ اس بیاض سے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸ یا ۱۹ مارچ کو کراچی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ ۳۱ مارچ کو بصرہ پہنچے یکم اپریل کو بغداد شریف گئے اور ۲۵ کو نجف اشرف ہوتے ہوئے ۲۸ اپریل کو کربلا پہنچے۔ حافظ احمد علی خاں کا یہ بیان ہے کہ وہ سفر عراق میں کمزوری کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے پر سوار نہ ہوسکتے

تھے بلکہ کجاوہ میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لئے جایا کرتے تھے"۔ لیکن پھر بھی بعض اوقات پیدل چلتے تھے۔ چنانچہ اپنی یادداشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"الکفل سے ۹ بجے کوفہ۔ حضرت یونس کے مسافر خانہ میں رات کو آئے۔ آج ۲۴ تاریخ ہے۔ کوفہ سے گدھوں پر روانہ ہوئے۔ الحمد للہ کہ سنت اہل بیت بھی ادا ہوئی۔ تنہا ہوں دہوپ میں پیادہ چل رہا ہوں۔ اس وقت کوئی رفیق ہمراہ نہیں۔ سب نے اپنے آرام میں ساتھ چھوڑ دیا۔ ظاہری پریشانی ہے مگر دل نہایت خوش ہے۔ طبیعت میں ایک جذبہ اُس وقت سے پیدا ہو گیا ہے جب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقتل کی زیارت کی ہے"۔

مقتل علی سے پیدا ہونے والے جس جذبہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں وہ ایک اجمال ہے جس کی تفصیل اُن کی زندگی کے آنے والے زمانہ نے پیش کی۔

شورش بنگالہ جس زمانہ میں حکیم صاحب عراق کا سفر کر رہے تھے ہندستان میں انقلاب کا ایک نقشہ سیاسی شورش کی صورت میں تیار ہو رہا تھا۔ یہ زمانہ لارڈ کرزن کی حکومت کا تھا۔ بنگال میں بنگالی قوم کی بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری کو دیکھ کر "ملک معظم" کے اس نمایندے کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح بنگالیوں کی قوت کو توڑا جائے اور ہندو مسلم سوال پیدا کر کے سیاسی شورش کا رخ فرقہ واری کشمکش کی طرف پھیر دیا جائے۔

چنانچہ ۷؍اگست ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگالہ کا اعلان شائع ہوا۔ وہ ایک چنگاری تھی جو بنگال کے بارود خانہ میں گری۔ ۵۷ء کے بعد سے اُس وقت تک سیاسی غلامی کے خلاف ہندستان کی سرزمین پر کوئی اتنا بڑا مظاہرہ نہ ہوا تھا اور یہ اُن چار مظاہروں میں سے پہلا مظاہرہ تھا جنہوں نے بالآخر برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ شورش ۰۵ء میں تو زیادہ تر بنگال تک محدود رہی، لیکن ۱۴ سال بعد ۱۹ء میں اُس نے "ترک موالات" کی شدید تر صورت اختیار کی۔ تیسری دفعہ گیارہ سال بعد ۳۰ء میں خلاف ورزی قانون کے نام سے شروع ہوئی۔ اُس وقت حکیم صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ چوتھی دفعہ دوسری جنگ عظیم کے آخری سال میں اُس جہاد آزادی نے "QUIT INDIA" کا نعرہ اختیار کیا اور غلامی کا یہ آخری سانس تھا جس سے ۴۷ء میں آزادی کی روح نے ایک نیا جنم لیا۔ تقسیم بنگالہ کے خلاف بنگالیوں کی شورش مطالبہ آزادی کی پہلی موثر ضرب تھی جس کا نشان ہندستان کی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس تحریک کے رہنما اُس وقت سر نیدر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس تھے۔ بنگال کے سرکار پرست طبقے بھی اس جد و جہد میں قوم پرستوں کی طرف در پردہ جھکے ہوئے تھے گو کہ بظاہر وہ سرکار کی وفاداری کے راگ گا رہے تھے۔ جب بنگال میں حکومت کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" پالیسی کے خلاف یہ محاذ قائم تھا تو صوبجات متحدہ میں بھی مسلمان سرکار پرستوں کی آنکھیں کچھ کچھ کھلتی جا رہی تھیں۔ اُس وقت تک علی گڑھ کی تحریک

تمامتر سرکار کی وفاداری پر مبنی تھی، سرسید احمد خاں وفاداری کے اُس حلقہ دام خیال کو کبھی نہ توڑ سکے۔ اُن کے گرد و پیش انگریزوں کے کارندے اسی کام پر معمور تھے کہ اس تعلیمی تحریک کا کوئی ربط ملک کی سیاسی بیداری سے قایم نہ ہونے دیں۔ لیکن زمانہ اپنے مکتب میں سست سے سست طالبعلم کو بھی اپنے سبق پڑھا دیتا ہے۔ گو کہ سرسید نے اپنی زندگی میں علی گڑھ کی تحریک کو تعلیمی حدود کے اندر محدود رکھا لیکن اُن کے بعد اُن کے جانشینوں کو اپنے گرد و پیش بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ سبق جو سرسید نہ پڑھ سکے تھے محسن الملک نے اُس وقت پڑھا جب "تقسیم کرو" کی پالیسی کے تحت انگریزی حکومت نے صوبہ جات متحدہ میں ہندی اُردو کا سوال پیدا کیا۔ اردو ہندی کا سوال گو کہ بظاہر ایک غیر سیاسی اور زیادہ تر تعلیمی سوال تھا مگر بباطن وہ کلیتاً سیاسی مسئلہ بن گیا تھا۔ محسن الملک اور اُن کے ہم خیال اصحاب اچھی طرح دیکھ رہے تھے کہ انگریزی حکومت کی دستنگری اُن کو کہاں لئے جا رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے کانگریس کے قریب جانا بہت بُرا سمجھتے تھے لیکن ہندی اردو کے مسئلہ نے انہیں اس حقیقت سے ضرور آشنا کر دیا کہ اب محض انگریز کی دست نگری سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ نہ ہوگا جب تک وہ خود اپنے بازو میں بھی کچھ قوت پیدا نہ کریں۔ جیسے ہی محسن الملک نے حکومت کے منشا کے خلاف اردو ہندی کے مسئلہ میں اپنی قوم کے احساسات کو متحرک کرنا شروع کیا وہ سرکار کی نظروں سے

گر گئے۔ اُن کے بعد نواب وقار الملک میدان میں آئے اور محسن الملک سے چند قدم آگے بڑھ گئے۔ چنانچہ اُنھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا اور حامد علی خاں بیرسٹر لکھنؤ شرف الدین صاحب بیرسٹر پٹنہ اور منشی احتشام علی صاحب اور لکھنؤ کے دیگر اہل الرائے کی مدد سے اس تنظیم کا ایک نقشہ بنا لیا۔ اس طرح ہندستان کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا سنگ بنیاد نواب وقار الملک کے ہاتھوں سے رکھا گیا اور اُن کے ہاتھوں نے وہ دروازہ کھولا جس کو سر سید نے بند رکھا تھا۔

قومی زندگی کی منزلوں کا اتار چڑھاؤ کچھ عجیب ہے۔ جو لوگ کل تک صف اوّل میں ہوتے ہیں وہ آج پچھلی صف میں ہٹ جاتے ہیں اور جو لوگ کل تک پچھلی صف میں تھے وہ آگے آجاتے ہیں۔ عہد کے بعد عہد دور کے بعد دور اور منزل کے بعد منزل آتی ہے۔ قوموں کے قافلے اسی طرح چلتے رہتے ہیں اور ہر منزل پر اُن کے قافلہ سالار بدلتے رہتے ہیں۔ پرانے اور تھکے ہوئے راہرو پیچھے رہ جاتے ہیں اور تازہ دم دوڑنے والے آگے نکل جاتے ہیں۔ تقسیم بنگالہ کے وقت سر نیدر ناتھ بنرجی اُس صوبہ کی سیاسی بیداری کے رہنما تھے لیکن چند ہی سال بعد اُن کی جگہ بنگال کا ایک غریب لڑکا (سی۔آر۔داس) جو اپنے آغاز میں سر نیدر ناتھ بنرجی کا دامن بھی نہ چھو سکتا تھا اپنے انجام میں سارے ہندستان کا نامور قائد بنا۔ اسی طرح علی گڑھ کی تحریک میں سر سید کی قیادت کا مقام

وقارالملک نے پیچھے چھوڑ دیا اور وہ اس حقیقت سے روشناس ہوگئے کہ زندگی کا بہتا ہوا دریا بہے جاتا ہے اور کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اُس عہد کے مسلمانوں میں جب ہندستانی مسلمانوں کے افکار کا انقلاب شروع ہونے والا تھا دو آدمی سب سے آگے آئے ایک وقارالملک اور دوسرے اجمل خاں۔ وقارالملک بلحاظ عمر اور تجربہ کے اُس وقت اجمل خاں سے بالاتر تھے۔ لیکن اس لحاظ سے دونوں بالکل ایک سطح پر تھے کہ جس طرح وقارالملک نے باوجود "قدیم" ہونے کے "جدید" کی رہنمائی کی اسی طرح اجمل خاں نے بھی اپنی خاندانی روایات اور ہندستانی مسلمانوں کے قدیم مسلک سے روگردان ہوکر آگے بڑھنا ضروری سمجھا۔ وہ اپنی عزیمت اور حوصلہ مندی میں وقارالملک کے دوش بدوش تھے بلکہ اُن کے انتقال کے بعد تو اس راہ میں بہت آگے نکل گئے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۷ء تک مسلمانانِ ہند کے قومی ارتقا کی منزلیں اس طرح تھیں کہ وقارالملک، اجمل خاں اور محمد علی۔ سیاسی افکار کے یہ تین دائرے تھے، جن کے حلقہ میں بہت سے قومی کارگزار داخل ہوئے اور آگے بڑھ گئے یا پیچھے رہ گئے اور ختم ہوگئے۔ اس میں کلام نہیں کہ تقسیم بنگالہ کی شورش نے مسلمانوں کو ایک ایسا جھٹکا دیا تھا کہ وہ سوچنے لگے کہ کب تک وہ علی گڑھ کے تعلیمی تحریک کے دائرے میں بند رہ سکتے ہیں لیکن لارڈ کرزن کے جانشین لارڈ منٹو کی پالیسی نے سونے والوں کو اور زیادہ جگا دیا۔ اجمل خاں جب

سفر عراق سے واپس آئے تو انہوں نے ملک میں نئی ہوائیں چلتی ہوئی پائیں۔ چونکہ وہ خود علی گڑھ کی تحریک سے بہت کچھ وابستہ رہ چکے تھے لہذا وقار الملک کے خیالات و افکار سے اُن کا بہت جلد متفق ہو جانا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔

طبی کانفرنس

فروری ۱۹۰۶ء میں حکیم صاحب نے طبی تحریک کا ایک قدم اور آگے بڑھایا اور طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ بعد کو اس کانفرنس نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی اور اُس کے ذریعہ سے حکیم صاحب نے ملک کے اطبا کو ایک مرکز سے وابستہ کر لیا۔ اس پہلی کانفرنس کے اجتماع میں حکیم صاحب نے اپنی تحریک کے جو مقاصد بیان فرمائے اُن کی ایک تحریری یادداشت گویا ایک بنیادی دستاویز ہے جس سے حکیم صاحب کے مقاصد کا پتہ چلتا ہے اُنھوں نے کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> "آج کل ہم لوگوں کو نئی روشنی کے زمانہ میں ایک مقابلہ درپیش ہے۔ طب یونانی کی جو حالت ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمارے یہاں جدید تصنیف و تالیف کا سلسلہ بالکل بند ہے......... نصاب تعلیم میں بہت تھوڑی کتابیں داخل ہیں جو ضروریات زمانہ پر نظر کرکے بالکل کافی نہیں معلوم ہوتیں۔ قانون شیخ الرئیس منتہائے تعلیم سمجھا جاتا ہے......... بہت سے نئے امراض پیدا ہو گئے ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی تدوین کی ہمیں ضرورت ہے۔ جیلانی نے قانون شیخ کی شرح

لکھتے ہوئے ہر عضو کے امراض کی تشریح ختم کر کے آخر میں
بہت سے وہ امراض اور اسباب و علامات و معالجات
اپنی طرف سے اضافہ کئے ہیں جو شیخ نے نہیں لکھے تھے۔
چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اب موقوف ہے اس لئے
موجودہ زمانہ میں اس قسم کی تدوین کا کوئی ذریعہ نہیں۔
ایک اور تاسف کی بات یہ ہے کہ طب یونانی کا بہت بڑا
ذخیرہ برباد ہو رہا ہے اور ہم لوگوں کو اُس کا احساس
تک نہیں۔ جالینوس کی تمام کتابیں ہمارے نصاب سے
چھوٹی ہوئی ہیں۔ لیکن جالینوس کی قریب قریب کل کتابوں
کا ڈاکٹر صاحبان نے ترجمہ کر لیا ہے..........

ہمارے ذخیرہ ادویہ کی حالت بھی بہت کچھ اضافہ اور
اصلاح کی محتاج ہے۔ صرف ہندستان میں بہت سی جڑی
بوٹیاں ایسی موجود ہیں اور کوشش سے فراہم کی جا سکتی
ہیں جو ہر طرح بکار آمد و مفید ہونگی۔ لیکن ہم اس طرف مطلق
توجہ نہیں کرتے۔ ہمارے مجربات کی یہ حالت ہے کہ جس کے
پاس کوئی نسخہ ہوتا ہے وہ اُسے بُری طرح چھپاتا ہے جس
کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اُسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے
.... ہماری طب کا بہت بڑا حصہ جا چکا ہے اور ہم
اتفاق اور دلی ہمدردی کے ساتھ اپنی طب یونانی اور
ویدک کی خدمت اور حفاظت پر آمادہ نہ ہوئے تو سمجھ لیجئے
کہ وہ زمانہ آگیا ہے کہ ان کا بقیہ حصہ بھی ہمارے ہاتھوں

سے نکل جائے گا۔"

اس طرح حکیم صاحب نے طبی تحریک کے متعلق اپنے نصب العین کو پیش کیا تھا اور ان ہی خطوط پر وہ عمر بھر کام کرتے رہے اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس تحریک کا ایک قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ حکیم صاحب اول دن سے ویدک اور یونانی طب کی متحدہ اور مشترکہ ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ سیاسی حیثیت سے اُس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کا سوال زیادہ نمایاں نہ ہوا تھا جیسا کہ بعد کو ہوا لیکن اپنے ملک کی زندگی میں اس اشتراک اور اتحاد کی اہمیت بہت پہلے سے حکیم صاحب کی نظر کے سامنے تھی۔ درحقیقت اُن کی ساری عوامی جدوجہد کا سنگ بنیاد یہی وہ تھا۔

شملہ وفد اُسی سال اکتوبر میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر جنرل کی خدمت میں بمقام شملہ حاضر ہوا۔ حکیم صاحب بھی اُس وفد کے ایک رکن تھے۔ اس وفد کا ہندستان کے متعلق برطانوی سیاست اور ہندستان کے مستقبل سے بہت گہرا تاریخی تعلق ہے جسے نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ اُس وقت ہندستان کی انگریزی حکومت تقسیم بنگالہ کی شورش سے متاثر ہو کر اس فکر میں تھی کہ مسلمانوں کو اپنے انعام واکرام کے ذریعہ سے قابو میں رکھے اور ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی تحریک میں شامل نہ ہونے دے۔ بہت سے مسلمان لیڈر حکومت کے گوشہ چشم کی ترغیبات سے متاثر ہو کر شملہ کے رخ سجدہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے ضروری یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہونے

سے پہلے اپنے وجود کو ملک کی عوامی زندگی میں با اثر بنا لیں۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ حکومت کی اُن مشکلات میں جو ہندوؤں کی شورش سے پیدا ہو رہی ہیں اپنے مقصد کے لئے فائدہ حاصل کریں۔ جب شملہ کی چوٹیوں سے کچھ اشارے کنائے شروع ہوئے تو ایسے ہی مصالح کے تحت نواب وقارالملک نے لبیک کہی اور مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کی ایک فہرست پیش کر کے گورنر جنرل سے کچھ وعدے حاصل کر لئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں نے حکومت کی مشکلات سے اپنوں کے لئے کچھ حاصل کر لیا اور حکومت نے سمجھا کہ اس تدبیر سے اُس نے ہندوؤں کی قومی تحریک اور مسلمانوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دینے کا اچھا انتظام کر لیا۔ ان حالات میں حکیم صاحب نواب وقارالملک کے ساتھ ساتھ قومی جد وجہد کی ایک ایسی نئی دنیا میں داخل ہوئے جو اُن کی خاندانی روایات سے بہت دُور تھی۔ یوں تو وہ بالطبع سرکار و دربار کی نمائشوں سے بیزار رہتے تھے تاہم خاندانی روایات اور اُس وقت کے حالات کے تحت اُن کا نام ابھی تک وفاداران سرکار کی فہرست میں موجود تھا۔ وفد کے ساتھ شملہ کا سفر اور گورنر جنرل کے حضور میں باریابی اُس شملہ سے اُن کی پہلی آشنائی تھی جس کی چٹانوں سے پندرہ سولہ ہی سال بعد انہیں ایک سخت ٹکر لینی تھی۔

اکتوبر میں شملہ کی چوٹیوں سے خوش خوش اور بامراد واپس آنے والے اراکین وفد نئے حوصلے لیکر ایک نئے میدان میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ اب مانگا ہے تو ایسا انتظام بھی ہونا چاہئے

کہ جو کچھ مانگا ہے وہ مل جائے۔ خود حکومت کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ جماعت تیار ہو جائے تاکہ ضرورت کے وقت اُس کو مراعات دیکر خوش کیا جا سکے اور کانگریس کی بڑھتی ہوئی تحریک کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکے۔ تقریباً نصف صدی کے بعد برطانوی تدبر کا یہ منصوبہ کامیاب اور بار آور ہوا۔

مسلم لیگ دسمبر ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں ہونے والا تھا۔ تقسیم بنگالہ کی وجہ سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں ایک حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ سید نواب علی چودھری اور نواب ڈھاکہ سر سلیم اللہ بہت خواہشمند تھے کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت ضرور بنائی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے نواب وقار الملک نے ڈھاکہ میں ایک جلسہ کرنے کا ارادہ کیا۔ گو کہ اُن کے اس خیال کو نواب محسن الملک نے پسند نہیں کیا (وہ ہندی اُردو کے معاملہ میں حکومت کے ہاتھ سے چوٹ کھا چکے تھے) اور بذریعہ اشتہار اپنے اختلاف کو ظاہر بھی کر دیا لیکن ہوا کا رخ اب بدل رہا تھا اور محسن الملک کا یہ اختلاف اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ پہلا جلسہ ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور وقار الملک کے ہاتھوں سے مسلم لیگ کا سنگ بنیاد نصب ہو گیا۔ اُس وقت مسلمانوں کی نئی نسل کے نوجوان لیڈروں کا ایک گروہ وقار الملک کے گرد و پیش تھا۔ محمد علی، مظہر الحق، ظفر علی خاں، حسن امام، خواجہ غلام الثقلین اور کچھ وہ پورانے لوگ بھی جو ڈرتے ڈرتے اس میدان میں قدم اٹھا رہے تھے نوجوان لیڈروں کی قوت عمل اب اپنے لئے ایک

وسیع میدان مانگ رہی تھی۔ مظہرالحق نے تو ڈھاکہ کے جلسے میں صاف صاف کہا کہ

"نوجوان اب جنگ کے پیاسے ہیں اس لئے ضروری ہے
کہ اُن کے لیڈر معمر اور تجربہ کار ہوں تاکہ نوجوانوں کی بیش
از بیش نوجوان قوتوں کو صحیح طور پر منظم کر سکیں۔"

پہلا ہی بنیادی رزولیوشن جس میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا گیا نواب ڈھاکہ نے پیش کیا اور حکیم صاحب نے اُس کی تائید کی۔ لیگ کے جو ممبران پنجاب کی نمایندگی کرنے کے لئے نامزد کئے گئے ان میں بھی حکیم صاحب کا نام نمایاں تھا اس طرح وہ مسلم لیگ کے ابتدائی معماروں میں سے ایک تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس تیزی کے ساتھ وہ نوجوانوں کے دوش بدوش اس میدان میں آئے اور ۱۹۰۶ء کے بعد کس تیزی سے انھوں نے سیاست کی منزلوں کو طے کرنا شروع کیا۔ جیسا کہ بعد کے اوراق سے ظاہر ہوگا وہ آخر وقت تک مسلم لیگ کی پالیسی کو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتے رہے تاآنکہ وہ کانگریس کے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔

کہا جا سکتا ہے کہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔

کانگریس تقسیم بنگالہ کے قضیہ نے کانگریس کی قوتِ عمل میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں اُس کا پہلا جلسہ بمقام پونا منعقد ہوا تھا اور دوسرا جلسہ کلکتہ میں ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں حکومت اس قومی تحریک سے اس درجہ بدگمان ہو گئی تھی کہ لارڈ کرزن نے علانیہ کانگریس کی

کارروائیوں پر نکتہ چینی کی۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگالہ کے بعد تو گویا کانگریس اور حکومت کے درمیان کھلا ہوا اعلان جنگ ہو گیا۔ وہ اعلان جنگ جس کی شدت آیندہ چالیس سال میں ہر روز بڑھتی ہی گئی۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب اعتدال پسند قوم پرست جو نہ تو قوم کے بڑھتے ہوئے جذبات سے بے پروا رہنا چاہتے تھے اور نہ حکومت کے دامن کو ہاتھ سے دینا چاہتے تھے سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت تک کانگریس کی تحریک میں بدرالدین طیب جی اور عبداللہ سیانی جیسے چند ہی مسلمان شریک تھے ورنہ عام طور پر سرسید احمد خاں کے زیر اثر مسلمان اُس سے الگ تھے۔ لیکن اس علیحدگی اور اجنبیت کے باوجود کانگریس جو کچھ کر رہی تھی اُس سے بالواسطہ مسلمانوں کے خیالات بھی متاثر ہو رہے تھے اور ان میں بھی مطالبہ حقوق کا ایک جذبہ پیدا ہو رہا تھا گو کہ اس جذبہ کا رخ اُس وقت تک فرقہ واری سیاست کے میدان تک محدود تھا۔ لارڈ کرزن درحقیقت ہندستان کا ایک بڑا محسن اور مربی تھا اس لئے کہ تقسیم بنگالہ کی مشعل اُسی نے روشن کی جس سے ملک کے ہر گوشہ میں مطالبہ حیات قومی کے چراغ روشن کئے جانے لگے۔ لوگوں نے حکومت سے قوت آزمائی کا حوصلہ پایا۔ ایک صوبہ کی مثال دوسرے کے لئے اور ایک شہر کا عمل دوسرے کے لئے قابل تقلید بن گیا۔ شورش بنگالہ کی صدائے بازگشت ۱۹۰۷ء میں پنجاب سے اٹھی۔ حکومت نے قانون نو آبادیات جاری کر کے پنجاب کے بہت سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو اُن کے حقوق سے محروم کر دیا۔ اس قانون

کے خلاف تمام صوبہ میں سخت ہنگامہ برپا ہوا۔ لاہور اور راولپنڈی میں سخت بلوے ہوئے اور اب ملک کی اس فضا میں اہلِ ملک کے تازہ دم لیڈر برسرِ کار آ گئے۔ اس سے پہلے لالہ ہنسراج، لاجپت رائے اور اجیت سنگھ محض مقامی لیڈر اور قومی خادم تھے لیکن قانون نوآبادیات کے ہنگامہ نے اِن لوگوں کو حقوق طلب جماعت کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا۔ پنجاب میں امنِ عامہ کے لئے وہ زمانہ بہت نازک گذرا۔ آخر حکومت نے ان تینوں لیڈروں کو گرفتار کر کے برما میں نظر بند کر دیا۔ اُس نے اپنے بازو کی قوت سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کو دبا تو لیا مگر بجھا نہ سکی۔ جو چنگاریاں بظاہر خاکستر ہو گئیں وہی چند سال بعد اور ڈائر کے سر پر بجلیاں بن کر چمکیں۔ یہ داستان جس سے حکیم صاحب کی زندگی کو گہرا تعلق تھا بعد میں بیان ہو گی۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب کی شورش کو روکنے کے لئے قانون مجالس بغاوت پاس کیا گیا اور اروبند دگھوش گرفتار کر لئے گئے۔ مہاراشٹرا میں تلک کو ۶ سال قید کی سزا دی گئی۔

ملک کے یہ عام حالات تھے جب حکیم صاحب اپنی زندگی بیشتر اوقات اپنے مطب میں، رام پور میں اور علی گڑھ کالج کے حالات میں اور مسلم لیگ کی تحریک میں صرف کر رہے تھے۔ کانگریس کی تحریک میں وہ اُس وقت تک شریک نہ تھے۔ لیکن اکمل الاخبار کے مضامین سے (جو اُن کی سرپرستی میں شائع ہوا کرتا تھا) پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت بھی وہ کانگریس کی تحریک کو دلچسپی اور ہمدردی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

دواخانہ مدرسہ طبیہ کے لئے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ پیدا کرنے کے لئے حکیم صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ دواخانہ کو جو حصہ داروں کے مشترکہ سرمایہ سے جاری تھا مدرسہ کے لئے وقف کردیا جائے۔ چنانچہ تمام شرکا کے حصص مدرسہ نے خرید لئے اور حکیم صاحب نے یہ ایک مستقل جائداد مدرسہ کے لئے وقف کردی۔ مدرسہ کی زندگی میں یہ وقف ایک اہم ترین نشان راہ ہے اس لئے کہ اسی نقطہ سے مدرسہ کی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اُس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے یہ ایک عظیم الشان جائداد تھی جو حکیم صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی ملکیت سے نکال کر طب یونانی کی عزیز تحریک کے حوالہ کردی۔ اُن کی وفات کے وقت اس جائداد کا خالص منافع دو لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب تھا جو سب طبیہ کالج پر صرف کیا جاتا تھا۔ اس طرح حکیم صاحب نے مدرسہ کو ہرکس وناکس کی امداد و اعانت کا محتاج بنانے کے بجائے خود اپنے خاندانی فن کے سپرد کردیا۔ اُن کے مطب پر دواخانہ کی ترقی منحصر ہوگی اور دواخانہ پر مدرسہ کی ترقی کا انحصار ہوگیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی خاندانی اور فنی عظمت کا دامن ہمیشہ کے لئے طبیہ کالج سے باندہ دیا۔ درحقیقت دواخانہ کو جو ایک نفع بخش خاندانی کاروبار تھا مدرسہ کے لئے وقف کرکے حکیم صاحب نے صحیح ایثار اور خدمت کی ایک اعلیٰ مثال نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنی تمام قوم کے سامنے پیش کردی۔

۱۹۰۷ء کے جون اور جولائی کے مہینوں میں کثرت کار کی وجہ سے

حکیم صاحب کی صحت بہت گر گئی اور وہ عرصہ تک اپنی صحت کی خاطر کوئٹہ میں مقیم رہے۔ آخری سال کے چند ماہ زیادہ تر خیرپور اور فرید کوٹ میں بسلسلہ علاج گذرے۔ آخر دسمبر میں مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے کراچی تشریف لے گئے۔

ڈھاکہ میں جو بچہ پیدا ہوا تھا اُس نے کراچی میں کچھ ہاتھ پانوں مارنے شروع کئے۔ اس اجلاس کے صدر آدم جی پیر بھائی تھے۔ نواب وقار الملک نے لیگ کے قواعد و ضوابط کا ایک مسودہ پیش کیا جو دو دن کے بحث و مباحثہ کے بعد منظور ہوا۔ اُس وقت لیگ کے بنیادی مقاصد تین قرار پائے :-

یعنی (۱) حکومت سے وفاداری (۲) مسلمانوں کے پولٹیکل حقوق کی حفاظت اور اُن کو "اعتدال" کے ساتھ گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا اور (۳) ملک کے دوسرے فرقوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو ترقی دینا۔ مکتب سیاست میں لیگ کا یہ پہلا سبق تھا جس میں "وفاداری" اور "اعتدال" کی حدود احتیاط اور سختی کے ساتھ قائم تھیں! تاہم صدر اجلاس کے خطبہ صدارت میں بعض آوازیں ایسی بھی سنی گئیں جو ابھی تک مسلمانوں کے کانوں نے سنی نہ تھیں۔ صدر نے فرمایا کہ

"ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ واپس جانا اپنا بیدہ ہو جانے کے مرادف ہوگا اور ہم برطانوی حکومت میں حصہ پانے کے متعلق ناقابلیت کی مُہر اپنے اوپر لگا لیں گے۔"

مطالبہ حق کی یہ آواز جتنا زور مطالبہ حق پر دیتی تھی اتنا ہی فرقہ داری تفریق پر بھی۔ روئے سخن جتنا برطانوی حکومت کی طرف تھا اتنا

ہی ہندو قوم کی طرف تھا جس کے سیاسی حقوق سے مسلمان اپنا حصہ الگ لینا چاہتے تھے۔ "وفاداری" کے حلق سے "اعتدال" کے ساتھ یہ آواز جو نکلی وہ شاعر کے اس قول کے مصداق تھی کہ

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود!

پاکستان کا سنگ بنیاد ڈھاکہ اور کراچی ہی میں رکھا گیا گو کہ اُس کی حقیقت سے اُس وقت کے معمار شاید باخبر نہ تھے! تاہم اُن معماروں کے پیچھے جو طاقت کام کر رہی تھی وہ اپنے مقاصد کا رخ متعین کر چکی تھی!۔

دورِ ثانی

لارڈ کرزن کے جانشین لارڈ منٹو ایک طرف مسلمانوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے اور دوسری طرف کانگریس کی تحریک کو پوری قوت کے ساتھ کچلنا چاہتے تھے۔ پنجاب، مہاراشٹرا اور بنگال میں وہ اپنی حکومت کی پوری طاقت قوم پرستوں کے مقابلہ میں صرف کرنے لگے۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے قومی تحریک روکے جانے سے بہتے پانی کی طرح زیادہ قوی ہو جایا کرتی ہے۔ اخباروں کی آزادی کو نئے قوانین کے ذریعہ سے سلب کیا گیا، مادہ آتشگیر کے متعلق سخت قواعد بنا کر بنگال کی بم بازی کا انسداد کرنا چاہا گیا۔ قانون فوجداری میں ترمیم کی گئی اور اس طرح حکومت کے اسلحہ خانہ کے ہتھیاروں پر نئی دھار رکھی گئی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو "وفاداری" اور اعتدال کا سبق پڑھا کر قومی تحریک کے چڑھتے ہوئے دریا کی دھار کاٹی گئی۔

کراچی میں اجلاس مسلم لیگ سے حکیم صاحب فارغ ہی ہوئے تھے کہ سال نو کے اعزازات کی فہرست میں اُن کا خاندانی خطاب حاذق الملک اُن کو عطا کر کے گویا خاندان شریفی کی روایات وفاداری نیز حکیم صاحب کی ذاتی اعتدال پسندی پر مُہر خوشنودی ثبت کردی گئی۔ اُس وقت نہ تو حکومت کو معلوم تھا اور نہ خود حکیم صاحب کو کہ یہ دو حرفی اعزازات جو بہت انتظار کے بعد سرکار سے عطا ہوتے ہیں، جس قدر مشکل سے حاصل ہوتے ہیں اُسی قدر آسانی کے ساتھ واپس بھی کئے جاسکتے ہیں! کتنی محنت اور جانکاہی سے وفاداران سرکار آرزو کے اس پودے کو پانی دیتے ہیں اور کس طرح باد تند کا ایک

ہی جھونکا اعزازات کے اس چمنستان کو اجاڑ دیتا ہے! سرکاری صنم خانے کے طاقوں میں کس اہتمام کے ساتھ یہ بت بٹھائے جاتے ہیں اور کس طرح کسی بت شکن کے دو ہی نعروں میں سرنگوں ہو جاتے ہیں! ۱۹۰۸ء کی پہلی جنوری خاندان شریفی کے لئے یقیناً مسرت و شادمانی کا پیام لائی، ہر جگہ اس عزت افزائی کی خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے ہوئے، تہنیت کے ہزاروں پیامات آئے اور سب خوش تھے کہ پردادا کی وراثت پر پوتے نے پائی۔ اکمل خاں شاہی دربار کے حاذق الملک تھے اور عبدالمجید خاں سرکار انگریزی کے۔ اب اجمل خاں حاذق الملک ثانی قرار پائے۔ لارڈ منٹو کا زمانہ مسلمان نوازی کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب کی شخصیت سے بھی حکام متاثر ہوتے تھے۔ بہرحال حریت پرستی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے انہیں نوازشہائے سرکار کی اس منزل سے بھی گذرنا تھا!۔

۱۹۰۸ء کے ابتدائی مہینوں میں حکیم صاحب علاج کے سلسلہ میں مختلف ریاستوں کا سفر کرتے رہے اور مدرسہ طبیہ اور دواخانہ کے کاموں میں بھی بہت مصروف رہے۔ اس مصروفیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ جولائی کے مہینہ میں عارضہ قلب کا پھر ایک حملہ ہوا۔ اس علالت کی وجہ سے چند روز دہلی میں قیام فرمایا پھر بسلسلہ علاج جاورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳ ستمبر کو کانپور میں مدرسہ الٰہیات کا افتتاح فرمایا اور آخر دسمبر میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امرتسر تشریف لے گئے۔ لیگ کے پلیٹ فارم پر اب

قوم کے بہت سے کام کرنے والے با اثر اصحاب نظر آنے لگے تھے۔ یہ اجلاس اس وجہ سے بھی اہم تھا کہ ملک کی آئینی اصلاحات کے متعلق لارڈ منٹو اور وزیر ہند کا اعلان شائع ہو چکا تھا اور مسلمانوں میں قومی حقوق کے تحفظ کا عام چرچا ہو رہا تھا۔ خود حکومت نے انہیں یہ سبق پڑھایا تھا تاکہ وہ کانگریس کی تحریک سے جدا رہ کر اپنا رشتہ حکومت کے ساتھ اور زیادہ مضبوط کر لیں۔ سید علی امام، میاں محمد شفیع، نواب علی چودھری، مولانا محمد علی، مسٹر مظہر الحق اور مسلمانوں میں بہت سے اور اصحاب فکر سب اس سیڑھی پر چڑھ رہے تھے جو اس زمانہ میں اعلیٰ سرکاری مناصب تک پہنچا دیتی تھی۔ یا پھر اس منزل پر لے جاتی تھی جہاں مطالبہ حقوق کے ساتھ کچھ قربانیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اول الذکرتین اصحاب اسی سیڑھی پر چڑھ کر شملہ اور دارجیلنگ کی چوٹیوں تک پہنچے اور باقی نے جیل خانہ اور اشرم کے گوشہ تنہائی میں دم لیا۔ حکومت کی کوششوں کا یہ ایک منطقی نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں نے وفاداری اور اعتدال کی شرط کے ساتھ فرقہ وارانہ حقوق کا مطالبہ شروع کیا تو ساتھ ہی تقسیم بنگالہ کو بھی سراہا جس کی وجہ سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ اس طرح لیگ حکومت کی کمان کا تیر بن گئی!۔

حکیم صاحب کی حالت اب یہ تھی کہ وہ ایک طرف تو جداگانہ اور فرقہ واری پلیٹ فارم پر مسلم لیگ کے مطالبوں کی تائید کر رہے تھے اور دوسری طرف مدرسہ طبیہ کو طب یونانی اور ویدک کا ایک

مشترکہ ادارہ بنا رہے تھے تاکہ ہندو مسلمانوں میں فنی یک جہتی پیدا ہو۔ اس زمانہ میں اُن کا بڑا تعمیری کام مدرسہ طبیہ کی ترقی ہی میں مضمر تھا۔

مدرسہ طبیہ کا زنانہ شعبہ

ترقی طب کے سلسلہ میں اُن کے مقاصد کا ایک جزو یہ مقصد بھی تھا کہ قابل اور فن کی جاننے والی دائیاں تیار کی جائیں۔ اُن کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ ہندستان کی نئی نسلیں جن پر ہندستان کا مستقبل منحصر تھا کمزور اور ناتواں ہوتی ہیں۔ اُن کی مائیں زچگی کے مصائب برداشت کرکے اس قابل نہیں رہتیں کہ بچوں کی کما حقہٗ پرورش کر سکیں۔ زچگی کی خرابیاں تمام عمر اُن کی زندگی کو تلخ رکھتی ہیں۔ حکیم صاحب خوب سمجھتے تھے کہ اس مسئلہ کا قوم و ملک کی ترقی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ وہ بار بار اپنے ان خیالات کو اہل ملک کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ بالآخر اپنی ذاتی کوششوں سے ۴۰ ہزار روپیہ جمع کرکے اُنہوں نے جنوری ۹ ؁ میں لفٹنٹ گورنر پنجاب کی اہلیہ لیڈی ڈین سے اس شعبہ کا افتتاح کرایا۔ ابتداءً اس شعبہ میں محض فن قابلہ کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن بعد میں اُنہوں نے اس میں طب اور ویدک کی تعلیم کو بھی شامل کر دیا۔ اس افتتاح کے موقعہ پر حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ

"جس چیز کے لئے ہم زنانہ طالبات کو دعوت دیتے ہیں اور جو تعلیم ہم انہیں دینی چاہتے ہیں وہ ہمارے ملک کی شریف اقوام کے لئے بالکل اجنبی اور نئی بات

ہے۔ لیکن کوئی تعلیمی کام کامل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ
سوسائٹی کے نصف حصہ یعنی عورتوں کے ساتھ سچی
ہمدردی کا عنصر اُس میں شامل نہ ہو......"

سوسائٹی کے اس نصف حصہ کے متعلق حکیم صاحب کے خیالات بہت وسیع تھے باوجودیکہ اُن کا خاندان ابھی تک بہت قدامت پسند تھا۔ اِن اوراق میں جابجا ایسے واقعات آئیں گے جن سے ظاہر ہوگا کہ حکیم صاحب عورتوں کے مسئلہ میں اپنی نسل کے لوگوں سے بہت زیادہ وسیع الخیال تھے۔

دہلی میں پہلا اجلاس لیگ

حکیم صاحب کی سیاسی زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ مارچ ۱۹۰۹ء میں ریاست رام پور سے اُن کے تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ وہاں کی عہدہ داری اب تک اُن کے لئے ایک پابندی تھی اس لئے وہ بعض اوقات دوسرے قومی کاموں میں حائل ہوتی تھی۔ اب حکیم صاحب کو ریاست سے ایک وظیفہ بلاقید قیام ملنے لگا اور وہ وقتاً فوقتاً بغرض علاج وہاں جانے کے علاوہ زیادہ وقت دوسرے کاموں کو دینے کے قابل ہوگئے۔ چنانچہ رام پور سے آزاد ہوتے ہی اُنہوں نے اپنے کو مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں مصروف کرلیا اور نواب وقار الملک کو دعوت دی کہ لیگ کا آئندہ اجلاس دہلی میں منعقد کیا جائے۔

ہندستان میں یہ زمانہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ آئینی اصلاحات اور مطالبہ حقوق کی یہ پہلی زنجیر

تھی جس نے سنہ ۱۹ سے سنہ ۳۰ تک انقلاب کی بنیادیں قایم کیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کی وہ بنیادیں نصب کیں جن سے انگریزوں کے تدبر کو بہت کچھ کام لینا تھا۔ اس درمیانی زمانہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ لیگ کی زندگی کے دو ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ ایک وہ جو سنہ ۱۹۰۶ سے شروع ہوا اور سنہ ۱۹۱۸ تک ختم ہوگیا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد شروع ہوا اور بالآخر مسٹر جناح کی قیادت میں ملک کی تقسیم تک جاری رہا۔ پہلے دور میں جو مسلمان لیڈر لیگ کے پلیٹ فارم پر نظر آتے تھے ان میں سے آغا خاں، میاں محمد شفیع، حاجی موسیٰ خاں سید وزیر حسن اور آفتاب احمد خاں جیسے اصحاب ہیں کچھ کی تو زندگی ہی ختم ہوگئی اور کچھ اس میدان سے ہٹ گئے۔ اُس وقت کے نمایاں نوجوانوں میں مولانا محمد علی ہی ایک ایسے فرد تھے جو بعد کے دور میں بھی ایک دفعہ پھر لیگی سیاست کی طرف کسی قدر جھکے لیکن جناح کی قیادت کو پوری طرح تسلیم نہ کر سکے۔ حکیم صاحب پہلے دور کے ایک ہی قائد تھے جنھوں نے اُس دور کے آغاز سے انجام تک لیگ کا ساتھ دیا لیکن دوسرے دور کے شروع ہوتے ہی کانگریس کی جدوجہد میں شامل ہوگئے۔ اُن کے سیاسی خیالات کا ارتقا قدرتی اور منطقی تھا۔ فرقہ واری مطالبہ حقوق کا میدان اُن کے حوصلوں کے لئے تنگ ثابت ہوا اور وہ زمانہ کی ہر موج کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ سنہ ۱۹۰۹ کے آخری مہینے حکیم صاحب کی سخت مصروفیت کے مہینے تھے۔ خود وہ لیگ کی

مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ دہلی کے سنگم تھیٹر میں یہ اجتماع ہوا اور اُس زمانہ کے بڑے بڑے "بزرگانِ ملت" اس جلسہ کے پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے۔ آغا خاں پرنس آف ارکاٹ اور تمام دوسرے معتدلین کی صفوں سے لیگ کا اسٹیج آراستہ تھا۔ سانہ بھی وہی تھا اور اُس کے گیت بھی وہی تھے۔ "وفاداری" اور "اعتدال" کی قدریں بھی بدستور تھیں۔ البتہ حکیم صاحب نے خطبہ صدارت کے دبے دبے لفظوں میں اتنا ضرور فرمایا کہ

> کانگریس کی طرف سے سرسید کے اچھے خیالات نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ لینا کہ اُن کا منشا یہ تھا کہ ہم مسلمان ہمیشہ پالٹیکس سے جدا رہیں ایک غلطی ہے۔ اُنہوں نے خود ایک ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کی تھی۔ لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور ایسوسی ایشن مذکورہ کا کوئی چلانے والا باقی نہ رہا۔ اس اثنا میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد اور زیادہ ہوئی اور تمام ہندستان نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ ایسی صورت میں پولٹیکل زندگی سے علٰحدہ رہنے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کو سیاسی جمود ترک کرنے کی ہدایت کے ساتھ ہی ریفارم اسکیم اور انتخاب جداگانہ کے متعلق حکیم صاحب کی روش کم وبیش وہی تھی جو اس وقت مسلمانوں کے دوسرے لیڈروں کی تھی۔ البتہ ہندستان کی دوسری اقوام سے مسلمانوں کے تعلقات کے اصلاح کی ضرورت بھی اُن کے پیشِ نظر تھی۔

> اگرچہ حکام کی خوشنودی بفضلہ تعالیٰ (!) ہم کو حاصل ہے لیکن ہمسایہ اقوام سے ہمارے تعلقات میں بڑی اصلاح کی گنجائش باقی ہے۔

حکام کی "خوشنودی" کے ساتھ "بفضلہ تعالیٰ" کی مبارک شرط لیگ کی قیادت کا سکّہ رائج الوقت تھا، لیکن ہمسایہ اقوام سے تعلقات کی اصلاح اور "ہندو مسلمانوں میں یک جہتی پیدا ہونے کے نیک نتائج" کے ظہور میں آنے کی تمنا حکیم صاحب کے دل کا وہ گوشہ تھا جس میں قومی سیاست کا میدان بہت وسیع تھا۔ اسی گوشہ سے بعد کو قومی اتحاد کا وہ مقصدِ عظیم پیدا ہوا جس کے لئے حکیم صاحب نے اپنی بقیہ عمرِ عزیز کا ہر لمحہ صرف کر ڈالا۔ ۱۹۱۰ء کے اجمل خاں ۱۹۰۶ء میں اپنی ابتدائی منزل سے بہت دور نکل گئے تھے۔ فرقہ واری سیاست کی مشغولیت میں بھی اُن کے دل کے اندر سیاسی فرقہ پرستی کے خطرات کا ایک کانٹا تھا جو پہلے ہی کھٹک رہا تھا۔

مذہب کے متعلق اور خصوصاً اسلامی عقائد کے متعلق حکیم صاحب کی وسعتِ نظر نے فرقہ واری سیاست میں ان کی دلچسپیوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیا۔ اُن کے افکار کے اس پہلو کی وضاحت اُن کے اُس خطبہ سے ہوتی ہے جو اُسی زمانہ میں انہوں نے ندوۃ العلما کے اجلاس میں پڑھا۔

ندوۃ العلما

لیگ کے اجلاس کے دو ہی ماہ بعد ۲۶ مارچ کو دہلی میں ندوۃ العلما کا اجلاس منعقد ہوا۔ ندوۃ کی تحریک جو یکسر علمی اور مذہبی تھی ۱۸۹۴ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۰۸ء میں وہ ابتدائی

مدرسہ ایک دارالعلوم بن گیا۔ حکیم صاحب سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۲۵ء تک مسلسل
اس کے رکن رہے۔ دہلی میں ندوۃ کا یہ پہلا اجلاس تھا صدر اجلاس
خود حکیم صاحب منتخب ہوئے اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر خان بہادر
عبدالحامد صاحب مرحوم بنائے گئے۔ مولانا شبلی مغفور اور نواب
وقار الملک ان اجلاسوں میں شریک تھے۔ اس وقت ندوہ کے
متعلق اور عام طور پر اپنے مذہبی افکار میں حکیم صاحب کا مصلحانہ
نقطہ نظر جو کچھ تھا وہ ان کے خطبہ صدارت سے واضح ہوتا ہے۔ انہوں
نے دائرہ اسلام کے اندر ہر قسم کی فرقہ بندی کی سخت مذمت کی۔
فرمایا کہ

> میرا خیال ہے کہ ابتدائے اسلام سے غدر سنہ ۵۷ء تک
> جس قدر تکفیر کے فتوے لکھے گئے اگر انہیں ایک جلد میں
> جمع کیا جائے تو ہرگز اس جلد کی ضخامت اس جلد کی برابر
> نہ ہو سکے گی جو ۵۷ء سے لیکر آج تک کفر کے فتووں کی
> جمع کی جائے۔ یہ وبائے تکفیر صرف اشخاص ہی تک محدود
> نہ رہی بلکہ وہ ترقی کر کے گروہوں تک بھی متعدی ہو گئی
> .... اس تکفیر نے مسلمانوں میں ایسی منافرت
> پیدا کر دی جس سے ہمیں بے انتہا نقصانات پہنچے۔ لکھنؤ
> میں کئی مرتبہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان شرمناک
> قصے پیش آئے اور ادھر دہلی میں بھی مقلدین اور اہل حدیث
> نے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ دہلی لکھنؤ سے بازی
> لے گئی کہ یہاں صرف ولا الضالین اور آمین بالجہر پر

آپس کی رشتہ داریاں منقطع ہوگئیں۔ روپیہ عدالتوں میں
برباد ہوا اور سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کی
رسوائی ہوئی۔ یہ ہمارے خواص کی حالت تھی اور اسی
سے عوام کا اندازہ صحیح طور پر کیا جاسکتا ہے۔

اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو شدت کے ساتھ ندوہ کی تحریک پر اعتراض کر رہے تھے اور عوام کو دعوت دیتے ہوئے کہ وہ ندوہ کی حمایت کریں حکیم صاحب نے اسلامی علوم کے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح کے متعلق بھی مجلس کو مشورے دئے۔ اقتدار پسند اور پیشہ ور ملاؤں اور نام نہاد "علما" کی خود غرضیوں اور نفسانیت سے حکیم صاحب پوری طرح واقف تھے اور اپنی عمر کے کسی دور میں وہ اس فریب میں مبتلا نہ کئے جا سکے۔ ندوہ کی تحریک کو اُنہوں نے اسی لئے پسند کیا تھا کہ وہ ایک اصلاحی تحریک تھی۔ اپنے خطبہ میں حکیم صاحب نے اہل تصوف کی خوبیوں پر بہت زور دیا تھا اور اس طرح خود اُن کے مذہبی رجحانات کا پہلو اس خطبہ سے واضح ہوتا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ :۔

آپ تاریخوں میں اُن بزرگوں کے حالات پڑھیں
جو درحقیقت اساطین اسلام تھے۔ یہ اہل تصوف کا گروہ
تھا جس کا ہر ایک فرد آسمان اسلام پر آفتاب ہو کے
چمکا تھا......... اس گروہ کے اکثر بزرگوار علوم ظاہرہ
سے بھی ایسے ہی آراستہ ہوتے تھے جیسے کہ علوم باطنیہ
سے۔ کیا یہ بھی آپ کی طرح آپس کے فسادوں کو بھڑکاتا

کرتے تھے؟ حاشا وکلا۔ اُن کے خیال میں بھی ایسی باتیں
نہ گذرتی تھیں۔ اُس زمانہ کو چھوڑ کر اگر ہم موجودہ زمانہ
کو دیکھیں تو ہمیں اب بھی اُسی کان کے ایسے جواہر کہیں
کہیں ملیں گے جن کی ایک نگاہ دل کے امراض کے
لئے پیام شفا ہوتی ہے۔ اب آپ خود ہی خیال فرمائیں
کہ آپ میں اور اُن میں یہ فرق کیوں ہے۔ میرے ناقص
خیال میں اُس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے صرف سطحی درس
حاصل کیا ہے اور اُن کے دل نے اس مکتب دنیا میں
عمیق سبق لیا ....

یہ ایک پہلو حکیم صاحب کی مذہبی زندگی کا ہے اور اسی سے ہم اندازہ کرتے ہیں کہ اُن کی فرقہ داری سیاست بھی کسی مذہبی جذبہ اور تعصب پر مبنی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس خطبہ کی آخری سطور میں وفاداری اور حکومت کی تائید کرنے کا مشورہ بھی موجود تھا۔ زمانہ کے انقلابات کی قوت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ وہی اجمل خاں جو ۱۹۱۰ء میں علماء کو حکومت کی تائید کا مشورہ دے رہے تھے ۱۹۲۰ء میں جماعت علما کو قومی جنگ میں شریک ہو کر حکومت کا مقابلہ کرنے کی دعوت دینے لگے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکیم صاحب ہی وہ شخص تھے جنہوں نے جنگ آزادی میں علما کی جماعت کو شریک کرایا۔ آغاز کار وفاداری سرکار سے ہوا اور انجام تلقین بغاوت سے!۔ اس انقلاب میں بڑا حصہ خود حکومت کے طرز عمل کا تھا جس سے حکیم صاحب جیسے

صحیح احساس رکھنے والے صلح نہ کر سکتے تھے۔

پہلا قدم حکومت کے خلاف

جس زمانہ میں حکیم صاحب کا زیادہ وقت ندوۃ العلما کے اجلاس کی تیاریوں میں صرف ہو رہا تھا طبی دنیا میں ایک حادثہ پیش آیا جس کو حکیم صاحب نے صحیح طور پر طب یونانی کے لئے خطرہ کی گھنٹی سمجھا۔ شروع فروری میں بمبئی کے میڈیکل ایسوسی ایشن نے یہ تجویز پیش کی کہ دیسی طریقہ کے علاج و معالجہ پر قانونی پابندیاں عائد کی جائیں اور مطب کی اجازت دینے کے لئے ایک معیار قایم کیا جائے۔ حکومت جو ہمیشہ ملکی طب کو حقارت کی نظر سے دیکھتی رہی تھی اور طب مغربی کے مقابلہ میں طب یونانی اور ویدک کو نا قابل التفات سمجھا کرتی تھی میڈیکل ایسوسی ایشن کی تحریک کو قبول کرکے ایک رجسٹریشن ایکٹ بنانے پر آمادہ ہو گی۔ حکومت کے اس ارادہ کو معلوم کرکے حکیم صاحب کی نظروں میں اپنے فن کی موت کا نقشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے صحیح طور پر سمجھا کہ یہ وار طب یونانی کی تمام تحریک کا خاتمہ کر دینے کے لئے بالکل کافی ہوگا۔ مگر ابھی چور گھر کی دیوار کے پاس آیا ہی تھا کہ اجمل خاں کی آواز نے سارے گھر کو بیدار کر دیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ حکومت سے خوشگوار تعلقات کے باوجود حکیم صاحب نے پوری طرح اور شدت کے ساتھ حکومت کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ حکومت کے خلاف یہ شورش شروع کرکے حکیم صاحب نے گویا اُس میدان کی طرف رخ بدلا جہاں انہیں خدمت خلق اور اپنی قربانیوں کے جھنڈے گاڑنے تھے۔ اُسی زمانہ میں وہ کسی مریض کو دیکھنے بمبئی گئے اور وہاں پندرہ

دن تک ٹھہر کر اُنہوں نے اطبا اور ویدّوں کا ایک محاذ تیار کیا۔ ادہر مجلس قانون ساز میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے حکومت نے اپنی نیت پوری طرح ظاہر کر دی اور پھر مجوزہ ایکٹ کا جو مسودہ شائع کیا گیا اُس سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سوائے یورپ کے تعلیم یافتہ یا کسی یونیورسٹی کے سند یافتہ لوگوں کے کسی طبیب یا وید کا نام درج فہرست نہ ہو سکے گا اور نہ انہیں کسی مریض کو صداقت نامہ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ بمبئی، مدراس اور پنجاب کی حکومتوں نے بہت عجلت کے ساتھ اس تجویز کو منظور کر لیا خود ڈاکٹروں کی طرف سے طب یونانی کے ساتھ اس قدر تعصب برتا جانے لگا کہ مدراس کے ایک ڈاکٹر سے میڈیکل ایسوسی ایشن نے جواب طلب کیا کہ اُن کا نام کیوں نہ انجمن سے اس بنا پر خارج کر دیا جائے کہ وہ ایک ایورویدک دواخانہ کا انتظام کرتے ہیں۔ بعض دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ بھی جو ملکی طبوں سے دلچسپی رکھتے تھے یہی عمل روا رکھا گیا۔

گو کہ حکومت نے زبانی وعدوں اور تسلیوں سے حکیم صاحب کو مطمئن کرنا چاہا مگر وہ حکومت کی نیت کا پتہ پا گئے تھے اور انہوں نے مجلس قانون ساز میں آئینی جنگ شروع کرا دی۔ اوّل تو حکومت نے اِن مجالس میں طب قدیم کے متعلق توہین و تضحیک کا حربہ استعمال کرنا شروع کیا، لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو حکومت صاف کہنے لگی کہ وہ اس معاملہ میں کسی گفت و شنید کے لئے تیار نہیں۔ لیکن حکیم صاحب کی جد و جہد جاری رہی اور اب حکومت کو سکوت و خاموشی اور رد و انکار کے مورچہ سے ہٹنا پڑا۔ پھر وہ بھی ٹالتی رہی اور گو کہ وہ قانون

پر سختی کے ساتھ عمل کر کے اُس کے خلاف عوامی تحریک کو زیادہ مشتعل کرنے سے ڈرتی تھی لیکن اپنے قانون کو بھی منسوخ کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ حکیم صاحب ۱۹۲۰ء تک اس محاذ پر لڑتے رہے اور بالآخر انھوں نے ملکی طب کے خلاف حکومت کے مورچہ کو توڑ دیا۔ اس معاملہ کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ہم حکیم صاحب کی زندگی کے اُس دور کا ذکر ملتوی کر کے پہلے اسی داستان کو آخر تک ختم کئے دیتے ہیں۔

باوجودیکہ وقتاً فوقتاً مجالس قانون ساز میں ہندستانی اراکین کی تجاویز منظور ہوتی رہیں لیکن حکومت نے اُن پر عمل نہیں کیا۔ ۱۹۱۷ء میں مرکزی مجلس میں ایک تجویز پیش کی گئی۔ اُس کے جواب میں حکومت نے کہا کہ پہلے ملکی طبوں کی حقیقت اور نوعیت کی تحقیقات ہونی چاہئے چنانچہ ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا گیا جس نے یہ رائے پیش کر دی کہ کوئی ملکی طب سائینٹفک نہیں ہے۔ بمبئی کی کونسل میں بھی ایک تجویز پیش ہوئی لیکن اُس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کر کے معاملہ کو ٹال دیا گیا۔ مگر چند برسوں کی جد و جہد سے حکیم صاحب نے اس مسئلہ کے متعلق ملک میں اتنی بیداری پیدا کر دی تھی کہ جب انٹیگو چیمسفورڈ اسکیم اصلاحات نافذ ہوئی اور صیغہ طب مجالس قانون ساز کے حیطۂ اقتدار میں آیا تو حکومت کو عوامی مطالبہ کے سامنے اپنا سر نیچا کرنا پڑا۔ مدراس اور بہار میں طبی مدارس جاری کر دیئے گئے اور صوبجات متحدہ نے ایک بورڈ آف انڈین میڈیسنس مقرر کر دیا اور مسلم اور ہندو یونیورسٹیوں کو یونانی اور ویدک درسگاہوں کے اجراء کے لئے رقمی امداد دینا منظور کی گئی۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور

میونسپل بورڈوں نے بھی طبیبوں اور ویدوں کا تقرر کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح حکیم صاحب کی یہ تحریک کامیابی کی منزل تک پہنچی۔ حکومت کے خلاف آئینی شورش کے میدان میں حکیم صاحب کا یہ پہلا مؤثر قدم تھا۔

انجمن طبیہ

۱۰ء میں جب ملکی طبوں کے متعلق حکومت کا رخ ظاہر ہونے لگا تھا تو حکیم صاحب کو بھی یہ فکر ہوئی کہ اطبا میں ایک مضبوط تنظیم پیدا کر دیں تاکہ وہ منظم طریقہ سے طب کے خلاف حکومت کے حملوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آخر اگست سے اکتوبر تک حکیم صاحب بیگم صاحبہ رام پور کے علاج کے سلسلہ میں نینی تال پر مقیم تھے، اُس کے بعد رام پور آ گئے۔ اس زمانہ میں لارڈ منٹو بھی رام پور آئے۔ حکیم صاحب ریاست کی ایسی صحبتوں سے جہاں "لاٹ" اور "لارڈ" قسم کے لوگ جلوہ فرما ہوا کرتے ہیں اکثر علیحدہ رہا کرتے تھے بلکہ بعد میں تو وہ ایسے مواقع پر رام پور سے چلے آیا کرتے تھے۔ اس دوران میں جب وہ دہلی سے باہر رہے اُن کے خاص خاص احباب اور خصوصاً اُن کے بھانجے حکیم غلام کبریا خاں انجمن طبیہ کی تنظیم میں مصروف رہے۔ اس انجمن کی تحریک پر اطبا کی پہلی کانفرنس نومبر ۱۰ء میں منعقد ہوئی جس میں تقریباً تین سو اطبا اور وید شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں طب اور ویدک کی اصلاح اور ترقی پر زور دیتے ہوئے بہت سے اعتراضات کا بھی جواب دیا جو قدیم طبوں پر کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جن امور پر بہت زیادہ زور دیا وہ حسب ذیل تھے :-

اوّل یہ کہ بحیثیت ایک علم و فن کے طب یونانی کسی دوسری طب سے کم درجہ پر نہیں ہے حتیٰ کہ علم جراحی پر بھی قدیم اطبا کو عبور حاصل تھا۔ وہ تمام جزئیات پر حاوی ہوتے تھے، لیکن اب چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے طب یونانی زوال پذیر ہے۔

دوئم یہ کہ ایسی مکمل درس گاہوں کی ضرورت ہے جن میں تشریح دوا سازی، جراحی ہر چیز کی تعلیم حاصل کی جا سکے حکیم صاحب شروع ہی سے اس امر پر زور دیتے رہے کہ طب یونانی کو جدید طب کی تحقیقاتوں سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور مغربی طب کے جدید شعبوں کی تعلیم اطبا کو بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ اس مسئلہ میں لکھنؤ کے اطبا کو اُن کی رائے سے اختلاف تھا اور بعض اوقات یہ اختلاف بہت غیر خوشگوار صورتیں اختیار کر لیتا تھا، لیکن حکیم صاحب ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ اس معاملہ میں لکھنؤ اور دہلی دوش بدوش کام کریں۔ اس کانفرنس میں بھی لکھنؤ کے حکیم عبدالعزیز صاحب کو شریک ہونے پر آمادہ کر لینا حکیم صاحب ہی کا کام تھا۔

کانفرنس کے موقعہ پر دوا خانہ یونانی کی عمارت کا بھی افتتاح ہوا۔ اور اب اپنی طبی تحریک کے متعلق حکیم صاحب کا ذہنی نقشہ تقریباً مکمل ہو گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کی پہلی آواز

اسی سال دسمبر میں مسلم لیگ کے اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حکیم صاحب اکثر ریاست رام پور سے اپنے تعلقات کو قومی کاموں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا کرتے تھے۔ اُن کی شخصیت قومی تحریکوں کی طرف

رئیس رام پور کے دست کرم کے دراز ہونے کا بڑا سبب ہوتی تھی۔ علی گڑھ، کالج، ندوۃ، مسلم لیگ، سب ہی رام پور کے خزانے سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہ زمانہ بھی وہ تھا کہ قومی تحریکوں میں رئیسوں اور سرمایہ داروں سے امداد حاصل کرنا کوئی بُری بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ رام پور کی حد تک تو صورت یہ تھی کہ اکثر دینے والا ہاتھ تو نواب حامد علی خاں کا ہوتا تھا لیکن دلوانے والے اجمل خاں ہوتے تھے۔ لیگ کے سکرٹری مولوی عزیز مرزا کے نام حکیم صاحب کا ایک خط اور مولوی عزیز مرزا کا ایک معروضہ نواب صاحب رام پور کے نام جو حکیم صاحب کے کاغذات میں موجود تھا ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

لیکن اس دفعہ رام پور میں کامیابی نہ ہوئی اور اس بنا پر کہ لیگ ایک سیاسی جماعت ہے ریاست نے اس کام کے لئے روپیہ دینے سے احتراز کیا۔ باوجودیکہ مولوی عزیز مرزا نے اپنے معروضہ میں لیگ کی وفاداری اور سرکار پرستی کا اعلان کرنے میں کوئی کمی نہ کی تھی لیکن اُس زمانہ میں سرکار انگریزی اور ہندستانی ریاستوں کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ سیاست کی پرچھائیں سے بھی والیانِ ریاست کی قبائے وفاداری پر دھبہ آجانے کا اندیشہ لاحق رہا کرتا تھا۔

بہرحال ناگپور میں لیگ کا اجلاس زیر صدارت سید نبی اللہ مرحوم منعقد ہوا۔ صدر کا خطبہ وفاداری، عرض نیاز، نئے ویسرائے لارڈ ہارڈنگ کے خیر مقدم، اور حقوق جداگانہ کے مطالبہ سے حسب دستور گرانبار تھا۔ لیکن اُس میں ایک پہلو قدیم رسم و راہ وفاداری سے کچھ

الگ الگ بھی نظر آتا تھا سید نبی اللہ مرحوم نے ہندستان کے باہر کی دنیا کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ اب سیاست سے علیحدہ رہنے کے متعلق سر سید کا مسلک قابل عمل نہیں رہا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ

"اُس وقت سے جبکہ سر سید نے ہم کو سیاست سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کی تھی اِس وقت تک دریاؤں کے پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہ چکا ہے اور مشرق خوابیدہ کو نہایت اہم واقعات نے جگا دیا ہے۔ جاپان نے اپنے سیاسی ارتقا اور مغربی نظم حکومت اختیار کرنے کی وجہ سے بیس برس کے اندر قومی زندگی کے تمام شعبوں میں عجیب و غریب ترقی کی ہے جس کے بعد اُس نے روس پر عظیم الشان فتح حاصل کی اور مشرقی اقوام کی آنکھیں کھول دیں۔ جاپان کی فتح نے مشرق میں روس کی طاقت کو کچل ڈالا اور جو بیداری مشرق میں پیدا ہوئی اُس سے مختلف سیاسی اصول رکھنے والے ملکوں میں جیسے کہ ہندستان، چین، مصر، ایران اور ترکی میں نیابتی طرز حکومت کا مطالبہ پیدا کر دیا ...... بیچینی کا ایک سخت جھٹکا مشرق کی رگ وپے میں گذر گیا ہے ......"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات میں غیر مشروط وفاداری کے خلاف بھی کوئی عنصر ہے جو نہایت احتیاط کے ساتھ متحرک ہونے کی کوشش شروع کر رہا ہے! صدر نے اپنا خطبہ ان الفاظ پر ختم کیا تھا:

"ایک روشن مستقبل ہماری نظروں کے سامنے بے نقاب

ہوتا جاتا ہے اس مستقبل میں ہم اگر اپنے اور اپنے ملک کے
ساتھ سچے رہیں تو ہم بہت نمایاں حصہ لینے والے ہیں۔"

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وقت وہ تھا جب اسلامی ممالک میں ایک ہلچل شروع ہو گئی تھی اور اس کا اصلی سبب یورپ کی سامراجی قوتوں کی زبردستیاں تھیں۔ ترکی میں ایک انقلاب آچکا تھا اور دوسرے کی تیاری ہو رہی تھی، ایران میں "دستور" کے نام سے لوگ آشنا ہو گئے تھے اور شاہی کا اقتدار تنزل کی منزلیں طے کرنے لگا تھا۔ مصر بھی بےچین تھا اور ان تمام واقعات کا کچھ نہ کچھ اثر ہندستان کی آبادی تک بھی پہنچ رہا تھا۔ ۱۱ء کا یہ آغاز بعد میں تمام دنیا کے ایک انقلاب عظیم کا نشان راہ بن گیا۔ ہندستان کے مسلمانوں کی رگوں میں بھی خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

لکھنؤ اور دہلی کا قضیہ

باوجود حکیم صاحب کی صلح جوئی کے لکھنؤ اور دہلی کا قضیہ بڑھتا رہا اور جب یہ طے ہوا کہ طبی کانفرنس کا آئندہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو تو قدامت پسند اطبا کے بعض گوشوں میں شدید مخالفت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خود حکیم صاحب اس غرض سے لکھنؤ گئے کہ اس فتنہ کو دبائیں لیکن انہیں بھی کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس قضیہ کی کچھ تفصیل ہم اخبار مشرق کی ایک اشاعت سے نقل کرتے ہیں۔ اخبار مذکور نے اس زمانہ میں لکھا تھا کہ

حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب کئی مہینے ہوئے اس
امر کی تحریک کے لئے لکھنؤ آئے تھے۔ اس وقت حکیم عبدالعزیز
صاحب کے لڑکوں نے اس سے اختلاف کیا تھا۔

پھر جب طبی کانفرنس کے سکرٹری لکھنؤ گئے اور حکیم عبدالعزیز صاحب سے ملے تو

"انہوں نے بھی اختلاف کیا اور جو عذرات پیش کئے گئے وہ یہ تھے کہ کانفرنس مذکور میں دہلی کا اثر غالب ہے اور اس میں شریک ہونا اطبائے لکھنؤ کی سبکی کا موجب ہوگا اور اُن کی وقعت گھٹ جائے گی اور دوسرے یہ کہ ویدک اور طب کے ملانے سے طب کو تنزل ہو جائے گا اور ویدک ترقی کریگی، مگر دوسری طرف حکیم حافظ عبدالولی صاحب کی رائے یہ تھی کہ کانفرنس کا لکھنؤ میں ہونا ضروری ہے اور چونکہ یہ آل انڈیا طبی کانفرنس ہے اس لئے اُس میں کوئی مقامی خصوصیت نہیں...... اس بارہ خاص میں حکیم عبدالولی صاحب اور حکیم عبدالعزیز صاحب سے بحث بھی ہوئی مگر کوئی صورت اتفاق پیدا نہ ہوسکی۔

اس سلسلہ میں دونوں طرف جلسے منعقد ہونے لگے جن میں بے لطفی بڑھتی گئی حتیٰ کہ قیصر باغ کے ایک جلسہ میں بہت کچھ ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لکھنؤ اور دہلی کے شعرا کی قدیم چشمک اور مشاعروں کے ہنگاموں سے تو لوگ خوب واقف تھے لیکن طب اور ویدک کے سنجیدہ مسئلہ میں اطبا کی یہ جنگ سنجیدہ اصحاب کی نظر میں بہت ہی معیوب تھی۔ اگر اجمل خاں کی شخصیت ادنیٰ ذاتی اغراض اور تعصبات سے بالاتر نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ طبیہ کانفرنس کے اس اجلاس میں لکھنؤ اور دہلی کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو جاتے جو طبی تحریک کی روح نکال

لیتے۔ لیکن حکیم صاحب کے کاندھے بہت چوڑے تھے اور وہ دوسروں کی ہر قسم کی انسانی کمزوریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکتے تھے۔ اُنہوں نے بہ اسلوب شائستہ اس بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا۔ اسی زمانہ میں وہ انگلستان تشریف لے گئے اس لئے لکھنؤ اور دہلی کے ان اختلافات کے مٹانے کی کچھ عرصہ تک کوئی کوشش نہ کرسکے اُن کی واپسی کے بعد ۱۲۔ ۱۳ اور ۱۴ نومبر کو کانفرنس کے یہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ بعض لکھنوی اطبا نے اپنے کو اس تحریک سے الگ رکھا۔ تاہم اجلاس کامیاب ہوئے اور بڑی حد تک حکیم صاحب نے اپنی طبی تحریک کے اثرات کو لکھنؤ میں بھی قایم کردیا۔ اس قضیہ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ لکھنؤ کے بعض وید صاحبان یہ سمجھتے تھے کہ طب یونانی کے ساتھ ایک ہی تحریک میں شریک ہونا اُن کے فن کے لئے مضر ہوگا۔ حکیم صاحب نے ان اصحاب کو اپنی ایک تقریر میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ملکی معاملہ ہو یا قومی یا دینی، جو معاملہ جس قدر زیادہ اہم ہوتا ہے اتنا ہی اُس کو اختلاف سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اب طبی کانفرنس بھی اس موروثی حصہ سے محروم نہ رہی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ طبیب اور وید صاحبان علیحدہ علیحدہ اپنا کام کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ترقی کی اُمنگ ایک انسانی خاصہ ہے لہذا طبعی طور پر یہ بات بھی ہونی چاہیئے تھی مگر کانفرنس کی غرض یہ ہے کہ طبیب اور وید صاحبان بیدار ہوجائیں اور کام کریں میں چاہتا ہوں کہ

جو کام ہو قرینہ اور قاعدے سے ہو جس کے لئے میں قتاً
اور واقعات زمانہ پر آپ کو توجہ دلاؤں گا۔ وہ یہ
کہ دنیاوی زندگی کی بقا کے لئے اُس کے ہر ہر عضو کی
اصلی حرارت کا قایم رہنا ضروری ہے اور بقا ہر حال
میں ایک دوسرے کی مدد پر موقوف ہے۔ اگر معدہ غذا
ہضم نہ کرے اور جگر کو یہ کہہ کر چھوڑ دے کہ مجھ کو جگر و
قلب سے کیا واسطہ ہے جو اُن کے لئے محنت کروں
تو وہ دن قریب ہوگا کہ معدہ اپنے فعل سے بیکار ہو جائیگا
اور اپنی غلطی پر افسوس کرے گا۔ آپ یقین کریں کہ ایسے
بڑے کام خاص کر جو ملک سے واسطہ رکھتے ہوں ناممکن
ہے کہ آپ اُن کو بغیر متفقہ جماعت کے چلا سکیں۔ کانگریس
اور لیگ بڑی جماعتیں ہیں جو کروڑوں کی قایم مقام ہیں۔
تمام وہ کام جن میں اتفاق ہے برابر چل رہے ہیں۔ اسی
طرح آپ بھی اپنی کانفرنس میں متفقہ طور پر کام کریں اور
مسلسل کام کرتے رہیں۔ برس دو برس میں ضرور آپ کی
محنتوں کا نتیجہ نکلے گا.............

پھر اپنے ایک مضمون میں جو حکیم صاحب نے کانفرنس میں پڑھا اُنھوں نے طب و ویدک کے قدیم علوم کی موجودہ خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ

اگر کوئی کم بیں شخص یہ دعوے کرے کہ ہمارا فن مکمل ہے
اور ہمیں اُس میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں تو یقین
کر لینا چاہیے کہ وہ طب اور ویدک کو نہیں جانتا یا حق

بات کہنے سے ڈرتا ہے۔ علوم کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ اور صحیح کہا گیا ہے کہ وہ ایک حد پر نہیں ٹھہرتے بلکہ تزائد افکار کے ساتھ ان میں روزمرہ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ پھر یہ خیال میں نہیں آتا کہ طب یا ویدک کیونکر اس کلیہ سے مستثنےٰ ہو سکتی ہے حالانکہ ان کے اکثر مسائل کا انحصار استقرار پر ہے اور ہزار نہیں بلکہ لاکھوں جزئیات ایسے ہیں جن سے بطون کتب اب تک خالی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ ان علوم میں ترقی کی گنجائش نہیں کس قدر واقعہ سے ہٹا ہوا اور انصاف سے دُور خیال ہے۔ اگر ہمارے اسلاف بھی اس مہلک غلطی میں مبتلا ہوتے تو ہمارے ہاتھ میں ویدک اور طب اس درجہ تکمیل شدہ حالت میں نہ پہنچتی۔۔۔۔۔۔۔۔

مخالفین کانفرنس کو مخاطب کر کے حکیم صاحب نے صرف اتنا ہی کہا کہ

گو کانفرنس کی مخالفت مختلف حیثیتوں سے کی جا رہی ہے لیکن ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہیئے اور اس مخالفت سے مفید سبق (اگر مل سکیں) حاصل کرنے چاہئیں۔ واقعی بعض مخالف احباب اور اعزہ نے اپنا قیمتی وقت اس مخالفت میں صرف کیا ہے اور ایک حد تک ذاتی روپیہ کے صرف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ ایسی حالت میں سخت ناانصافی ہو گی اگر ہم اُن حضرات کے شکرگزار اور ممنون نہ ہوں۔ کیا یہ بات کانفرنس کے حق میں بہتر نہیں ہوئی کہ محض اس مخالفت کے طفیل میں اُس کے ساتھ

لوگوں کی دلچسپیاں زیادہ ہوگئیں اور اُس کی شہرت کی
رفتار ایک ہی سال میں چار برس کے برابر ہوگئی۔

مخالفتوں کے متعلق اجمل خاں کے مزاج کا یہ خاص انداز تھا کہ وہ سخت سے سخت اختلاف کے حالت میں بھی جو چند لفظ بمشکل لکھتے یا کہتے تھے تو وہ بھی نہایت سنجیدہ اور ہر قسم کی تلخی سے پاک ہوا کرتے تھے۔

کانفرنس کا کامیاب انعقاد تو حکیم صاحب کے انگلستان آنے کے بعد ہوا لیکن اس روئداد کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے ہم درمیانی واقعات کو نظر انداز کر کے پہلے اس قصہ کو ختم کر دیتے ہیں۔ اب آغاز سال کی طرف لوٹ کر ہم دیکھتے ہیں کہ خود دہلی میں بھی حکیم صاحب کی مخالفت کا ایک محاذ موجود تھا جس کا نقیب اخبار کرزن گزٹ تھا جو ہر موقعہ پر نیش زنی کرتا رہتا تھا۔ یہی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک بھی جاری تھی اور آغا خاں اس جد و جہد میں نمایاں حصہ لے رہے تھے چنانچہ ایک وفد دہلی بھی آیا اور ۵ مارچ کو دہلی کے ٹاؤن ہال میں حکیم صاحب نے ایک عام جلسہ کا انتظام کیا جس میں نواب وقار الملک بھی موجود تھے جلسہ کی پوری کامیابی میں جو چیز حائل رہی وہ حکیم صاحب سے وقار الملک کے اختلافات تھے۔

پہلا سفر یورپ

ماہ مئی میں حکیم صاحب نے جب سفر یورپ کا ارادہ کیا تو کرزن گزٹ نے بہت عامیانہ طریقہ سے اُن کے اس ارادہ کا مذاق اُڑایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ حکیم صاحب محض سیر کرنے کے لئے نواب صاحب رامپور کے ہمراہ یورپ جا رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں حکیم صاحب نے اخبار مشرق میں اپنے سفر کے متعلق

اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں اُنہوں نے بتایا کہ علاوہ اس مقصد کے کہ صحت کے لئے تبدیل آب و ہوا اور آرام لینے کا یہ موقعہ حاصل کیا جائے اس سفر کا خاص مقصد یہ تھا کہ انگلستان اور دیگر ممالک میں طبی ترقیوں کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اُس مطالعہ کی روشنی میں ہندستان کی ملکی طبوں کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے مقابلہ میں سیر و سیاحت اور ذاتی صحت کا سوال محض ضمنی تھا۔

اس سفر کا مختصر حال خود اُن کے قلم سے بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ اپنے سفر کے متعلق حکیم صاحب نے طبیہ کانفرنس میں جو مضمون پڑھا اُس میں اُنہوں نے فن طب کی جو ترقیاں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسٹریا میں دیکھیں اُن کا ایک خلاصہ بیان فرمایا جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجود یورپین زبانوں سے ناواقفیت کے اُنہوں نے کس قدر گہری نظر سے کام کی باتیں دیکھیں اور اپنی طب کے فائدہ کے لئے گرہ میں باندھیں۔ انہوں نے انگلستان، فرانس اور اسٹریا کے تمام بڑے بڑے شفا خانے اور طبی کارخانے دیکھے اور مشہور ماہرین طب سے ملاقاتیں کیں اور اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا کہ

مجھے وقت ملا تو میں کبھی اُن تمام چیزوں کو جو یورپ کی طبی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور جنہیں میں نے دیکھا ہے جداگانہ تفصیل کے ساتھ لکھوں گا لیکن میں نے محض اجمالی طور پر یہاں اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ ہم جدوجہد اور اس کے اچھے نتائج سے سبق لیکر خود بھی سعی کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ اُس کے بہتر نتائج چند برسوں کے بعد ہندستان

کی فضا میں متحرک نظر آنے لگیں۔

اُس زمانہ میں مجلہ طبیہ نے لکھا تھا کہ حکیم صاحب وہ پہلے شخص ہیں جن کو یورپ کی سرزمین پر ایشیا کی قدیم طبوں کی زندگی کے لئے لوگوں نے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ پہلے ہندستانی ہیں جن کا بحیثیت اس کے کہ وہ ہندستان کے طبیب اعظم ہیں یورپ میں جا بجا خیر مقدم ہوا اور انہوں نے نہ صرف رسمی ملاقاتوں بلکہ طبی مشوروں سے جا بجا یورپ والوں پر طب اسلامی اور طب ویدک کی قدر و قیمت کا حال آئینہ کر دیا۔ وہ پہلے فاضل طبیب ہندستان ہیں جن کو یورپ میں اتنی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

اس سفر کا حکیم صاحب کی صحت پر بہت اچھا اثر ہوا۔ ایک خاص واقعہ یہ قابل ذکر ہے کہ دورانِ قیام لندن میں اُنھوں نے اپنی آیندہ سیاسی زندگی کے دو بہت ہی عزیز دوست پیدا کئے جو دم آخر تک اُن کے ہمدم و ہمنوا رہے۔ جو محبتیں آیندہ سیاسی ہنگاموں کے گرم و سرد میں اُن کی ہمدم و دمساز ہونے والی تھیں ان میں سے دو کا آغاز لندن میں ہوا۔ جب وہ پہلی دفعہ لندن کا چیرنگ کراس ہاسپٹل دیکھنے گئے تو اُن کی پہلی ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو اُس وقت اس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔ کون جانتا تھا کہ یہ سرسری ملاقات آیندہ ایک سچی دوستی اور خالص محبت میں منتقل ہو کر تاریخ ہندستان کے صفحات پر لکھی جائے گی۔ اُس وقت خود حکیم

صاحب تو کم و بیش سرکارِ انگریزی کی وفاداری کے حلقہ میں تھے اور ڈاکٹر انصاری اپنے فن کے علاوہ دنیا کی تمام دوسری چیزوں سے بے تعلق تھے۔ ایک یکسر مشرقی علم و فن اور تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور دوسرا مغرب کی آب و ہوا میں تربیت پاکر مغربی علوم و معاشرت کا دلدادہ تھا۔ اُس وقت ایک کی نظر ایک شاندار ماضی کی پرچھائیوں پر تھی اور دوسرا مغربی علوم کی روشنی میں ایک نئے مستقبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی ہندستان کے سیاسی مستقبل کی صحیح تصویر دونوں کے تصور سے دور تھی۔ اس حالت میں یہ دو بظاہر متضاد ہستیاں پہلی دفعہ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ چیرنگ کراس ہسپتال ہی میں طب مشرقی کے امتحان کا ایک سخت موقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کو خود ڈاکٹر انصاری کی زبان سے سن لیجئے :-

حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا بوساطت ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیر و سیاحت لندن تشریف لے گئے تھے۔ اُن کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چیرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ بہت چھان بین اور ہر شعبہ کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔ سب سے پہلی چیز جو اُن کے متعلق مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ اُن کی نگاہ نہایت نکتہ سنج اور عمیق تھی اور ہر بنیادی اور فروعی چیز پر وہ واقفیت حاصل کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ہسپتال کے

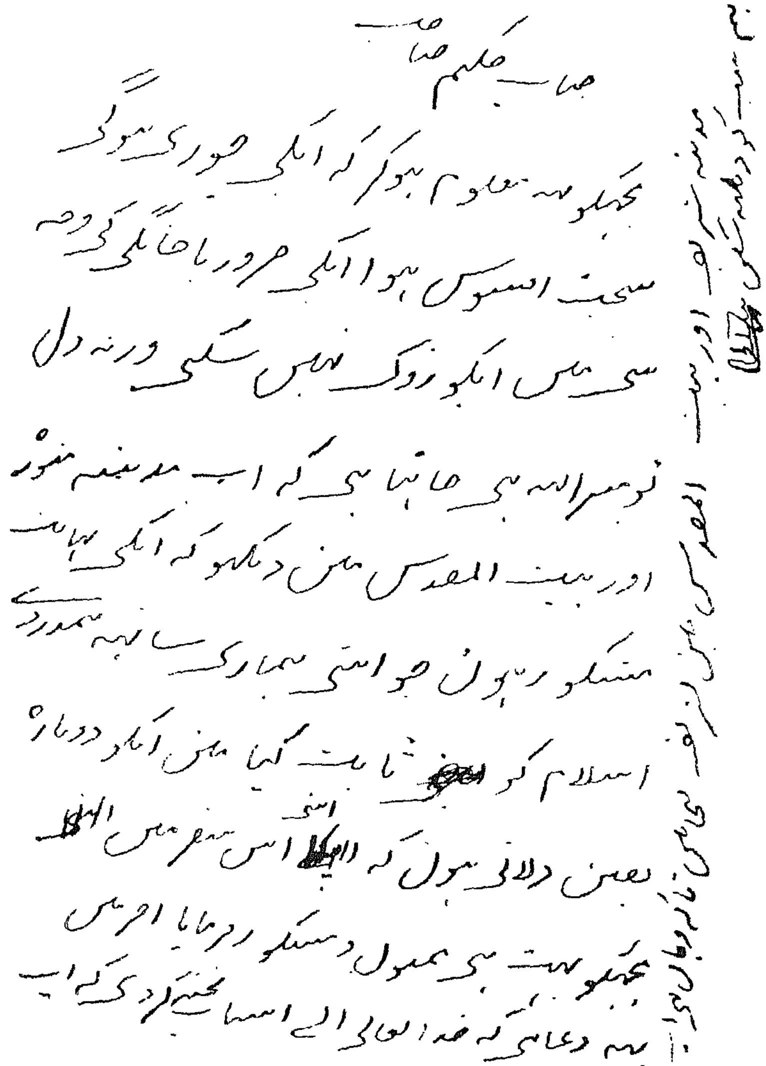
ہر شعبہ کو انہوں نے اُسی طریقہ پر ملاحظہ کیا۔ ڈاکٹر اسٹینلے
بائیڈ چیرنگ کراس کے مشہور اور سینئر سرجن تھے۔ اور بادشاہ
کے بھی وہ آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور فن
سرجری میں لندن میں یہ مسلم استاد سمجھے جاتے تھے۔ میں
اُن ہی کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے اُن کی ملاقات
میں نے کرائی۔ انہوں نے حکیم صاحب کو ایک روز ہسپتال
میں اپنے کلینیکل سرجری کلاس میں جو کہ ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ
کو چیرنگ کراس ہسپتال کے کسی ایک وارڈ میں طلبا کو عملی
تعلیم دینے کے لئے ہوا کرتے تھے دعوت دی۔ ایک مریض
کے مرض کے متعلق مسٹر بائیڈ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔
حکیم صاحب سے بھی انہوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص
کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص
کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصہ میں کہنہ زخم ہے
جس کے باعث درد کی تکلیف یرقان اور حرارت تھی۔ ڈاکٹر
بائیڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ انہوں نے
حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز
صبح کو اُس مریض کے اپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر
کہا کہ یہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے۔
اپریشن سے پتہ چل جائے گا کہ کونسی طب صحیح ہے۔ مجھ کو
کسی قدر اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دیسی طب
کی بے عزتی ہو جائے۔ اپریشن کے وقت میں کسی قدر تشویش

میں تھا لیکن شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح
نکلی اور ڈاکٹر بائیڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی
کے ساتھ حکیم صاحب کو اُن کی کامیابی پر مبارکباد دی
حکیم صاحب کو اور مجھ کو اپنے گھر پہ ڈنر کے لئے اور اس
کے بعد اُن کے ہمراہ تھیٹر جانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر بائیڈ
کی بیوی لندن کے مشہور زنانہ ہسپتال کی سینیر سرجن تھیں۔
اُن سے حکیم صاحب کا تعارف کراتے وقت بائیڈ نے
کہا کہ ڈاکٹر انصاری کے جن ہموطن پہلوان نے مجھے سرجیکل
کشتی میں شکست دی ہے وہ یہ صاحب ہیں۔ حکیم صاحب
پر اور مجھ پر بائیڈ کی اس علم شناسی قدردانی اعلیٰ حوصلگی
اور خوش خلقی کا بہت اثر ہوا۔"

دوسرے صاحب جو آئندہ زندگی میں حکیم صاحب کے عزیز دوست بننے والے تھے عبدالمجید خواجہ صاحب تھے جن سے لندن میں حکیم صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ حکیم صاحب کے سفر کے حالات خواجہ صاحب ہی کے ذریعہ سے اُس زمانہ کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ قیام لندن میں خواجہ صاحب اور حکیم صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن وہ ملاقاتیں اُس وقت تو ایسی ہی ہونگی جیسے ایک معزز اور ممتاز ہموطن سے کوئی نوجوان طالبعلم شرف نیاز حاصل کرتا ہے۔ یہ تو قضا و قدر ہی کو معلوم ہوگا کہ کسی دن علی گڑھ کا یہ حوصلہ مند نوجوان شریف منزل کی صحبتوں میں اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے ہنگاموں میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

کی تحریک میں اجمل خاں کے عزیز ترین شرکاء کار میں سے ایک ہوگا۔ جن لوگوں نے حکیم صاحب کو عبدالمجید خواجہ سے گلے ملتے اور ہنستے بولتے دیکھا ہے وہی بتا سکتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان رابطہ محبت کس قدر گہرا اور استوار تھا۔ اپنے سیاسی مستقبل کے لئے حکیم صاحب نے یہ دو بڑے دوست لندن میں پیدا کئے۔

ممالک یورپ کے سفر سے واپس ہوتے ہوئے حکیم صاحب قسطنطنیہ تشریف لے گئے۔ اُسی زمانہ میں بیگم صاحبہ بھوپال (نواب سلطان جہاں بیگم) بھی یورپ کے سفر سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ تشریف لائی تھیں۔ اس مقام پر حکیم صاحب اور بیگم صاحبہ کا کچھ عرصہ ساتھ رہا۔ ارادہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کے بعد عراق و شام و عرب کا سفر ہوگا لیکن دفعتاً دہلی سے ایک تار پہونچا کہ حکیم صاحب کے یہاں چوری ہو گئی ہے اور اس خبر کے ملتے ہی اُنھوں نے براہ راست ہندستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس واقعہ کے متعلق حکیم صاحب کے کاغذات میں بیگم صاحبہ کے قلم کا ایک مکتوب بھی ملا ہے جس کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔


جناب حکیم صاحب
مجھکو یہ معلوم ہوکر کہ آپکی حضوری ہوگئی
بہت افسوس ہوا آپکی ضرور یا خانگی کی وجہ
سے میں آپکو روک نہیں سکتی ورنہ دل
تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اب مدینہ منورہ
اور بیت المقدس میں دیکھو کہ آپکی ہدایت
مسلمانوں رہوں جو اسی مبارک سال یہ ہمدردی کے
اسلام کو ثابت کیا میں آپکو دوبارہ
یقین دلاتی ہوں کہ اس سفر میں
مجھکو بہت ہی ملول و مسکو رہ رہا اور میں
یہ دعا ہے کہ خدا تعالی اسباب مہیا کرے کہ آپ

عکس تحریر بیگم صاحبہ بھوپال

عراق و عرب و شام و مصر کے سفر کو ملتوی کر کے حکیم صاحب ۱۵ اگست میں دہلی واپس پہنچ گئے۔

جنگ طرابلس

ہندستان واپس آنے کے بعد جب حکیم صاحب طبیہ کانفرنس اور مسلم لیگ کے کاموں میں مشغول تھے تو دنیائے اسلام اور یورپ میں ایک نئے انقلاب عظیم کا دروازہ کھلتا جا رہا تھا۔ اٹلی نے بلا شبہ دوسری دول کے مشورے سے طرابلس کے ساحل پر اپنی فوجیں اتار دی تھیں اور ٹرکی کو اعلانِ جنگ دیدیا تھا۔ برطانیہ عظمےٰ نے "غیر جنبہ داری" کا ایک ایسا آسان راستہ اختیار کیا تھا جو "جنبہ داری" سے بھی بہت قریب تھا! "مریض" ٹرکی جاں بلب تھا اور یورپ میں یہ مشورے ہو رہے تھے کہ اس مریض کی ہڈیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ پہلے ہی سے اپنے حصہ پر قبضہ کرنے کے لئے اٹلی نے طرابلس کو ہضم کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُدھر ایران پر روسی شہنشاہیت کا دست دراز بڑھ چکا تھا۔ اُس وقت ہندستان کے مسلمانوں میں اتنا شعور پیدا نہ ہوا تھا کہ وہ یہ سمجھ سکتے کہ ترکی اور ایران کی اس مصیبت کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ ہندستان پر برطانوی سامراج کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جائے۔ تھوڑا سا اسلامی جذبہ تو ضرور تھا جس کی بنا پر ہندستان میں ترکی اور طرابلس کے نام پر چندے جمع ہونے لگے تھے۔ طرابلس میں کم و بیش ۳۰۰ سو سال سے ترکوں کا پرچم بلند تھا۔ لیکن اب اٹلی نے صرف اس بہانہ سے اس طرف حملہ کیا تھا کہ طرابلس میں اٹلی کو آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت نہ تھی! اگر تجارتی مزاحمت ہی کسی ملک پر قبضہ کر لینے کی کافی وجہ ہو سکتی ہے تو ہندستان کو سب

سے پہلے انگلستان پر قبضہ کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن ایسی دلیلیں ہمیشہ زبردست کی دلیلیں کمزور کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔ شیر بکری سے کہتا ہے کہ تو پانی گدلا کرتی ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں نے پہلی دفعہ یہ دیکھ کر کہ دنیا کی امن کے نام نہاد ٹھیکہ دار اس اعلان جنگ کے ساتھ اپنی غیر جنبہ داری کا اعلان فرمانے لگے اس حقیقت کو کسی قدر سمجھا کہ اس قسم کی غیر جنبہ داری دراصل جنبہ داری ہی کا دوسرا نام ہے اور یہ کہ خود اُن کی غلامی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بہرحال ریگستان طرابلس میں ہزارہا مسلمانون کا خون پانی ہو کر بہنے لگا اور برطانیہ کی غیر جنبہ داری کا یہ عالم تھا کہ عدن میں ہندستانی حجاج کا سامان خورد و نوش بھی صرف اس اندیشہ سے چھین لیا جاتا تھا کہ کہیں اُس میں سے روٹی کے چند ٹکڑے طرابلسی مجاہدین تک نہ پہنچ جائیں! اقبال نے اُس زمانہ میں فرنگی سیاست پر جو طنز کیا وہ عام ہندی مسلمانوں کے جذبات کا صحیح عکس تھا خصوصاً اُن مسلمانوں کے جذبات کا جو اُس زمانہ کی مغربی سیاست کا گہرا مطالعہ کر سکتے تھے۔ اقبال نے میسولینی کی زبان سے اُن یورپین دول کو مخاطب کیا تھا جو ظاہرداری کے لئے طرابلس پر اٹلی کے حملے کی کچھ مذمت کر رہے تھے۔

کیا زمانہ سے نرالا ہے میسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سب ہی تہذیب کے اوزار میں چھلنی تو چھاج!

تیرے سوداے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
آل سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!

تم نے لوٹے بے نوا صحرانشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت صحرا تم نے لوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج!

جس وقت دفتر خارجہ کے دیوتا اپنی "غیر جنبہ داری" اور ہیگ کی بین الاقوامی عدالت اپنی "مصلح جوئی" کے مندروں میں خاموش تھی تو سوتوں کو جگانے والا یہ ایک زلزلہ آرہا تھا اور ہندستان کا مسلمان بھی اب چوٹیں کھا کر زندگی کے اس راز سے واقف ہونے لگا تھا کہ انقلاب کی قیمت بھی ادا کرنی ضروری ہے۔ حکیم صاحب کی زندگی کے آخری دور میں یہ قیمت ہندستان کی زمین کے چپہ چپہ پر ادا کی گئی!۔

بنگال کے انقلابی

اُدھر تو طرابلس پر اٹلی کے حملے نے مسلمانوں میں تھوڑی سی حرارت پیدا کردی اور ادھر ملک کی اندرونی سیاست میں دہشت انگیز انقلابیوں کی وجہ سے ہلچل شروع ہوگئی۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰-۱۱ء تک خود صوبہ بنگال کے اندر خفیہ دہشت انگیز جماعتوں کے اقدامات کی ایک طویل فہرست تیار ہوئی۔ مثلاً
۷ر دسمبر ۱۹۰۷ء لفٹننٹ گورنر کی اسپیشل ٹرین کو غارت کرنے کی کوشش

دسمبر سنہ ۸	مسٹر ایلن پر گوا لنڈہ میں قاتلانہ حملہ
۴ر مارچ سنہ ۸	پادری ہگن پوتھم پر حملہ
۱ر مارچ سنہ ۸	چندر نگر میں لفٹنٹ گورنر کی گاڑی پر حملہ
اپریل سنہ ۸	چندر نگر میں بم کا حادثہ۔
۳ر اپریل سنہ ۸	مظفر پور میں مسٹر کینڈی کی بم کے حملہ سے ہلاکت
اگست سنہ ۸	علی پور جیل میں سریندر ناتھ گوسائیں کا قتل
اکتوبر سنہ ۸	سر اینڈرو فریزر پر ٹاؤن ہال میں تیسرا حملہ
"	کلکتہ میں انسپکٹر نند لال بنرجی کا قتل
۱۰ر فروری سنہ ۹	بابو اسوتوش وکیل سرکار کا قتل
فروری سنہ ۱۰	راجندر پور ٹرین ڈکیتی کے سلسلہ میں ایک چپراسی کا قتل
۲۹ر جنوری سنہ ۱۰	ہائی کورٹ میں شمس العالم کا قتل

ان جرایم کی کثرت کا بڑا سبب تقسیم بنگالہ تھی۔ اس بڑھتی ہوئی بد امنی سے گھبرا کر اب حکومت خاص مراعات کے ذریعہ سے دلرہی کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ لہذا یہ صورت پیدا کی گئی کہ انگلستان کے بادشاہ کو ہندستان لایا جائے اور اہل ہند کے قدیم شاہ پرست جذبات کو متحرک کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں اور نہ صرف عام سیاسی بیچینی کے زخموں پر مرہم کافور رکھنے کا یہ انداز اختیار کیا گیا بلکہ مسلمانوں کے قلوب کو بھی جو طرابلس میں اٹلی کی ڈکیتی سے بہت متاثر تھے تسکین دینے کا ایک ڈھنگ تجویز کیا گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ دہلی کو جس سے مغلیہ اقتدار کی یاد ابھی تک وابستہ تھی ہندستان کا دار السلطنت بنا دیا جائے۔ یہ منصوبے پکائے گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے ہندستان میں برطانوی حکومت کی آزمودہ پالیسی یہ رہی تھی کہ جب حکومت کی سختیاں رعایا کو زیادہ بددل کر دیں تو کسی اعلان، کسی دربار، کسی انعام یا کم از کم کسی وعدے سے بےچینی پیدا کرنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کے بعد ملکہ معظمہ کا اعلان شاہی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے دخلی گویا اُن واقعات کے زخموں کا مرہم بنا۔ پھر ۱۸۷۷ء میں دربار قیصری میں ملکہ وکٹوریہ نے "قیصرہ ہند" کا خطاب اختیار کرکے گویا تاج برطانیہ سے ہندستان کے تعلقات قایم کئے۔ پھر ۱۹۰۳ء میں جب لارڈ کرزن کو اپنے حاکمانہ اقتدار کے مظاہرے کی خواہش بےچین کئے ہوئے تھی دہلی میں ایک دوسرا دربار منعقد ہوا۔ اب جب پھر ملک میں سیاسی ہلچل زیادہ شروع ہوئی تو ۱۹۱۱ء میں بادشاہ کو ہندستان لایا گیا تاکہ وہ شاہی انعامات و اعلانات کے ذریعہ وفادار جماعتوں کو زیادہ وفادار بنائیں اور بددل جماعتوں کی شورش کو دھیما کریں۔ ۱۲ دسمبر کو دہلی میں یہ دربار منعقد ہوا اور بادشاہ نے اپنی تقریر میں "والیان ریاست اور رعایا کے پُرخلوص جذبات اور صادقانہ مظاہروں" کو سراہتے ہوئے "اپنی مرحمت خاص اور الطاف شاہانہ کی بعض علامات" سے اہل ہند کو نوازا۔ یہ "علامات" حسب ذیل تھیں:۔

(۱) عام تعلیم کے لئے ۵۰ لاکھ۔

(۲) فوج کے ادنیٰ ملازمین کو آدھی تنخواہ بطور انعام

(۳) مذہبی علمی خطابات کے ساتھ پنشن

(۴) قیدیوں کی رہائی

(۵) دارالسلطنت بجائے کلکتہ کے دہلی

(۶) بہار و ناگپور و اڑیسہ کے جداگانہ صوبے

وہ زمانہ ایسا تھا کہ ان مراعات شاہانہ پر تحسین و آفریں اور شکرانہ کے بادل برس پڑے اور ہر طرف اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن درپردہ حقیقت یہ تھی کہ تقسیم بنگالہ کے خلاف شورش نے اثر پیدا کیا اور اس طرح بنگال کی تقسیم پر نظر ثانی کی گئی۔

حکیم صاحب نے لندن کے دربار تاجپوشی میں شرکت کرنے کے بعد اب دہلی کے دربار میں بھی شرکت کی اور لارڈ ہارڈنگ نے خاص طور پر اُن کی اور بادشاہ کی پرائیویٹ ملاقات کا بھی انتظام کر دیا۔ حکیم صاحب کے اس خاص اعزاز کا اخبارات میں عام طور پر چرچا ہوا۔

دربار کے سلسلہ میں جو خاص میلہ ہوا اُس کے انتظامات میں بھی حکیم صاحب نے بہت حصہ لیا اور طلبہ کالج کے بہت سے طلبا بھی نمایاں طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ حکیم صاحب نے اپنی ایک تقریر میں دہلی کے دارالسلطنت بنائے جانے پر اظہار مسرت کیا اُنھوں نے مرکزی حکومت کے دہلی کا یہ کہہ کر خیر مقدم کیا کہ

رواقِ منظر چشم من آشیانہ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

زمانہ کس طرح انسانی افکار کو بدلتا ہے، اس کا اندازہ حکیم صاحب کی زندگی میں اس قسم کے بہت سے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ وہی اجمل خاں جو ۱۱ء میں "رواق منظر چشم من آشیانہ تست" فرما رہے

تھے ۱۹۱۹ء میں "خانہ خانہ تست" کے بجائے صاحبان انگریز سے کہہ رہے تھے کہ

نان کہ خوردی خانہ برو!

اولوالعزم انسانوں کو زمانہ کہاں سے کہاں لیجاتا ہے۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ اجمل خاں اشیانہ وفاداری سے قربان گاہ آزادی پر اس جوانمردی کے ساتھ پہنچیں گے۔ لیکن قدرت کو جو کام اُن سے لینا تھا اُس کے اسباب بھی وہ پیدا کر رہی تھی۔ خود حکیم صاحب کی فطرت قدیم راستوں سے روگرداں ہونے کے تقاضے کر رہی تھی اور وفاداری کے دور میں بھی اُن کے مزاج کی تمکنت انہیں ان وفاداروں کے رسم و رواج سے دور رکھتی تھی۔ اُن کے کردار کے اس پہلو پر اُن کے اور گاندھی جی کے خاص دوست رلوائیڈ اینڈر رُوز کا ایک بیان شاہد ہے جنھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ

"میں اکثر اُن سے ملنے جایا کرتا تھا اور اکثر اُن کے ہاں کھانا کھاتا تھا اور اکثر پبلک تقاریب میں اُن سے میری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ایسے موقعوں پر ہم دونوں مجمع سے الگ ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور مختلف پبلک معاملات پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اب اُس زمانہ کا خیال کر کے تعجب ہوتا ہے جب گویا دہلی کے ہر معزز آدمی کا یہ فرض تھا کہ ڈپٹی کمشنر کی اس قسم کی تقاریب میں شرکت کرے اور کسی معزز آدمی کا شریک نہ ہونا ڈپٹی کمشنر کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ کتنے تھکا دینے والے گھنٹے ان مواقع پر ضائع ہوتے

تھے! ایسے موقعوں پر حکیم صاحب سے ملنا آسان ہوتا تھا اس لئے کہ وہ اکثر علیحدہ بیٹھا کرتے تھے اور کبھی حکام کی توجہ یا عنایت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ میں بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ یہ مواقعہ اُن کے لئے کس قدر ناگوار ہوتے ہونگے اور کس طرح اُن کا خیال ایسے موقعوں پر دربار مغلیہ کے عہد ماضی کی طرف جاتا ہوگا جہاں اُن کے آبا و اجداد مغل اعظم کے دربار میں معزز مہمان ہوتے ہونگے۔ نئے عہد میں اُن کے لئے یہ (ایسی تقاریب کی شرکت) یہ ایک تذلیل امیز پہلو تھا جو کبھی اُن کے احساسات سے دُور نہ ہوگا اور اکثر وہ اُس کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہونگے۔ مجھے حکیم صاحب کی متانت اور خوش اخلاقی بہت پسند تھی جس کے ساتھ ہمیشہ ایک آزادی کا انداز شامل ہوتا تھا۔ کوئی شخص اُن کے اس اشارے کو نظر انداز نہ کرسکتا تھا۔ اُن کا یہ احساس اُن کے آباؤ اجداد سے نسلاً بعد نسلٍ اُن تک پہنچا ہوگا۔ وہ درحقیقت ایک پیدائشی اور فطری چیز تھی۔ وہ کوئی ایسی عادت نہ تھی جس کو اُنہوں نے بعد میں سیکھا ہو۔"

ڈاکٹر انصاری بھی حکیم صاحب کی اُس زمانہ کی صحبتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"۱۹۱۰ء میں جبکہ ہندستان واپس آکر میں نے دلی میں مستقل قیام کیا اور مطب شروع کیا حکیم صاحب کی اور میری

یک جہتی اور گہرے مراسم ارتباط و محبت قایم ہوئے۔ اُس زمانہ میں حکیم صاحب کی سیاسیات کا رنگ حریت و آزادی کی طرف بہت زیادہ میلان نہ رکھتا تھا۔ دلی میں اُن کے اکثر احباب اور ہم جلیس صاف طور پر حکومت کے دامن سے وابستہ تھے اُن میں سے صرف حکیم صاحب ہی میں خودداری آزادی اور تمکنت تھی۔"

حکیم صاحب کی زندگی کے ایسے بہت سے واقعات نظر کے سامنے ہیں جن سے اس نیازمندی اور بندگی کے زمانہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر اُس زمانہ میں بھی اُن کی آزادروشی اور عزت نفس دیکھنے والوں پر آشکار ہوتی تھی اور انہیں دیکھ کر اکثر مواقعہ پر غالب کا یہ شعر یاد آیا کرتا تھا کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

آزادی اور خودبینی کا یہ انداز گورنر جنرلوں کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کی "بندگی" میں اجمل خاں کا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ وہ اس انداز کو بھی نہ نبھا سکے اور ایک دن یہ کہہ کر الگ جا کھڑے ہوئے کہ

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد دولت زیادہ!

دورِ ثالث

۱۹۱۲ء میں نہ صرف حکیم صاحب کی زندگی کا بلکہ تمام دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ مغربی تہذیب و سیاست کے بارود خانہ میں پہلی چنگاری گرنے ہی والی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں افریقہ میں اٹلی کی قزاقی نے مسلمانان عالم کو ایک سخت جھٹکا دیا اور خوابیدہ قوتیں کچھ کچھ بیدار ہونے لگیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر مختصر الفاظ میں اس بیداری کا تاریخی پس منظر پیش کر دیا جائے۔ وہی پس منظر حکیم صاحب کی زندگی کا ہے اور وہی اس انقلاب کا پس منظر ہے جو مغربی تہذیب اور سامراج کے خلاف ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک اسلامی اور ایشیائی دنیا کے ضعف کی اور یورپین سامراج کی دست درازیوں کی انتہا ہو چکی تھی۔ ایشیائی ممالک میں ہر طرف جمود اور اضمحلال کے آثار نمایاں تھے۔ بکھرے ہوئے قومی شیرازے یورپین سامراج کی تیز ہوا کے جھونکوں میں اور بھی زیادہ منتشر ہوتے جا رہے تھے۔ ایرانی اور عربی تہذیب کے آثار تقریباً مٹ چکے تھے۔ دنیا کے علوم و فنون کی ترقیوں سے ایشیا کی اقوام (سوائے جاپان کے) بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ حال تھا اٹھارویں صدی عیسوی میں ایشیا کی کالی اور بھوری قوموں کا جن کی کھال کا رنگ گویا ان کی کمتری کا ایک نشان قرار پایا تھا۔ اسی زمانہ میں عرب کے ایک دور افتادہ گوشہ میں محمدؒ بن عبدالوہاب عربوں کے انحطاط کے اسباب پر غور کر رہا تھا اور وہابیت کی تحریک نجد سے نکل کر دنیائے اسلام پر چھا جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس تحریک کے اثرات ہندستان تک بھی پہنچ چکے تھے۔ ادھر ترکی میں جنگ کریمیا

کے بعد سے اصلاحات اور ترقی اور دستوریت کی دہیمی دہیمی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ رشید پاشا اور مدحت پاشا کا نام عوام کی زبانوں پر آگیا تھا۔ وسط ایشیا میں نقشبندیہ فرقہ اپنی طاقت کو مجتمع کر رہا تھا۔ تاریخ کے اس دور میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر کے یورپ کے سامراج کا ایک تازیانہ ایشیائی اقوام کی کمر پر مارا۔ اور بالآخر عبد القادر نے وہاں فرانسیسی سامراج کے خلاف اپنا جھنڈا بلند کیا۔ مصر پر انگریزوں کی گرفت بہت سخت ہو چکی تھی۔ مصری سوڈان میں مہدی کی "بغاوت" کو جو در اصل آزادی کی جنگ تھی کچلنے کے لئے برطانیہ کے آہنی پنجہ نے مصری جسد قومی کا خون نچوڑ لیا۔ جب الجزائر اور مصری سوڈان میں آزادی کی تحریکیں دم بہ لب تھیں تو چین اور مشرقی ترکستان میں عوام کی بے چینی کے آثار نمایاں ہوئے۔ مشرقی دنیا کے دل میں ایک نیا درد اور نئی اُمنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اُس وقت سلطان عبد الحمید خان نے آل عثمان کا تاج اپنے سر پر رکھا۔ اُنہوں نے رشید پاشا اور مدحت پاشا کی اصلاحی تحریک کے دروازے بند کر کے ملک کی بیداری کو روکنے کے بجائے اُس کی قوت میں اضافہ کر دیا۔ البتہ عبد الحمید خان کی سخت گیری کی وجہ سے چند روز کے لئے وہ تحریک پردوں کے پیچھے اور زیر زمین کام کرنے لگی۔

اُدہر عبد الحمید خان اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی بیداری کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور ادہر ۱۹ ویں صدی کے آخر میں قسطنطنیہ سے زیادہ مصر عوامی اور قومی تحریکوں کا مرکز بن گیا تھا۔ جمال الدین افغانی، مفتی عبدہٗ اور مصطفےٰ کامل جیسے احرار نے مصری عوام کے سامنے

زندگی کا ایک نیا تخیل پیش کیا۔ باوجودیکہ طل الکبیر پر اعرابی پاشا کی شکست نے کچھ عرصہ کے لئے مصری قوم پرستوں کی آواز کو تھکا دیا، لیکن برطانوی سامراج کا کانٹا دلوں میں کھٹکتا رہا۔

سنہ ۱۹۰۴ میں روس نے جاپان سے شکست فاش کھائی۔ یورپ کا ریچھ اس ایشیائی خرگوش کے تیز دانتوں کو برداشت نہ کر سکا۔ براعظم روس کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹے سے جزیرہ کی قوم سے شکست کھا جانا بیسویں صدی کی تاریخ حاضرہ کا ایک بہت بڑا نفسیاتی واقعہ تھا جس سے بیداری مشرق کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یوروپین اقوام کی فضیلت اور تفوق کے جس طلسم میں ایشیا ایک صدی تک مبتلا رہا تھا وہ طلسم جنگ روس و جاپان میں بالآخر ٹوٹ گیا۔ ایشیا میں یوروپین اقتدار کے لئے جس خطرہ کی گھنٹی بجی اوس نے یورپ کی سامراجی قوتوں کو گھبرا دیا اور وہ اپنی تقویت کے نئے نقشے بنانے لگیں۔ سنہ ۱۹۰۷ میں روس اور برطانیہ نے کمزور ایران کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر وہاں اپنے اپنے حلقہ ہائے اقتدار قایم کر لئے لیکن اس بٹوارے نے ایرانی قوم پرستوں کو بھی پوری طرح جگا دیا اور انھوں نے اس تقسیم کے ایک ہی سال بعد خاندان قاچار کا تختہ اُلٹ دیا۔ دوسری طرف ٹرکی میں ترک احرار نے عبدالحمید خاں کے ساتھ اپنے ملک کے قدیم نظام زندگی کو بھی ختم کر دیا۔ اب ایشیائی ممالک میں ہوا کا رخ پلٹ گیا اور یورپ کو معلوم ہوا کہ جو مُردے اب جاگے ہیں اور اپنی قبروں سے باہر آئے ہیں اُن کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا آسان نہیں۔ اب سامراجی قوتوں نے آپس میں ایک سمجھوتہ کر کے ان

ممالک کی بیداری پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کی۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر ڈاکہ مارا۔ اُس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا یعنی ترکوں اور عربوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ شروع کیا۔ اُس زمانہ کے بعض یورپین مدبر اس ڈاکہ زنی کے انتہائی نتائج سے بے پروانہ تھے۔ فرانسیسی وزیر خارجہ کہہ رہا تھا کہ "طرابلس اب ایک خانہ زنبور بن گیا ہے اور اٹلی نے ایک ایسی حرکت پیدا کر دی ہے جس کا نتیجہ خود اُس کے لئے اور ہم سب کے لئے بُرا ہے"! کم و بیش تیس برس بعد وہ بُرا نتیجہ اِن تمام قزاقوں کے سامنے آیا۔ سامراجی حکمت عملی ایک ایسی "شومیٔ اعمال" تھی جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ بالآخر اُس نے "صورت (نادر) ہٹلر گرفت"!

جب طرابلس میں اٹلی کے مقاصد پورے نہ ہوئے تو پھر یورپین مدبرین نے بلقان کی ریاستوں کو ترکی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اور ادھر دوسری طرف روس نے ایران پر ایک ضرب لگائی اور مشہد مقدس پر گولہ باری کر دی۔ ۱۹۱۲ء میں ترکی کے خلاف جو جنگ شروع کرائی گئی اُس نے ہندستان کے مسلمانوں میں ہمالیہ سے لنکا تک غم و غصہ کی آگ بھڑکا دی۔ اور ہندو آبادی نے بھی اُس خطرہ کو محسوس کیا جو سامراجی دول کی اس دست درازی سے تمام ایشیائی اقوام کے لئے پیدا ہو رہا تھا۔ ہندستان کے مسلمان جو اب تک زیادہ تر سرسید کے مسلک پر قایم تھے اور سیاست کے شجر ممنوعہ سے اپنا دامن بچایا کرتے تھے اب دفعتاً جنگ بلقان کی خبروں سے متاثر ہو کر برطانوی سامراج کے میدان میں مقابلہ پر اُتر آئے۔ بیداری ہندستان کی

تاریخ کا یہ ایک عجیب و غریب زمانہ تھا۔ اُدھر تو اقبالؔ اپنے نیلے شعر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھر کر خدا کی بارگاہ میں جا رہا تھا اور ادھر علامہ شبلیؔ (جو ہمیشہ سیاسی زندگی سے علیحدہ رہے تھے) کھلے الفاظ میں سوال کرنے لگے تھے کہ

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک!

جذبات کا یہ ہیجان جو مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا ملک کے ہندو عوام پر بھی اثر کر رہا تھا اس لئے کہ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ مشرقی ممالک پر سامراجی اقوام کے اقتدارات کا پہلے سے زیادہ قایم ہونا ہندستان کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کر دے گا۔

شروع ۱۲ء میں مطب کے علاوہ حکیم صاحب کا زیادہ وقت صوبہ بمبئی کے میڈیکل رجسٹریشن کے خلاف جد و جہد کرنے میں گذرا۔ مارچ کے ابتدائی ہفتہ میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے صدر نواب صاحب ڈھاکہ تھے۔ لیکن ابھی تک مسلم لیگ وفاداری اور بندگی کی حدود کے اندر رہ کر سیاست کی الف بے کا سبق لے رہی تھی۔ اس اجلاس میں بھی 'مسلم یونیورسٹی۔ جداگانہ حقوق' وقف علی الاولاد کے سوا ملک کے دوسرے مسائل سے لیگ کے ارباب کار نے پرہیز کیا۔ چنانچہ باوجودیکہ جنگ طرابلس کا ہنگامہ جاری تھا لیکن مسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں اُس کے متعلق ایک حرف بھی موجود نہ تھا۔ اُس وقت کی وفادارانہ احتیاط کا اقتضا ہی یہ تھا۔ وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو مولانا شبلیؔ نے اٹھایا اور اس کام میں حکیم صاحب اُن کے خاص

معاون تھے۔ لیکن دوسرے مسائل میں اب اُن کی نظر لیگ کے دائرہ کار سے باہر جا رہی تھی اور اُن کے وقت کا بڑا حصہ اُن حالات کے مطالعہ میں صرف ہونے لگا تھا جو یورپین امپیریلزم اور ایشیا کے اسلامی ممالک کے درمیان پیدا ہو رہے تھے۔

طبیہ کالج کی تحریک

۱۵ اپریل کو انجمن طبیہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں حکیم صاحب نے مدرسہ طبیہ کو طبیہ کالج بنانے کے متعلق اپنے ابتدائی افکار پیش کئے اور اس امر پر زور دیا کہ طب یونانی کی ترقی کے لئے اُس کی تعلیم اور تحقیقات کا ایک جدید نقشہ بہت اعلیٰ پیمانہ پر بنانا ضروری ہے۔ اپنی رپورٹ میں اُنہوں نے مدرسہ کی جو حالت بیان کی اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس وقت ۱۳۰ طلبا مدرسہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ شفا خانہ میں سالانہ اوسط تقریباً چار ہزار مریضوں کا تھا۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۱ء تک مدرسہ کا کُل سرمایہ ایک لاکھ روپیہ تھا جو تمام تر حکیم صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مدرسہ کے اس آغاز کا اگر اُس کی اُس ترقی سے مقابلہ کیا جائے جو اُس نے ۱۹۲۷ء تک کی تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

مولانا محمد علی دہلی میں

اکتوبر میں حکیم صاحب رام پور میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد دہلی آئے۔ اُس وقت جنگ بلقان کی وجہ سے ہر طرف مسلمانوں کے جذبات میں سخت ہیجان برپا تھا۔ اُسی زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم کلکتہ سے دہلی آ کر اپنا اخبار ہمدرد جاری کر چکے تھے۔ اُن کے جوش و خروش نے دلی کے عوام کو اُن کی

طرف متوجہ کر دیا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے حکیم صاحب اور مولانا محمد علی کے تعلقات رام پور میں اچھے نہ تھے۔ لیکن دہلی آنے کے بعد سے مولانا محمد علی کے کاموں میں شریک ہونے والے دو ہی شخص تھے، ایک ڈاکٹر انصاری اور ایک حکیم اجمل خاں۔ خود مولانا محمد علی کو یہ توقع نہ تھی کہ حکیم صاحب اس مسرت اور محبت کے ساتھ دہلی میں اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ وہ پہلے ہی دن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اجمل خاں کی نظروں میں محبت اور باتوں میں الفت کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا محمد علی کی طبیعت کا ہیجان ایک آندھی کی طرح دہلی پر چھا گیا اور ہمدرد و کامریڈ کے صفحات پر قومی زندگی کا ایک ایسا عکس نظر آنے لگا جس سے ابھی مسلمان عوام آشنا نہ تھے۔ اپنے جذبہ کی شدت اور بعض اوقات اپنے مزاج کی گرمی کی وجہ سے مولانا کو اُس زمانہ میں اکثر اپنی مخالف جماعتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ محمد علی کی زندگی پر ان اوراق میں تبصرہ کرنا بے محل ہوگا لیکن یہ تیز بہنے والا پرخروش پہاڑی چشمہ اجمل خاں کے پرسکون گر گہرے دریا کے پہلو بہ پہلو بہ رہا تھا اس لئے ناممکن ہے کہ ۱۲ء کے بعد سے اجمل خاں اور محمد علی کا نام اکثر ساتھ ساتھ نہ لیا جائے۔ اس ابتدائی زمانہ میں بھی جب محمد علی ہنوز مولانا محمد علی نہ ہوئے تھے اُن کی شخصیت ہر جگہ اپنے نقوش ثبت کرنے پر مصر ہوتی تھی اور یہ اُن کے فطری جوش طبیعت کا نتیجہ تھا۔ یہ گرم پانی اس قدر کھولتا ہوا تھا کہ اگر سمویا نہ جاتا تو قومی کاموں کا سلجھنا مشکل ہو جاتا اجمل خاں کی دھیمی فطرت اکثر محمد علی کے گرم مزاج کو ٹھنڈا کیا کرتی تھی، لیکن کبھی کبھی ان انگاروں سے خود حکیم صاحب کی انگلیاں بھی

جل جایا کرتی تھیں۔ اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ محمد علی کو دہلی میں آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ امام صاحب جامع مسجد اور اُن کی جماعت سے اُن کی آویزش نے نہایت ہی تلخ صورت اختیار کر لی۔ معاملہ کوئی بڑا معاملہ نہ تھا، صرف جامع مسجد میں شامیانوں کے لگانے کا سوال تھا۔ مگر مولانا محمد علی کے قلم کے شعلے اور امام صاحب کی جماعت کا قدیم اقتدار جب یہ دونوں ٹکرائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مسئلہ محض شامیانوں کا نہیں بلکہ شاہجہانی مسجد کے توڑنے اور محراب قبلہ میں ترمیم کرنے کا ہے! ہمدرد کے سینکڑوں کالم شامیانوں کی داستان پر صرف ہو گئے۔ جامعہ مسجد کمیٹی کی اندرونی خرابیوں کا یہ ایک پورا ناز خم تھا جسے محمد علی کے قلم نے اتنا کریدا کہ وہ خون ہو کر بہنے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جامع مسجد کی محراب کے نیچے کمیٹی سے (جس کے ایک رکن حکیم صاحب بھی تھے) اور محمد علی سے بہت ناگوار بدمزگی پیدا ہو گئی۔ لیکن باوجود اس بدمزگی کے حکیم صاحب تمام قومی کاموں میں محمد علی کا ساتھ دیتے رہے اور ایک دن بھی اُنہوں نے اُس کشیدگی کو باقی نہ رہنے دیا۔ یہی اُن کی فطرت کا بلند ترین مقام تھا۔

سنہ ۱۳ء کی شورشوں کا پیش خیمہ سنہ ۱۲ء کا نصف آخر ہندستان کے مسلمانوں کے لئے بہت سی مصیبتیں لایا اور عام فضا میں بہت سی بجلیاں اُن کے سروں پر چمکیں جو سنہ ۱۳ء کی شورشوں کا پیش خیمہ تھیں۔ طرابلس میں اطالویوں اور عربوں اور ترکوں کی کشمکش ختم نہ ہوئی تھی کہ جنگ بلقان کے شعلوں نے ترکی

کو گھیر لیا۔ اندرونی اختلافات اور امرا کی غداریوں کی وجہ سے اڈریا نوپل دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا اور قسطنطنیہ بھی بلقانی فوج کی زد میں آگیا۔ شاہ یونان نے بہ آواز دہل جنگ صلیبی کا اعلان کر دیا اور اس طرح بلقان میں اور سینٹ پیٹرس برگ میں مسجد ایا صوفیہ پر صلیب نصب کرنے کی گفتگو شروع ہوگئی۔ وزیر اعظم انگلستان نے سالونیکا کی تسخیر پر اظہار مسرت و شادمانی فرمایا اور فرمایا کہ یہی دروازہ ہے جس سے مسیحیت یورپ میں داخل ہوئی تھی۔ تعجب نہیں کہ ان حالات میں ہندستان کے مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ اگر یہی روز و شب ہیں تو کسی دن بیت المقدس مسجد عمر اور کعبہ پر بھی صلیبی جھنڈوں کو بلند کرنے کے مشورے شروع ہو جائیں گے۔ اس طرح جنگ طرابلس اور اس کے بعد جنگ بلقان نے ہندستان کے سوتے ہوئے مسلمانوں کو اٹھا کر بٹھا دیا اور ایک ایسی ہلچل مچ گئی جس نے مسلمان رعایا کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید جذبات پیدا کر دئے۔ یہ راز اب طشت از بام ہو گیا کہ برطانیہ گلیڈسٹن کے مسلک کی تکمیل کر کے ترکوں کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دینے کا ارادہ کر چکا ہے۔ اس زمانہ میں ہمدرد و کامریڈ کے ذریعہ سے مولانا محمد علی نے تمام ملک میں ایک زبردست تحریک پیدا کر دی تھی اور لاکھوں روپیہ ترکوں کے امداد کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔

طبی وفد

ان ہی کے دماغ میں ایک طبی وفد روانہ کرنے کی تجویز پیدا ہوئی اور ڈاکٹر انصاری کی شرکت نے اس تجویز کو بہت جلد مکمل کر دیا۔ لیکن جب دہلی میں اس تجویز کا چرچا ہوا تو بقول ڈاکٹر انصاری "محمد علی سے اختلاف کے باعث مسجد جامع اور

مسجد فتحپوری کی منتظمہ کمیٹیوں نے پہلے خاموشی اختیار کی اور بعد میں مخالفت بھی شروع کر دی۔ لیکن اسلامی جذبات کا یہ ایک ایسا سیلاب آیا کہ اُن کی مخالفتیں اُس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔" اس موقعہ پر حکیم صاحب کے اعلیٰ کردار نے اُن کی وسعتِ قلب کا جو ثبوت پیش کیا اُس پر ڈاکٹر انصاری کی حسب ذیل شہادت دلیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب یہ کمیٹیاں مخالفت پر کمربستہ تھیں تو اُس وقت باوجود اس کے کہ حکیم صاحب کا تعلق بھی اُن جماعتوں سے تھا اُن کی

"شخصیت نے ان دونوں کمیٹیوں کو صحیح راستہ پر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کے عام مسلمانوں میں ایک ایسی روح پیدا ہو گئی کہ تنہا انہوں نے پچاس ساٹھ ہزار روپیہ جمع کیا۔ وفد کو رخصت کرتے وقت مسجد جامع اور اس کے سامنے کے میدان میں آدمیوں کے سروں کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی۔ یہ مجمع نہ صرف آدمیوں کی تعداد اور اُن کے جوش کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا بلکہ دلی میں شاید شاہانِ مغلیہ کے بعد اپنے تزک و احتشام میں یکتا تھا۔ حکیم صاحب اور محمد علی صاحب کی الوداعی تقریروں نے اور مولانا شاہ ابوالخیر کی رخصتی دُعا نے ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ تمام عمر کوئی نہیں بھول سکتا۔ انگریزی حکومت کے دوران میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اپنی اجتماعی حیثیت سے ہندستان کے باہر کے مسلمانوں کی اعانت کے لئے ایک وفد روانہ کیا تھا۔

علاوہ طبی اور مالی اعانت کے اخلاقی اور معنوی تعلقات
میں جو زیادتی اور باہمی فائدے ہوئے اُس کے بیان کرنے
کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اس موقعہ پر خاص طور پر یہ اظہار کرنا
مقصود ہے کہ حکیم اجمل خاں صاحب کی شرکت کے بغیر دلی
کے خاص و عام میں اس تحریک کا مقبول ہونا غیر ممکن تھا۔

طبی وفد کی تحریک میں حکیم صاحب کی عملی شرکت نے اُن کے اور اُس سرکار پرست جماعت کے درمیان کافی فاصلہ پیدا کر دیا اور اسی نقطہ سے حکیم صاحب کی زندگی کے راستہ کا رخ بدلتا ہے۔ گو کہ بظاہر یہ تحریک حکومت کے خلاف نہ تھی لیکن اندرون خانہ تو سب جانتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ جد و جہد برطانوی وزارت خارجہ کے مسلک سے ٹکرا رہی ہے۔ اب تک تو دہلی میں اجمل خاں اپنے خاندانی مطب اور اپنے فنی کمالات کی وجہ سے اور نیز مدرسہ طبیہ کے بانی ہونے اور اپنی اعلیٰ کردار کی وجہ سے ایک معزز اور بااثر ہستی تھے لیکن جنگ بلقان کے زمانہ میں اُن کی اسلامی ہمدردیوں نے اُن کے میدانِ عمل کو پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا اور اب دنیا کی نظریں اُن پر نہ صرف طبیب حاذق اور رئیس دہلی کی حیثیت سے بلکہ اسلامی تحریک کے ایک بڑے لیڈر کی حیثیت سے بھی پڑنے لگیں۔

سنہ ۱۲ کے خاتمہ کے ساتھ جنگ بلقان میں ترکوں کے دشمنوں کی دست درازیاں بھی بہت زیادہ ہوگئیں لیکن سنہ ۱۳ میں ترکی کے سیاسی انقلاب نے جنگ کی بساط کو لوٹ دیا اور نوجوان ترکوں کی نئی ترکی نے جنم لیا۔ ہندستان کی تاریخ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جنگ بلقان

نے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے جذبات کو متحرک کر دیا تھا حتیٰ کہ اکبر جیسے غیر سرکاری اور سرکار پرست شاعر بھی بے محابا پکار اُٹھے تھے کہ

بحمداللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

اجمل خاں کی فطرت تو بہر حال پہلے سے آگے بڑھنے کے تقاضے کر رہی تھی، لیکن اکبر جو اپنی شاعری کو ہمیشہ اس قسم کے سیاسی جذبات سے دور رکھتے تھے بلقانیوں کی شکست پر اتنے مسرور ہوئے کہ بے اختیار فرمانے لگے۔

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ اُن کے سر کو زیر سنگ لایا ہے

جس وقت ہندستان کے مسلمان ۵۷ء کے پچاس سال بعد اپنے جمود اور اضمحلال کی حالت سے نجات پا رہے تھے تو ملک کی اندرونی سیاست کا خمار بھی تیز ہوتا جا رہا تھا اور کانگریس مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے انہیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ بنگال میں جو شورش شروع ہو رہی تھی وہ اب زیر زمیں اپنا کام کر رہی تھی۔ اور اسی کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ ۲۳ دسمبر کو جب لارڈ ہارڈنگ ویسرائے پہلی دفعہ نئے دار السلطنت دہلی میں شان و شوکت کے ساتھ داخل ہو رہے تھے تو اُن پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا۔ حکیم صاحب کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اس قسم کے سیاسی جرایم کو ناپسند کرتے تھے اور کچھ اُن ذاتی تعلقات کی وجہ سے جو اُن کے اور لارڈ ہارڈنگ کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اس حادثہ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ کانگریس کے لیڈروں نے بھی گو کہ دہشت انگریزوں کی اس حرکت پر بہت کچھ اظہار

ناپسندیدگی کیا لیکن اس میں تو شک نہیں کہ وائسرائے پر نارگسٹون کے اس حملہ نے ساری دنیا کو ہندستان کی بےچینی پر متوجہ کر دیا اور حکومت پر بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب ہندستان میں آزادی کی طلب کا جواب محض سخت گیری سے نہیں دیا جا سکتا۔

جس وقت لارڈ ہارڈنگ موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھے جنگ بلقان میں ترکوں کا پلہ بھاری ہوتا جاتا تھا۔ باوجودیکہ ابھی آل عثمان کا قدیم دارالسلطنت ایڈریانوپل محصور تھا اور سقوطری پر خونریزی جاری تھی تاہم ترکی میں نوجوان ترکوں کی تحریک نے قدم جما لئے تھے اور قدیم شاہی اقتدار کا جنازہ تیار تھا۔

حکیم صاحب نے ۱۳ء کے ابتدائی مہینے طبیہ کانفرنس کے کاموں میں گذارے اور اسی کانفرنس میں فن طب کے متعلق انہوں نے ایک دلچسپ اور معنے خیز مضمون پڑھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ مسلم لیگ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

لیگ کا نیا زاویہ

لیگ کا یہ اجلاس ۲۲ اور ۲۳ مارچ کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس کے دو پہلو نہایت اہم تھے۔ ایک یہ کہ دنیائے اسلام میں جو ہلچل مچی ہوئی تھی اس سے اجلاس کے شرکا متاثر تھے اور دوسرے یہ کہ کانگریس کی سیاسی تحریک سے مسلم لیگ کے لیڈروں کا نقطہ نظر قریب ہوتا جاتا رہا تھا۔ اس وقت سید وزیر حسن لیگ کے سکرٹری تھے اور ان کی رہنمائی میں لیگ اب محض فرقہ واری مسائل کے میدان سے آگے بڑھ کر ملکی سیاست کی جانب اپنا رخ بدل رہی تھی۔ پہلی دفعہ لیگ

کے اجلاس میں کانگریس کے پریسیڈنٹ پنڈت بشن نراین در اور دوسرے ہندو لیڈر شریک ہوئے۔ مسز نائیڈو نے بھی پہلی دفعہ لیگ کے اجلاس کو مخاطب کیا اور پہلی دفعہ ممالک اسلامی کے متعلق دول یورپ کی سیاست پر اس اجلاس میں کھلے ہوئے حملے کئے گئے۔ منشی احتشام علی صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

دول یورپ کے طرز عمل نے اُن کی (مسلمانوں کی) آنکھیں کھول دی ہیں جس سے اُن پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ ہولناک واقعات اپنی جگہ پر بے تعلق یا اتفاقی نہیں ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی گویا اسلام اور مسیحیت کے درمیان ایک جنگ ہے جس میں مسیحیت کی مذہبی رواداری کا ڈھکوسلا بے پردہ ہوگیا ہے۔"

گوکہ بر اقتضائے وقت اس خطبہ میں وائسرائے کے طرز عمل کو سراہا بھی گیا لیکن ہر انگریز یہ جان گیا تھا کہ مسلمانوں کی قدیم وفاداری کا سانچہ اب ٹوٹ رہا ہے۔ اس اجلاس میں میاں محمد شفیع نے بھی جو اُس وقت تک "سر" نہ ہوئے تھے اور نہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ سکے تھے اپنے معتدل لہجہ میں حقائق کی طرف اشارہ کیا لیکن اپنے بیان حقیقت پر لارڈ ہارڈنگ کی دانشمندی و فرزانگی اور مسلمانوں کے وفادارانہ مسلک کے خوایوں کی شکر بھی چڑھا دی۔ ہندو مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی پہلی آواز بھی اس پلیٹ فارم پر میاں محمد شفیع کی آواز تھی۔ اس طرح لیگ کی کشتی کے بادبانوں

کا رخ بدلا جا رہا تھا۔ مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن اس کی رفتار کو تیز کر رہے تھے اور حکیم صاحب نے لیگ کے لیڈروں کی صف اوّل میں اس ادارہ کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار کرنے کا ڈھنگ اختیار کر لیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان تفصیلات کے لئے ان اوراق میں گنجائش بہت کم ہے۔

سنہ ۱۳ میں طبیہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر حکیم صاحب نے اپنی جو رپورٹ پڑھی اس میں طبیہ مدرسہ کو کالج بنانے کے متعلق اپنی جد و جہد کی تفصیلات بیان کیں اور اس بات کا اعلان کیا کہ مجوزہ کالج کی عمارتوں کا سنگ بنیاد گورنر جنرل نصب کریں گے۔ اسی رپورٹ میں حکیم صاحب نے متعدد والیانِ ریاست کے رقمی عطیات کا اعلان بھی کیا تھا۔ اس اعلان میں ہم علاوہ دیگر رؤسا کے نواب صاحب رام پور، نواب صاحب ٹونک، بیگم صاحبہ بھوپال، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ اندور، مہاراجہ الور، اور بہت سے دوسرے معززین کے نام پاتے ہیں۔ یہ تمام عطیات خود حکیم صاحب کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھے اور ان کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ ملک کے اعلیٰ طبقوں میں حکیم صاحب کے شخصی اثرات کس قدر وسیع تھے۔ در حقیقت طبیہ کالج تمام تر صرف حکیم صاحب ہی کے ذاتی اثرات کا نتیجہ تھا اور اس بات کی یادگار تھا کہ تنہا ایک شخص بھی جب اس کے اندر خدمت کا جذبہ قومی ہو کیا کچھ کر سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلابات نے اس یادگار کو بڑی حد تک برباد کر ڈالا ہے، تاہم جب تک اس کی ایک دیوار بھی باقی

ہے وہ ہمارے دلوں میں اُس عالی حوصلہ انسان کی یاد کو سرسبز رکھیگی جس کی ہمہ گیر شخصیت اپنے ہر قدم پر اپنے عزم اور حوصلہ کی یادگاریں چھوڑ گئی ہے۔

خدامِ کعبہ ترکوں کی امداد کے جذبہ نے جسے یورپین دول اور خصوصاً برطانوی حکومت کی سیاسی سازشوں نے ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کیا تھا اُن پر ایسے بہت سے خطرے واضح کر دیے جو یورپین سامراج کی دست درازیوں سے اسلامی ممالک کے لئے پیدا ہو رہے تھے۔ ایڈریانوپل پر ترکوں کی شکست نے اہل الرائے مسلمانوں کو بہت زیادہ متردد کر دیا تھا اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ اگر یہی لیل و نہار رہیں تو کسی دن مذہب اسلام کے مقدس مقامات بھی ان دست درازیوں سے نہ بچ سکیں گے ان ہی احساسات کا نتیجہ انجمن خدام کعبہ کی تحریک تھی جو مئی، جون کے مہینوں میں پیدا ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں ہندستان کے مسلمان عام طور پر مولانا شوکت علی سے روشناس ہو چکے تھے اُن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی تو اُن سے چند سال پہلے ہی کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ سے قومی میدان میں آچکے تھے۔ اب خدام کعبہ کی تحریک نے علی برادران کا ایک سنجوگ پیدا کر دیا اور اس کے بعد سے ہندستان کے سیاسی ہنگاموں میں علی برادران صحیح طور پر یک جان دو قالب ہو گئے۔ اس تحریک کا آغاز مولانا شوکت علی کے ایک اعلان سے ہوا جو ہمدرد کے صفحات پر شائع ہوا تھا۔ یہ اعلان اُس زمانہ کے مسلم عوام کے دلوں کی بےچینی کا ایک مرقع تھا۔ انجمن کا مقصد خالصتاً

مذہبی قرار دیا گیا تھا اور ہندستان کی جدید تاریخ میں پہلی دفعہ اسی اعلان کے ذریعہ حجرہ نشیں علما اور مولویوں کو پبلک زندگی کے میدان میں آنے کی دعوت دی گئی۔ اس سے پہلے سنجیدہ علما تو اپنے حجروں اور مدرسوں کی حدود سے باہر ہی نہ آتے تھے اور پیشہ ور مولوی بھی صرف مذہبی عقائد کے اکھاڑوں میں کشتیاں لڑنے نکلا کرتے تھے۔ یہ بحث بے محل ہے کہ عوامی اور سیاسی میدان میں علما کے نکل آنے کے دوررس نتائج کیا پیدا ہوئے، لیکن یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علما کی طرف سے ملک کی سیاسی اور پبلک زندگی میں شرکت کا پہلا قدم علی برادران ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ اس جماعت کے پہلے ممتاز بزرگ غالباً مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی ہی تھے جنھوں نے علی برادران کی آواز پر لبیک کہا اور جن کے ہاتھ پر دونوں بھائیوں نے چند ہی روز بعد بیعت بھی کر لی۔

نظارۃ المعارف خدام کعبہ کی تحریک کے ابتدائی دور میں حکیم صاحب اُس سے کچھ زیادہ مانوس نہ تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اُس زمانہ میں وہ کسی دوسری ہی فکر میں تھے اور خود دہلی میں اُنہوں نے نظارۃ المعارف القرآنیہ کی تحریک کا ایک نقشہ بنا لیا تھا۔ اس تحریک کے بانی مولانا عبیداللہ صاحب تھے جو مدرسہ دیوبند کے اساتذہ کبار اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے خاص شرکائے کار میں سے تھے۔ علمائے دیوبند کی کمزوریوں سے تنگ آکر اُنہوں نے دیوبند سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ خدام کعبہ اور نظارۃ المعارف کی تحریکوں میں اصولوں کا تو کچھ زیادہ فرق نہ تھا لیکن طریقے

یقیناً مختلف تھے۔ علی برادران اماکن مقدسہ کی حفاظت کے لئے ہندستان کے مسلمانوں کی رائے عامہ کا ایک زبردست محاذ بنانا چاہتے تھے، لیکن مولانا عبید اللہ غیر ملکوں کی تائید حاصل کر کے برطانوی سامراج کے خلاف ایک عالمی محاذ قایم کرنا چاہتے تھے۔ بظاہر اس ادارہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ "انگریزی کے فارغ التحصیل طلبا دینیات اور عربی کی تعلیم حاصل کر سکیں اور قرآن کی تعلیمات کی تبلیغ تعلیم یافتہ طبقہ میں کی جا سکے"۔ حکیم صاحب اس تحریک کے معاون اس لئے بنے کہ وہ دیوبند کی تعلیمی فضا کو مسلمانوں کے لئے بے معنی بلکہ مضر سمجھتے تھے اور جیسا کہ تحریک ندوہ میں اُن کی دلچسپیوں سے ظاہر ہوتا تھا وہ وسیع تر نقطہ نظر سے مذہبی تعلیم کی اشاعت چاہتے تھے۔ اُن کا جذبہ ملّی محض ملّا، مولوی، مولانا، امام مسجد، موذن اور مدرس پیدا کرنے کے بجائے اس سے زیادہ کچھ چاہتا تھا جسے دیوبند کے علما سوائے ایک دو کے سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ مولانا عبید اللہ جنہوں نے چند روز ہی بعد ہندستان سے بھاگ کر دیار غیر میں پناہ لی اور عرصہ دراز کے بعد چند سال ہوئے جب ہندستان واپس تشریف لائے اور پھر چند روز تک جامعہ ملیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد بالآخر اپنے ہی وطن کی خاک میں محو خواب ابد ہو گئے، بہت بڑے اور شدید انقلاب پسند تھے۔ وہ ہندستان میں ایک زبردست انقلاب کی بجلیاں کڑکتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر اُن کی سوانح حیات تفصیل کے ساتھ لکھی جا سکے تو وہ اُس انقلاب کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہو گی جس کے لئے گذشتہ نصف صدی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہندی وطن پرستوں نے اپنی جان کی

بازی لگائی۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب کی زندگی کا یہ ایک راز تھا کہ وہ مولانا عبیداللہ کے عزایم سے بہت ہی قریب تھے، جب تک مولانا عبیداللہ اور حکیم صاحب کے انقلابی خیالات نظارۃ المعارف کے پردہ میں محفوظ تھے بیگم صاحب بھوپال اور نواب وقار الملک جیسے اصحاب بھی مذہبی تعلیم کے اس جدید تخیل کی عملی تائید کر رہے تھے۔

پہلی جنگ یورپ کے ہنگامہ میں جب مولانا عبیداللہ کو ہندستان سے بھاگنا پڑا تو دہلی میں یہ ادارہ ختم ہو گیا۔ تاہم مولانا خود سالہا سال افغانستان، روس، جرمنی، ترکی اور خدا جانے کہاں کہاں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس حالت میں پھرتے رہے کہ اتحادیوں نے اُن کے سر کی قیمت مقرر کر دی تھی۔ آج حکیم صاحب کی زندگی کا یہ پردہ اٹھا دیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی سیاسی زندگی ۱۳ء اور ۱۵ء کے بعد شروع ہوئی انہیں معلوم نہیں کہ اُن کی ذہنی اور انقلابی زندگی اُن کے سیاسی میدان میں آنے سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی —— اور در حقیقت دائرہ المعارف اور مولانا عبیداللہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔

بلقان کی جنگ جاری ہی تھی کہ جون ۱۳ء میں محمود شوکت پاشا جو ترکی کے ابتدائی انقلاب کے لیڈروں میں سے ایک تھے قتل کر ڈالے گئے۔ یہ وقت ترکی کے لئے اس قدر نازک تھا کہ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ اب دولت عثمانیہ اور ترکی قوم کا خاتمہ ناگزیر ہے۔ یورپ اور خصوصاً برطانیہ اور روس کے دفاتر خارجہ میں یہ طے ہو چکا تھا کہ اب ترک یورپ میں باقی نہ رہیں۔ قسطنطنیہ کے خالی کرانے کا مسئلہ زیر

غور تھا لیکن یہ سوال طے نہ ہوتا تھا کہ برطانیہ اوس پر قبضہ کرے یا روس لیکن جب یہ منصوبے پکائے جا رہے تھے تو دول عظمیٰ کو اس بات کی کچھ خبر نہ تھی کہ جو چنگاری ترکوں کے گھر میں آگ لگانے کے لئے پھینکی گئی ہے، وہی چند روز بعد بر اعظم یورپ میں ایک ایسی آگ لگائے گی کہ بڑے بڑے کاشانے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اس تباہی کے آثار اسی وقت ظاہر ہونے لگے تھے جب ترکوں کو شکست دینے کے بعد خود بلقانی ریاستیں لوٹ کی تقسیم کے معاملہ میں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑیں۔

۴ر جولائی کو ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد واپس آیا اور اُس نے مظالم و مصائب کی بہت دردانگیز داستانیں بیان کیں۔ علامہ شبلی نے ایک دل میں اتر جانے والی صدائے درد کے ساتھ وفد کا خیر مقدم اس طرح کیا کہ

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

. . . .

تمہیں کچھ جان نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خونخواری

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں

. . . .

مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیدستوں بھی دیکھے ہیں

. . . .

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

اسلامی جذبات کی اس شورش میں اب شبلی جیسا غیر سیاسی آدمی بھی "نتائج ہائے امید گلیدستوں" کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکا اور اُس نے ترکوں پر بلقانیوں کے مظالم کی ذمہ داری انگریزوں کے کاندھوں پر علانیہ رکھ دیا مگر اُس نے ایک بشارت بھی دی کہ

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے

گو کہ سوائے کارپردازاں قضا و قدر کے اُس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ دول کے ان اعمال کا ردعمل خود اُن کے حق میں زہر بن کر جنگ عظیم کی صورت اختیار کرے گا اور پھر ایک دفعہ ترکوں کو سانس لینے کا موقعہ ملے گا۔ قطع نظر اُن اسلامی جذبات کے جو وفد انصاری کے محرک ہوئے، اس وفد نے جو بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ ہندستان اور غیر ممالک کے درمیان دروازے کھول دیے۔ ہندستان کئی صدیوں سے اپنی مسلسل غلامی کی وجہ سے باہر کی دنیا سے بے تعلق تھا۔ اُس کی غلامی پر پہلی ضرب یہی لگی کہ ہندستانی مسلمانوں کے اس وفد نے غیر ممالک کے لوگوں سے اتصال پیدا کر لیا اور بین الاقوامی دنیا کی طرف اپنی غلام قوم کو بھی راستہ بتا دیا۔ یہ محض کسی ایک فرقہ یا مذہب کا معاملہ نہ تھا بلکہ وسیع تر نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمام

ہندستان کی اجتماعی زندگی کو بین الاقوامی سیاست سے قریب لانے کا مسئلہ تھا جس کا آغاز ڈاکٹر انصاری کے وفد سے ہوا۔ بعد کو دوسرے ہندستانی لیڈروں نے اس راستہ پر بہت سی مسافت طے کی اور آج تو پنڈت جواہر لال جیسے لیڈروں کی وجہ سے ہندستان ایشیا اور یورپ کے بین الاقوامی نقشہ میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس بین الاقوامیت کا آغاز بلاشبہ ڈاکٹر انصاری کے وفد ہی نے کیا تھا۔

مسجد کانپور

ڈاکٹر انصاری کا جہاز ہنوز ہندستان کے ساحل تک نہ پہنچا تھا کہ ہندستان میں مسجد کانپور کا ایک اور شورش انگیز حادثہ پیش آگیا۔ مسلمانوں کے جذبات کافی بھڑکے ہوئے تھے اور قدیم وفاداریوں کی زنجیریں بہت کمزور ہو ہی چکی تھیں کہ عین اُس حالت میں ایک جابر اور مغرور گورنر نے سڑک چوڑی کرنے کے لئے مسجد کا ایک حصہ منہدم کرا دیا۔ اور اُسی کے ساتھ مچھلی بازار میں بہت سے مسلمانوں کی جانیں بھی منہدم کر دی گئیں۔ بلقان کے زخموں پر مسجد مچھلی بازار کا یہ نمک بہت ہی تیز تھا! حکیم صاحب اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور کئی ماہ تک اس کشمکش میں اس قدر مصروف رہے کہ اپنا مطب بھی ترک کر دیا۔ واقعہ کی تاریخی اہمیت ایسی ہے کہ اُس زمانہ کا کچھ حال خود ڈاکٹر انصاری کی زبان سے سُن لیجئے۔ وہ اپنی یادداشت میں کہتے ہیں کہ:۔

> ۱۹۱۳ء میں جب ہم ترکی سے لوٹ کر ہندستان پہنچے تو ہندستان کے مسلمان ایک طرف تو دول یورپ اور خصوصاً انگلستان کی اینٹی ترک پالیسی سے ناراض تھے اور اُدھر مسلم یونیورسٹی کے

دستور اساسی اور کانپور کی مسجد کا قضیہ بھی چھڑ گیا جس سے
مسلمان بہت مشتعل ہو گئے تھے اور تمام ملک میں سخت ایجی
ٹیشن ہو رہا تھا۔ کانپور کے مقامی افسروں کی ناعاقبت اندیشی
کی وجہ سے مسلمانوں کے مجمع کو خلاف قانون قرار دیکر وہاں
گولی بھی چلا دی گئی تھی اور بہت سے مسلمان زخمی ہو گئے
تھے۔ ایک فنڈ قایم ہوا جس سے اس مقدمہ کی پیروی اور
مجروحین کی دیکھ بھال اور اُن کی اعانت مقصود تھی۔ اِس
فنڈ کی فراہمی میں حکیم اجمل خاں صاحب نے منجملہ اور سر
برآوردہ مسلمانوں کے نمایاں حصہ لیا۔ وہ قریب قریب ہر
ہفتہ مجھ کو اپنے ہمراہ لیکر دلّی سے کانپور جایا کرتے تھے۔
ایک روز زخمیوں کے دیکھنے میں ہسپتال کے ڈاکٹروں نے
کچھ مزاحمت کی اور اسسٹنٹ سول سرجن باوجود ہندستانی
اور مسلمان ہونے کے حکیم صاحب سے اور مجھ سے سخت
کلامی سے پیش آیا۔ میں غصہ سے لبریز تھا اور قریب تھا کہ
درشتی سے کچھ جواب دوں لیکن حکیم صاحب نے ہنس کر
میرے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا گو کہ یہ ہمارے ہندستانی
بھائی اور مسلمان ہیں لیکن گورنمنٹ کے غلام ہونے کی وجہ سے
معذور ہیں۔ اُن کی بدسلوکی پر ہمیں خیال نہ کرنا چاہیئے اور
جس کام کے لئے ہم آئے ہیں اُسے کرنا چاہیئے۔ اسسٹنٹ
سرجن صاحب کا غصہ تو فوراً ہی ٹھنڈا ہو گیا اور قبل اس
کے کہ ہم نے مریضوں کے معائنہ کا دورہ ختم کیا ہو ڈاکٹر

عبدالصمد صاحب کو ہمراہ لاکر اُن کی وساطت سے حکیم صاحب
سے اور مجھ سے معافی کے خواستگار ہوئے اور اس واقعہ
کے بعد سے اُن کا برتاؤ بالکل دوسرا ہو گیا۔"

بہت عرصہ کی سخت کشمکش کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے مسلمانوں کے عام جذبات کا اندازہ کرکے اُن کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم لکھتے ہیں کہ:-

"کانپور کی مسجد کے معاملہ میں بھی گورنمنٹ اور مسلمانوں
کے درمیان جو تصفیہ ہوا اُس میں حکیم صاحب کا ہاتھ تھا۔
اُنھوں نے نواب صاحب رامپور کو جن کے تعلقات
اُس زمانہ کے گورنر سر جیمس مسٹن سے بہت گہرے تھے
اور نواب صاحب ہی کے ذریعہ سے لارڈ ہارڈنگ
سے اس معاملہ کے سلجھانے میں پوری سعی اور کوشش کی۔
حکیم صاحب کا دماغ اس قدر سلجھا ہوا تھا کہ مشکل سے مشکل
اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کی تہ تک وہ فوراً پہنچ جاتے
تھے اور بگڑے ہوئے کام کے بنانے میں اپنی نظیر نہ
رکھتے تھے۔ وہ کسی معاملہ میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُس
کے ہر پہلو پر غور کرکے خوب سمجھ لیتے تھے اور اُس کے متعلق
ٹھنڈے دل سے تصفیہ کرتے تھے اور تب عمل پیرا ہوتے
تھے۔ اور جب کوئی قدم آگے بڑھاتے تھے تو پھر کبھی پیچھے
نہیں ہٹتے تھے۔"

اکثر ایسے مواقع پر حکیم صاحب اپنے اور نواب صاحب رامپور کے

تعلقات سے جو فائدے حاصل کر لیتے تھے وہ کوئی دوسرا نہ کرسکتا تھا۔ مسجد کانپور کے معاملہ میں تو حکیم صاحب کی کوششیں صرف نواب صاحب رامپور اور سر جیمس مسٹن ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ لارڈ ہارڈنگ سے اپنے ذاتی تعلقات کو بھی کام میں لائے اور بالآخر وسط اکتوبر میں خود ویسرائے کانپور آئے اور اُنہوں نے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر پانی ڈالا۔ اس طرف بہت کم لوگوں کی نظر گئی تھی کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے — طرابلس کی ڈکیتی، بلقان کی خونریزی، مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں بدعہدی اور کانپور کی زبردستی — یہ سب مواد فاسد ہے جو پھوڑے کے اندر جمع ہو رہا ہے اور آخر کار ہونا یہ ہے کہ یورپ میں جو آگ ترکوں کے خلاف لگائی گئی تھی وہی سارے یورپ کے بارود خانہ میں ایک چنگاری بن جائے۔

مسلم لیگ کا گرم لہجہ

۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو آگرہ میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت سر ابراہیم رحمت اللہ منعقد ہوا۔ اب تک لیگ کے جتنے اجلاس ہو چکے تھے اُن سب سے "گرم" یہی اجلاس تھا۔ نہ صرف خطبہ صدارت بلکہ اجلاس کی قراردادوں کا لہجہ بھی بہت بدلا ہوا تھا۔ صدر نے اپنے خطبہ میں چند ایسی باتیں صاف صاف کہیں جن کی نوک کافی تیز تھی۔ لیکن اُس وقت تک انگریزی حکومت کی کھال بھی کافی موٹی تھی۔ حکومت کی اصطلاحی "شان و اقتدار" کا ذکر کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ

> "پامال شدہ الفاظ "شان و اقتدار" کے بارے میں
> بحث کر کے میں آپ کا زیادہ وقت ضائع نہ کروں گا۔ گذشتہ

ایام میں ان الفاظ کے تصور پر اچھے محسوسات کی کس قدر
قربانی کی گئی ہے .... (حکومت) "مقتدر شان"
کی ایسی آرزومند ہے کہ اُس کا خیال ہے کہ ہندستان میں
اُس کے وقار کی عمارت مس ماڈ ایلن کے برہنہ رقص
سے بھی متنزل ہو جائے گی .... ممبران سول سروس
ہر وقت یاد رکھیں کہ وہ ہندستان کے نوکر ہیں اور عہدہ
داری کے زمانے میں اور اُس کے بعد ہندستان کے
نمک خوار ہیں۔

جنگ بلقان کے متعلق برطانوی حکومت کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے
اُنہوں نے فرمایا کہ:۔

"اس حالت میں جب بلند مقام وزرائے برطانیہ کی
طرف سے ایسے اور اس قسم کے اعلانات کئے جائیں تو
مسلمانان ہندستان کو کوئی برسرخطا نہیں کہہ سکتا اگر وہ یہ
نتیجہ نکالیں کہ انگلستان ترکی کے لئے بجائے عادل اور منصف
بننے کے عمداً خلافت اسلامی کا مخالف ہے اور اُن دول
کا ہم نوا ہو گیا ہے جو ترکی کی علانیہ طور پر دشمن ہیں۔"

اس کے ساتھ کچھ تھوڑا سا مسلمانوں کی وفاداری کا ذکر بھی تھا جو اُس
زمانہ میں ہر مطالبہ اور ہر شکوہ شکایت کا ضروری جزو ہوا کرتا تھا لیکن
ساتھ ہی حکومت خود اختیاری کا مطالبہ بھی اس زور سے کیا گیا جیسا کہ
کبھی پہلے نہ کیا گیا تھا۔

"تیس کروڑ سے زیادہ قوم کے افراد پر جو ہشیار فروں

اور مذاہب میں منقسم ہیں اپنا اقتدار قایم کرنے کے بعد انگلستان کی تاریخ میں قابل فخر وہ دن ہوگا جب وہ ان کو ...... خود اپنے اوپر خود حکومت کرنے کے قابل بنادیگا اس برِاعظم میں اس سرے سے اُس سرے تک امن و امان قایم کرنے کے لئے ہندوستان جس قدر تاج انگلستان کا زیر بار احسان ہے وہ اُس احسانمندی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو اُس وقت پیدا ہوگی جبکہ اس ملک میں انگلستان کا کام ختم ہوگا اور اس سرزمین کے فرزندوں کو اُن کی وراثت دی جائے گی۔"

یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ لیگ کے پلیٹ فارم پر فرقہ واری حقوق کے مطالبہ کے بجائے تیس کروڑ افراد کی "وراثت" کے واپس کئے جانے کا سوال اُٹھایا گیا۔ حکومت کے حلقوں میں اب یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ لیگ نوجوان عنصر کے قبضہ میں چلی گئی اور وفاداریوں کے پھندے سے نکلی جا رہی ہے۔ سر ابراہیم رحمت اللہ کے خطبہ صدارت نے اس گمان کی تصدیق کر دی۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ لیگ کے اس اجلاس میں نمایاں وہی اصحاب تھے جو ایک دو سال بعد ہی مطالبہ آزادی کے میدان میں بہت تیز قدم بڑھانے اور بہت سخت لہجہ اختیار کرنے والے تھے۔ مثلاً مسٹر مظہر الحق، فضل الحق، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں۔ آگرہ کا یہ اجتماع درحقیقت اُس کتاب کا دیباچہ تھا جس میں سنہ ۱۹ سے سنہ ۲۲ تک اور سنہ ۲۹ سے سنہ ۳۱ تک آزادی کی جدوجہد میں ہندستانی

مسلمانوں کی سوانح لکھی جانے والی تھی۔

مارچ ۱۳ھ میں طبی کانفرنس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا اور اس کے بعد لکھنؤ میں زیر صدارت گورنر صوبہ ایک شاندار جلسہ مجوزہ طبی کالج کے لئے مالی امداد حاصل کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا جو بہت کامیاب رہا۔ اس جلسہ سے فارغ ہونے کے بعد حکیم صاحب دہلی واپس آئے اور ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک میں مصروف ہو گئے چونکہ اس تحریک میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا اس لئے اس کے پس منظر کو مختصراً پیش کر دینا ضروری ہے۔

تحریک اصلاح ندوۃ

بانیٔ ندوۃ علامہ شبلی اور بعض اراکین انتظامیہ کے درمیان اختلافات بہت زیادہ پیدا ہو گئے تھے اور ان اختلافات کا اثر ندوۃ کے اندرونی انتظامات پر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ طلبا نے اسٹرایک کر دی تھی اور لکھنؤ میں ان حالات کی اصلاح کے لئے نواب علی حسن خاں کی تحریک پر ایک کمیٹی اصلاح ندوہ بنائی گئی تھی جس کے ایک رکن حکیم صاحب بھی تھے۔ دہلی میں حکیم صاحب نے ایک بڑی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا اور یہی فریقین کے درمیان کشمکش کا ایک بڑا محاذ بن گیا۔ مجوزہ کانفرنس کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لئے حکیم صاحب نے الہلال میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں انہوں نے اصلاح کی ضرورت اور اصلاح کے مطالبہ پر زور دیا اور مخالفین سے اپیل کی کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ اس مسئلہ کے متعلق مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی الہلال کے صفحات پر اپنا زور قلم صرف کیا اور عام مسلمانوں

کو یقین دلایا کہ حکیم صاحب اور دیگر اصحاب جو اس جلسہ کے محرک تھے اس کشمکش میں کسی فریق کے جنبہ دار نہ تھے بلکہ ایک قومی ادارے کے اصلاح چاہتے تھے۔ مولانا نے لکھا کہ

> درحقیقت قوم و ملت کا سچا درد اور ایک مفید دینی تعلیم کے کام کی بربادی کا غم ہی وہ چیز تھی جس نے ان بزرگوں کو ان تمام مشکلات کے برداشت کرنے پر آمادہ کیا ہے اور (بعض حضرات کی زبان میں) الہلال کی تحریک خواہ کتنی ہی ناپاک اور مفسدانہ ہو لیکن خدا ایسے بے غرض لوگوں کی مخلصانہ سعی کو کبھی بھی ناکام و خجل نہیں کر سکتا۔

دہلی میں ۱۰ مئی کا یہ جلسہ ایک بڑا ہنگامہ تھا۔ وہ قدیم و جدید علماء کے درمیان ایک معرکہ تھا جس میں علامہ شبلی مولانا آزاد اور حکیم صاحب کی کامیابی نے ایک بڑی اصلاحی تحریک کو بربادی سے بچا لیا۔ ورنہ معلوم تو یہ ہوتا تھا کہ قدامت پرست اور اقتدار پسند علما کی گرفت میں تحریک ندوہ کی حقیقی روح ختم کر دی جائے گی۔ حکیم صاحب نے اس جلسہ کے بعد اس کے نتائج پر اپنے ایک مضمون میں جو الہلال میں شائع ہوا تھا کسی قدر تفصیلی تبصرہ فرمایا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> ندوہ ایک ایسی تعلیم گاہ ہے جو اپنی تعلیمی خصوصیتوں کے لحاظ سے دوسری تعلیم گاہوں سے امتیاز رکھتی ہے ...... اس ندوہ میں بدقسمتی سے ایسی بے قاعدگی شروع سے چلی آتی تھی جو بتدریج اس کے اساس کو کمزور کر رہی تھی ...... یہ خرابیاں آہستہ آہستہ تمام ہندستان میں

پھیلنے لگیں اور بہت سے شہروں میں ندوہ کی جماعت
سے اصلاح کے مطالبے شروع ہو گئے...... ایسی
حالت میں ضرور تھا کہ مسلمانوں کا ایک قایم مقام جلسہ
کسی شہر میں جمع ہو کر اس ناگوار حالت کو دور کرے۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے بتایا کہ کس طرح اس اصلاحی تحریک کی مخالفت کی گئی اور اُس کو روکنے اور مجوزہ جلسے کو برہم کرنے کے لئے سازشیں کی گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر حکیم صاحب پوری طرح اس اصلاحی تحریک کی تائید نہ کرتے تو دہلی میں اس جلسہ کا کامیاب ہونا ناممکن ہو جاتا اور باوجود مولانا شبلی کی جدوجہد کے ندوہ کی تحریک برباد ہو جاتی۔

مسلم یونیورسٹی

ندوۃ کی اصلاحی تحریک کے ساتھ ہی ساتھ مسلم یونیورسٹی کا قضیہ بھی بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس قضیہ کی تفصیل اپنی یادداشت میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

علی گڈھ یونیورسٹی کے قیام کے متعلق گورنمنٹ کے اعلیٰ
افسران نے ابتدا میں بہت کچھ وعدے وعید کئے تھے اور
فراہمی چندہ میں معقول امداد بھی دی تھی مگر ۱۴ء میں جبکہ
ایک کثیر رقم جمع ہو گئی اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کے
بنانے کا مسئلہ زیر غور تھا تو سر ہارکورٹ بٹلر جو اُس وقت
گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر شعبہ تعلیمات تھے اور جو اپنے
کو مسلمانوں کا بہت خیر خواہ ظاہر کرتے تھے مسلمانوں کے
خلاف ہو گئے اور قانون اساسی میں ایسی دفعات داخل

کرنے کے متعلق نوٹ لکھا جس سے گورنمنٹ کے اختیارات
بہت زیادہ سخت اور یونیورسٹی پر حکومت کا پورا اختیار
اور قبضہ ظاہر ہوا۔ یونیورسٹی کا خواب جو مسلمانوں کے
دلوں میں تھا کہ وہ مثل قرطبہ کے اسلامی تہذیب و شائستگی
اور علوم و فنون کا ایک عدیم المثال مرکز ہوگا جس میں تمام
ہندستان کے مسلمانوں کے اسکول اور کالجوں کا الحاق
ہوگا الحاق کے اختیارات کو بالکل سلب کرکے معدوم
کردیا گیا۔ مسلمانوں میں نہایت مایوسی اور رنج و غصہ تھا
اور ان کے تعلیم یافتہ اور نوجوانوں کے فرقہ احرار نے
ایسی یونیورسٹی کے لینے سے قطعاً انکار کردیا تھا۔ تمام ملک
میں اس کے متعلق ایجی ٹیشن تھا اور ایک طرف حکومت
کے حامیوں کی ایک جماعت تھی جو مسلمانوں کو ایسی یونیورسٹی
قبول کرنے کی ترغیب دے رہی تھی اور دوسری طرف
احرار اس کی مخالفت کررہے تھے۔ نواب وقار الملک
حکیم اجمل خاں، محمد علی اور شوکت علی گروہ احرار کے لیڈر
تھے۔ علی برادران کی نظربندی کے بعد اور نواب وقار الملک
کی کالج کے عہدہ سکرٹری سے علٰحدگی اور خانہ نشینی کے بعد
حکیم صاحب تنہا اس پارٹی کے لیڈر رہ گئے تھے۔ دوسری
طرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب فضل اللہ خاں
نواب اسحٰق خاں، اور سر علی امام وغیرہ تھے۔ علی گڈھ میں
ٹرسٹیان کالج کا ایک جلسہ ہوا جس میں بڑی کوشش اور

سرگرمی کے ساتھ دونوں قسم کے خیال کے ٹرسٹی جمع کئے گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کے مسودہ میں بہت اہم ترمیمات احرار پارٹی کی طرف سے پیش کی گئیں اور باوجودیکہ احرار کی تعداد جماعت ٹرسٹیان میں بہت کم تھی لیکن حکیم صاحب کی رہنمائی میں اُنہوں نے ایسی کامیابی حاصل کی کہ قریب قریب کل ترمیمات منظور کرالیں اور اپنے مقدمہ کو اس سنجیدگی اور قابلیت سے پیش کیا کہ مخالفین کو منظور کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ آخر میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو کہ اُس وقت کے ممبر تعلیمات سر سنکرن نائر کے ساتھ بیٹھ کر یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن تیار کرنے شملہ گئی۔ اس کمیٹی میں بجز ایک ممبر نواب اسحٰق خاں کے باقی سب جماعت احرار کے لوگ تھے یعنی حمید اللہ خاں (حال نواب بھوپال) مسٹر مظہر الحق، مسٹر محمد علی جناح، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ حکیم صاحب اس کمیٹی کے ممبر صرف اس لئے نہ تھے کہ انگریزی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اُنہوں نے خود ہی اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا تھا لیکن وہ برابر ہمارے مشوروں میں شریک رہتے تھے اور اپنی سنجیدہ اور گہری نظر کی وجہ سے بہت مفید ثابت ہوتے تھے۔

. . . .

باوجود ان تمام کوششوں کے یونیورسٹی کا تخیل جس قدر مسخ کیا گیا اور اس

کام میں خود مسلمانوں کے بعض لیڈروں نے جس طرح حکومت کا ساتھ دیا یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اس کے بیان کرنے کا نہ یہ محل ہے اور نہ ان اوراق میں اتنی گنجائش ہے۔ بہرحال جس طرح ایک اپاہج اور مفلوج یونیورسٹی مسلمانوں کے سر تھوپی گئی اور جس طرح حکومت پرستوں کے زیر اقتدار وہ برباد ہوئی، اُس کا پورا نقشہ آج ہماری نظر کے سامنے ہے۔ جس وقت ہندستان میں یہ قضیہ جاری تھا اور حکیم صاحب ایک طرف تو طبیہ کالج کی تحریک میں اور دوسری طرف یونیورسٹی کے جھگڑے میں مصروف تھے یورپ میں قتل و غارت اور خون اور فولاد کے بادل ہر طرف سے گھر کر آرہے تھے۔ جنگ بلقان میں اور اُس سے پہلے جنگ طرابلس میں دول یورپ کی جن دراز دستیوں نے ترکی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا تھا وہی اب دول کے لئے عذاب جان بن رہی تھیں۔ اُن تدبیروں کا اب الٹا عمل شروع ہو گیا تھا جو ترکوں اور دوسری ایشیائی قوموں کو برباد کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھیں۔ ہندستان میں بھی آتشگیر مادہ جمع ہو رہا تھا اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ عام طور پر تمام ہندستانیوں میں برطانیہ اور دیگر دول کے متعلق بددلی بہت بڑھ چکی تھی۔

کوماگاٹومارو

چنانچہ ہندستانی تارکان وطن کا ایک جہاز کوماگاٹومارو جب کناڈا کے ساحل پر پہنچا جو سلطنت برطانیہ کی ایک نوآبادی تھی تو ان لوگوں کو ساحل پر نہ اترنے دیا گیا اور بہ جبر ہندستان واپس جانے پر مجبور کیا گیا۔ ۳۷۶ ہندی مسافر جو اس جہاز پر سوار تھے وہ تھے جن کو حکومت پنجاب کے نئے قوانین نے ترک

وطن کرنے اور سلطنت برطانیہ کی نوآبادیوں میں وجہ معاش تلاش کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے لیڈر سردار گردت سنگھ تھے۔ یہ جماعت بہت مایوس اور ناراض ہو کر ہندستان واپس آئی۔ اُس کے جذبات کا اندازہ سردار گردت سنگھ کے اِن الفاظ سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے انگریزوں کو مخاطب کرکے کہے تھے کہ

"تم لوگ ہمارے ملک میں حاکم بننے کے لئے آتے ہو
اور ہم تمہارے یہاں صرف قلی بننے کے لئے جاتے ہیں اُس
پر بھی تم ہمیں اپنے ملک میں گھسنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

مایوسی نفرت اور غصہ کے اِن جذبات کے ساتھ جب اِن لوگوں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ بج بج میں نظربند کردیے گئے اور وہیں ایک سخت بلوہ ہوا جس میں پولس اور فوج کی گولیوں سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس واقعہ نے ہندستان میں لوگوں کو مشتعل کردیا اور پنجاب میں خصوصاً ہر طرف دار وگیر شروع ہوگئی۔

یہی زمانہ تھا جب اسٹریا کا ولی عہد ایک سروی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اُس کے خون کے ہر قطرہ نے یورپ سے خون کے دریا مانگے۔ بسمارک کہہ گیا تھا کہ "بلقان کے کوہ آتش فشاں کا ایک شرارہ تمام یورپ میں آگ لگادے گا۔" وہی ہوا اور آگ اور خون کا ایک سیلاب مغربی سامراجیوں کے گھروں میں داخل ہوگیا۔

جنگ یورپ شروع اگست میں دول نے ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندستانیوں کے جذبات وفاداری کے مظاہروں کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہندستان کے مسلم اور غیر مسلم طرابلس کو بھول گئے، بلقان کو بھول گئے، مسجد کانپور کو بھول گئے اور کوماگا ٹومارو کو بھی بھول گئے۔ وفاداری اور خیرسگالی کے نقارے پٹنے لگے۔ حکیم اجمل خاں اور اُن کی طرح جماعت احرار کے دوسرے لیڈر بھی ابھی وفاداریوں کے طلسم خیال کی حدود سے باہر نہ تھے۔ اُن سب نے (جن میں محمد علی اور انصاری بھی شامل تھے) محسوس کیا کہ اس وقت برطانیہ کی امداد کرنا خود اپنے ملک کی امداد کرنا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنگ میں جو اعانت سرکار کی کی جائے گی وہ جنگ کے بعد مزید سیاسی حقوق کے حاصل ہونے کا باعث ہوگی۔ چنانچہ ۱۶ راگست کو دہلی کے ٹاؤن ہال میں اظہار وفاداری کے لئے جو جلسہ عام منعقد ہوا اُس میں حکیم صاحب مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے اپنے اہلِ ملک کو وفاداری اور تعاون کی تلقین فرمائی۔ اس طرح پہلی جنگ یورپ کا آغاز ہندستان میں اُن لوگوں کی وفاداری کے اعلان سے ہوا جو چند روز بعد اس شیوۂ وفاداری اور نیازمندی سے بازگشت کرنے والے تھے، اُس وقت وفاداری کے اس عہد و پیمان کی صبح اپنی شام سے بے خبر تھی۔ اجمل خاں، محمد علی اور انصاری ۱۶ راگست کو وفاداری اور خیرسگالی میں اپنے جس خلوص کا مظاہرہ کر رہے تھے وہی کامل خلوص بہت جلد انگریز کے مقابلہ میں جنگ آزادی کا نشان بننے والا تھا۔ ملکوں اور قوموں کی تاریخیں کس طرح بنتی ہیں اور کون اُن کو بناتا ہے اور کدھر سے ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور کس طرف اُڑا کر لے جاتے ہیں، یہ سب امکانات عاقبت اندیشی اور دوربینی کی زیادہ سے زیادہ وسعت

سے بھی باہر رہتے ہیں۔ بساطیں الٹ جاتی ہیں اور وہ ہاتھ نظر نہیں آتا جس نے بساط کو اُلٹ دیا! بڑے بڑے مجاہد زندگی کی رنگین محفلوں میں بیٹھے ملتے ہیں اور دیبا اور مشجر کی چادروں کے نیچے ننگی تلواریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دہلی کے ایک خاندانی رئیس کو جس کسی نے ۱۴ء میں اور اُس سے پہلے دیکھا تھا اُس نے ۱۷ء میں اُن ہی اجمل خاں کو کس قدر حیران ہو کر دیکھا ہوگا!۔

۱۴ء کے آخری مہینوں میں حکیم صاحب جنگ کے امدادی کاموں میں بہت مصروف رہے۔ ۱۵ء کی پہلی جنوری کو حکومت نے انہیں قیصر ہند کا طلائی تمغہ دیکر اُن کی طبی خدمات کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اُن کی وفاداری کو پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کرنے کی ایک تدبیر اختیار کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے دامن کا جو ایک ذرا سا کونہ اُس وقت تک حکیم صاحب کے ہاتھ میں باقی رہا تھا اُس کو بھی جنگ کے انقلاب انگیز حالات اور ممالک اسلامیہ کے مصائب نے اُن کے ہاتھ سے بہت جلد کھینچ لیا۔ مغربی تہذیب و تمدن کا جو کچھ اعتبار اُن کی نظر میں باقی تھا وہ جنگ یورپ کے دوران میں نہ صرف ختم ہو گیا بلکہ نفرت اور حقارت میں تبدیل ہو گیا۔

جنگ شروع ہونے کے دو ہی تین ماہ کے اندر بلجیم کے بیشتر مقامات پر جرمن فوجیں قابض ہو چکی تھیں اور روس اپنی شکستوں کا با دلِ ناخواستہ اعتراف کر رہا تھا۔ فرانس اور روس ہر چال پر بازی ہار رہے تھے خود ہندستان کے دروازے تک ایمڈن کے گولے برسنے لگے تھے اور وفا شعار ہندستانی رعایا بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ دشمن کو جس قدر

کمزور اور ذلیل ظاہر کیا جاتا ہے وہ اتنا کمزور اور ذلیل نہیں ہے اور نہ سرکار اتنی قوی ہے جس قدر کہ مشہور کی جا رہی ہے۔ کہیں کہیں عام وفاداری کی دیواروں میں جو رخنے پیدا ہو رہے تھے اُن کو روکنے کی جو تدبیریں حکومت نے اختیار کیں وہ ایسی تدبیریں تھیں جو ہمیشہ مقصود کے خلاف اثر پیدا کیا کرتی ہیں اور جس چیز کو روکنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں اُسی کی اعانت کرتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں پریس ایکٹ کی سخت گیریوں نے زیادہ تر آن اسلامی حلقوں میں بے چینی پیدا کر دی جو ترکی اور مصر کے ساتھ انگلستان کے طرز عمل سے بھڑکے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے ایسے نمایاں جرائد کی ضمانتیں جیسے کہ الہلال، ہمدرد، اور کامریڈ تھے ضبط کر لی گئیں۔ عام مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ باوجودیکہ محمد علی آخر وقت تک اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ترکی اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کرے لیکن سب سے پہلے اُن ہی پر سرکار کے استبداد کی ضرب لگی۔ یکم نومبر ۱۴ء کو ترکی اور برطانیہ کے درمیان اعلانِ جنگ ہوا اور پانچ ہی دن بعد ہمدرد اور کامریڈ کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ ساتھ ہی قانون تحفظ ہند نافذ کر دیا گیا اور اُس کی زد میں بھی مسلمان لیڈر ہی آنے لگے۔ آخر مارچ ۱۵ء میں ظفر علی خاں نظر بند کر دئے گئے۔ مئی میں محمد علی اور شوکت علی کو مہرولی میں، پھر جون میں لینسڈاون میں اور چار مہینے بعد چھندواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ سینکڑوں دوسرے مسلمان بھی اسی طرح قید یا نظر بند کر دئے گئے۔ حکومت کا یہ روز افزوں جبر و استبداد اجمل خاں جیسے خاموش اور سنجیدہ لوگوں کو بھی اب ترک وضع پر آمادہ کر رہا تھا۔ حکیم صاحب کے خلاف بھی حکومت

کے دفاتر میں یہ گمان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ یا تو حکومت ہند کے خلاف افغانستان سے کچھ ساز باز کر رہے ہیں یا کم از کم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر افغانستان ہندستان پر حملہ کرے تو اُس کا خیر مقدم کریں۔

۱۵ء کے وسط میں حکیم صاحب امداد جنگ کی جدوجہد سے تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے اور زیادہ تر اپنی طبی تحریک کے کاموں میں مصروف رہے۔ ماہ مارچ میں ایک عظیم الشان طبی کانفرنس پٹنہ میں ہوئی اور آخر سال میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس عین دورانِ جنگ میں منعقد ہوا اور اس لحاظ سے یادگار رہے کہ اوّل تو مسٹر مظہر الحق نے جو اجلاس کے صدر تھے حکومت پر زیادہ سختی سے نکتہ چینی کی اور دوسرے یہ کہ لیگ نے کانگریس کی طرف پہلا قدم اُٹھایا جو آگے چل کر بہت امید افزا نتائج پیدا کرنے والا تھا۔

مسٹر مظہر الحق نے جن الفاظ میں اپنی قوم کو پیامِ عمل دیا وہ لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ:۔

> اس دنیا میں ساکت اور بے حرکت رہنا ممکن نہیں۔ یا ہم آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ ہمارا فرض ہے کہ صحیح سمت میں بڑھتے چلے جائیں ورنہ ہم کبھی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔
>
> ....
>
> انگلستان نے ہندستان کا بوجھ اُٹھایا مگر اُس کو اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل نہیں بنایا۔ انگلستان نے ہندستان کو مضبوط قوی اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والا نہیں بنایا۔

اُس نے ہم کو ایسی قوم نہیں بنایا جس کی اقوام عزت کریں

. . . .

اپنے اوپر اور خدا پر بھروسہ کرو، بیخوف دل اور مستحکم عزم کے ساتھ آگے بڑھو اپنے اُس مقدر کی طرف جو سامنے ہے...... مت رکو اور مت ٹھہرو!

. . . .

مظہرالحق کی یہ آواز آنے والے پندرہ برس میں ہندستان کے ایک ایک کونے میں گونجی۔ حکیم صاحب اس تاریخی اجلاس میں شریک تھے بمبئی کے قدامت پسندوں کو لیگ کے خیالات کی یہ پرواز پسند نہ تھی اور حکومت کے کانوں پر بھی لیگ یہ آواز گراں گذرنے لگی تھی۔ چنانچہ بمبئی کے اجلاس کو برہم کرنے کی تمام مفسدانہ تدبیریں اختیار کی گئیں اور جلسہ گاہ میں فساد کی صورت پیدا کر کے شرکار جلسہ کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنا جلسہ تاج محل ہوٹل میں منعقد کریں۔ اوّل تو مظہرالحق کی آواز ہی نے ان قدامت پرستوں اور حکومت کے نیازمندوں کو پریشان کر دیا تھا اور پھر جب یہ معلوم ہوا کہ لیگ اب کانگریس سے کچھ مشورے کرنا چاہتی ہے تو خطرات کا ایک بہت بڑا بھوت ان لوگوں کے دماغ میں سما گیا۔ اس میں شک نہیں کہ لیگ کے لیڈروں نے اس موقعہ پر بہت مضبوطی سے قدامت پرستوں کا مقابلہ کیا اور یا آلاخر اس غرض کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی کہ وہ کانگریس کے لیڈروں سے گفتگو کر کے کوئی مشترک لائحہ عمل طے کرے۔ اس کمیٹی کے اراکین میں دہلی کے تین نمایندے تھے، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری

اور مسٹر محمد علی۔ یہ پہلا قدم تھا جو لیگ نے مشترکہ اور متحدہ قومی سیاست کے نصب العین کی طرف اُٹھایا۔ لیگ کے اس سیاسی اقدام میں آگے بڑھنے والوں کی پہلی صف میں حکیم صاحب تھے۔

سنہ ۱۹۱۶ء شروع جنوری میں بمبئی سے واپس آکر حکیم صاحب چند روز دہلی اور رام پور میں مقیم رہے اور اُس کے بعد رام پور میں منعقد ہونے والی طبیہ کانفرنس کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

اس اجلاس کے میزبان والئ رام پور نواب حامد علی خاں تھے۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب نے میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف پھر آواز بلند کی اور اعلان کیا کہ وہ "طبی علوم و فنون کے بقا اور حقوق کی نگہداشت" کے لئے اپنی ذات کو وقف کر چکے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے فن کی حفاظت کے لئے حکیم صاحب کی یہ جد و جہد ایک بڑا احسان ہے جو انہوں نے طب یونانی پر کیا۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ صوبوں کے حکام اعلیٰ اطبار یونانی کے متعلق کہہ رہے تھے کہ "یہ لوگ موت کے جراثیم پیدا کرتے ہیں"[۵] اور میڈیکل ایسوسی ایشن نے تو اپنی یادداشت میں صاف لکھدیا تھا کہ "طب یونانی اور ویدک وحشیانہ اور غلط طبیں ہیں"۔ حکیم صاحب سے کم درجہ کا آدمی تو شاید اس جد و جہد میں تھک کر بیٹھ رہتا مگر وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ اُن ہی کوشش سے ۱۶ء میں نواب اسد علی نے امپریل کونسل میں طب قدیم کی حمایت میں ایک رزولیوشن پیش کیا اور پھر حکیم صاحب ہی کی ذاتی اثرات کے تحت حکومت نے اُسے منظور کر لیا۔

---

۵ گورنر بمبئی۔

طبیہ کالج کا سنگ بنیاد طب یونانی و ویدک کی بقا و ترقی کے لئے حکیم صاحب کی کوششوں کا ایک نمایاں نشان راہ طبیہ کالج کا سنگ بنیاد تھا جسے ۲۹ مارچ کو لارڈ ہارڈنگ نے نصب کیا۔ زمانہ کے انقلابات کے مستقبل کا صحیح اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ کسے معلوم تھا کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد شہنشاہ برطانیہ کے نائب لارڈ ہارڈنگ رکھ رہے تھے اُس عمارت کا افتتاح حکومت برطانیہ کے سب سے بڑے مدمقابل مہاتما گاندھی کے ہاتھ سے ہوگا۔ اپنی زندگی کے اتنے بڑے انقلاب سے حکیم صاحب ۲۹ مارچ سنہ ۱۶ کو یقیناً واقف نہ تھے اور نہ انہیں اس وقت یہ معلوم ہوگا کہ طبیہ کالج کی تعمیر کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی زندگی کی بھی ایک جدید تعمیر شروع ہوگی ہے۔ اسی دوران میں حکیم صاحب نے طبیہ کالج کا نصاب بھی تیار کرالیا اور کالج کی تعلیم کے لئے بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی تیار ہوگئے۔ اُس وقت یونانی اطبا میں دو گروہ موجود تھے، ایک کہتا تھا کہ یونانی بجائے خود مکمل ہے اور اُس کی تعلیم میں کسی اضافہ اور ترمیم کی ضرورت نہیں دوسرا گروہ حکیم صاحب کا ہمخیال تھا اور وہ کہتا تھا کہ جدید طب مغربی سے جدید تحقیقات کے نتائج کو طب یونانی میں شامل کرنا ضروری ہے۔ اسی اصول کے مطابق حکیم صاحب نے طبیہ کالج کا نصاب مرتب کیا۔ اسی سال اگست میں کالج کی شاخ ایور ویدک بھی قایم کردی گئی۔

مدرسہ معینیہ اجمیر شروع جون میں حکیم صاحب دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر کے سالانہ جلسہ کی صدارت کرنے

گئے۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر فرمائی اُس کے بعض گوشے صرف اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ مشائخ وصوفیا کے متعلق اور اُن کے مذہبی مدارس کے طریقہ تعلیم کے متعلق بھی حکیم صاحب کے خیالات معلوم ہو جائیں۔ اس تقریر میں اُنہوں نے فرمایا کہ

"ہمارے علوم کے تنزل میں ایک حد تک نصاب تعلیم کے انتخاب کو بھی دخل ہے۔ متاخرین کی کتابیں ہر ایک فن میں کثرت کے ساتھ لی گئی ہیں اور اُن کتابوں کو چھوڑ دیا گیا ہے جنہیں پڑھ کر متاخرین کا یہ پایہ علم اس قدر بلند ہوا...... میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کو ہر ایک فن میں ایسی کتابیں ملیں گی جن کا بعض موجودہ درسی کتابوں کی جگہ نصاب میں داخل کرنا طلبہ اور مدرسہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے........

میں سمجھتا ہوں کہ تمام ہندستان میں مدرسہ معینیہ ہی پہلا مدرسہ ہے جس میں تصوف کو باقاعدہ نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے ورنہ اس ضروری علم کو جو روح جیسی شریف چیز سے تعلق رکھتا ہے ہم لوگوں نے باوجود اعتقاد رکھنے کے ناقدردانی کے ہاتھوں میں دے رکھا ہے۔ آپ کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ یہ علم محض علم کی طرح مدرسہ میں نہ پڑھایا جائے بلکہ اُس کی تعلیم ایک ایسی ذات کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے جس کا علم ہمدوش عمل ہو ورنہ صرف تعلیم سے اُس کی غایت مقصود حاصل نہیں

ہو سکتی"۔

خود حکیم صاحب کی طبیعت کا رجحان بہت زیادہ تصوف کی طرف تھا۔ اسی لئے وہ معتقدات مذہبی کے جھگڑوں سے بہت بیزار رہتے تھے۔ اور جب کسی مذہبی تحریک میں حصہ لیتے تھے تو وہ ایسی ہوتی تھی جو نزاعی نہ ہو۔ ندوہ کی تحریک کو وہ صرف اسی لئے پسند کرتے تھے کہ اُس کے بانی اور کارکن ایسے وسیع النظر لوگ تھے جو عقاید کی بحثوں سے اپنے کو علیٰحدہ رکھتے تھے۔ نظارہ المعارف قرانیہ کے مذہبی پہلو سے وہ اسی لئے مانوس تھے کہ اس تحریک کے بنیادی مقاصد عقائد کی بحثوں سے بے تعلق تھے۔ ۲۶ رجون کو نظارہ المعارف کا پہلا عام جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اُس جلسے کے صدر حکیم صاحب تھے۔ وہ اس ادارہ کے اعلیٰ مقصد کے اس درجہ معترف تھے کہ اُنہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ :۔

> روئے زمین پر کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جو اغراض و مقاصد نظارہ سے سرمو تجاوز و انحراف کرے اور پھر وہ اسلام کا دعوےٰ بھی کر سکے"۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر مولانا عبیداللہ کو دوران جنگ میں ہندستان سے بھاگ کر افغانستان میں پناہ نہ لینی پڑتی تو اُن کی یہ تحریک بلاشبہ بہت موثر اور انقلابی تحریک ثابت ہوتی۔ جس وقت جنگ کی شدت بہت زیادہ تھی اور نظارہ المعارف کا کام دہلی میں جاری تھا مولانا عبیداللہ سرکار کے محکمہ خفیہ کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور بالآخر اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے انہیں ترک وطن کرنا پڑا۔ جنگ کی

صورت یہ تھی کہ آئرلینڈ نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا جس کی وجہ سے برطانیہ میں ایک داخلی محاذ جنگ قایم ہو گیا تھا۔ عراق، عرب میں برطانوی فوجیں شکستوں کی ذلت کے بعد بھی فتح کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔ درہ دانیال کے بحری معرکہ میں جو شکست برطانیہ کو ہوئی تھی اُس کا داغ مٹانے کی کوشش سازشوں کے ذریعہ سے کی جا رہی تھی اور عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوششیں جاری تھیں۔ "اتحاد عربی" کا ایک بظاہر نہایت خوش نما تخیل عربوں کے سامنے رکھا گیا تھا اور اُن کو امیدیں دلائی گئی تھیں کہ تمام عربی ممالک آزاد کر دئے جائیں گے۔

شریف مکہ کی بغاوت

ان سازشوں کا پہلا شکار شریف مکہ تھا۔ وہ پہلی مچھلی تھی جو ممالک عرب میں برطانوی تدبر کے کانٹے میں اٹکی۔ آزادی اور سیاسی اقتدار کے جو سبز باغ اُس کو دکھائے گئے اُن کی وجہ سے آخر کار اُس نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان ترکوں کی شکست کا آغاز تھا۔ اگر جنگ کے آخری دور میں ترکوں کے ملک میں ایک صحت بخش سیاسی انقلاب پیدا نہ ہوا ہوتا تو عربوں کی یہ بغاوت دنیا سے آل عثمان کا نام و نشان مٹا دیتی۔ نومبر ۱۶ء میں عربوں کی بغاوت شروع ہوئی۔ اس سے پانچ مہینے پہلے اتحادی دول عرب۔ شام و عراق میں اپنا اپنا حصہ مقرر کر چکی تھیں۔ یہ خفیہ معاہدہ بعد میں ظاہر ہوا۔ اگر نومبر ۱۶ء میں عربوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ پانچ ماہ پہلے ہی یورپ کے کفن چور اُن کے ممالک کو آپس میں تقسیم کر چکے ہیں تو شاید عربوں کی بغاوت

نہ ہوتی اور نہ جنگ یورپ میں اتحادیوں کے تدبر کے وہ نتائج پیدا ہو سکتے جو بعد میں پیدا ہوئے۔

شریف مکہ کی بغاوت نے دفعتاً ہندستان کے مسلمانوں پر یہ خطرناک حقیقت واضح کر دی کہ اب اُن کے اماکن مقدسہ خطرہ میں ہیں اور یہ کہ شریف کی بغاوت ارض مقدس میں یورپین دول کے تسلط کا پیش خیمہ ہے۔ ہندی مسلمانوں کے صبر و سکون میں یہ ایک ایسی چنگاری گری جس نے سارے ملک میں آگ لگا دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس بغاوت میں اصلی ہاتھ برطانیہ کا ہے اعتدال اور سیاسی احتیاط کے بہت سے چشمے خشک ہونے لگے۔ ۲ جولائی کو مسجد فتحپوری میں مسلمانوں کا جو اجتماع ہوا اُس میں امام مسجد جامع اور امام مسجد فتحپوری جیسے نیاز مندانِ حکومت بھی برسر میدان آ گئے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کے علاوہ متعدد سیاسی لیڈر اس اجتماع میں موجود تھے۔ غالباً یہی نقطہ ہے جہاں سے ملک کی سیاست میں مذہبی جماعتوں کی شرکت کا آغاز ہوا۔ خالص سیاسی محاذ پر بھی قانون تحفظ ہند اور پریس ایکٹ کی جابرانہ گرفت نے جو مادہ پکا دیا تھا وہ پھوٹ پڑا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے حلقوں میں ایک عام سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ مدراس میں مسز اینی بیسنٹ نے جن کا شمار اُس وقت تک سیاسی "معتدلین" میں ہوتا تھا ہوم رول لیگ کے نام سے ایک انجمن قایم کر دی جس میں مسٹر تلک بھی اُن کے شریک کار ہو گئے۔ مسز بیسنٹ اپنی اس سیاسی جد و جہد کی وجہ سے بالآخر قانون تحفظ ہند کا شکار ہوئیں۔ اُن کی گرفتاری نے سیاسی تحریک میں کچھ اور زیادہ روح

پیدا کر دی۔ کانگریس اور لیگ کے لیڈروں نے اب طے کر لیا کہ جنگ کے بعد دنیا میں جو نظم قایم ہونے والا ہے اُس میں ہندستان کے حقوق کا تعین کرا لینا ضروری ہے۔ ۱۶ء کے آخر میں ویسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ۱۹ اراکین نے ایک متفقہ مطالبہ پیش کر دیا جس کی تائید کانگریس اور لیگ نے کی۔

مہاتما گاندھی

اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی (جو اُس وقت صرف مسٹر گاندھی تھے) ہندستان آ چکے تھے۔ پہلی دفعہ جب وہ بنارس یونیورسٹی کے جلسہ میں شریک ہوئے تو اُنھوں نے اپنی تقریر میں ویسرائے کی آمد پر پولس کے جو انتظامات کئے گئے تھے اُن پر اعتراض کیا اور بعض فقرے والیانِ ریاست کے متعلق بھی کہے جن میں بعض اُس وقت جلسہ میں موجود تھے۔ حق کی پہلی آواز گو کہ نرم تھی لیکن وفاداران سرکار کو اس قدر تلخ معلوم ہوئی کہ والیانِ ریاست تو جلسہ سے اُٹھ کر چلے گئے اور جلسہ برخاست کر دیا گیا۔ یہ گویا پہلا اشارہ تھا دو طبقات کی آویزش کا۔ ایک طرف گاندھی جی کی آواز میں ہندستان کے عوام کا وجود تھا اور دوسری طرف خفا ہو کر اُٹھ جانے والے راجوں مہاراجوں کی پگڑیوں کے ہلتے ہوئے زرکار طروں میں ایک چراغِ سحری کی بھڑک تھی۔ اُسی دن پہلی دفعہ ان دونوں کے درمیان جدائی کے اشارے ہوئے اور اس لحاظ سے بنارس یونیورسٹی کا یہ جلسہ اور اُس میں گاندھی جی اور ہندستان کے جاگیرداری نظام کا پہلا آمنا سامنا یادگار رہے گا۔

لیگ و کانگریس کا اتحاد

آخر دسمبر ۱۶ء میں یہ عام فضا تھی جب

مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ جلسے ایک ہی جگہ لکھنؤ میں منعقد ہوئے لیگ کے صدر اُس وقت مسٹر جناح تھے جو ہنوز قیادت عظمےٰ کی منزل سے بہت دور تھے۔ اُس وقت وہ وطن پرستی کے سانچے میں اپنے تصورات کو ڈھالا کرتے تھے۔ کس کو معلوم تھا کہ لکھنؤ کی سرزمین پر ان دو قومی جماعتوں کے اتحاد کے اس پہلے اقدام میں ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود کا کوئی تخم کہیں پوشیدہ تھا۔ ہندو اور مسلم قوم پرستوں کی جماعت کے بہترین افراد اس موقعہ پر موجود تھے۔ درحقیقت لیگ کا یہ نواں سالانہ اجلاس ہندستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ اسی دن سے سرسید کی قدیم پالیسی کا خاتمہ ہوا اور ملک کی عام سیاسی زندگی میں مسلمانوں کا مقام معین ہوا۔ بے محل نہ ہوگا اگر خطبہ صدارت کے چند اقتباسات نقل کر دیئے جائیں۔ ان اقتباسات کی معنوی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ یہ الفاظ مسٹر جناح کی زبان سے نکلے تھے:۔

"حیوانی جذبات کی روشن بھٹی میں، چھوٹی چھوٹی چیزیں جل کر خاک سیاہ ہو رہی ہیں اور زر خالص کھوٹ سے جدا ہو رہا ہے۔ اور جب یہ خوفناک امتحان ختم ہو جائے گا تو وہ روح جو اس کے بعد آزاد ہوگی راحت پائے گی اور اُس کو مستقبل کی زندگی کے لئے آزاد حالات اور وسیع تر میدان بنانے اور پیدا کرنے کی قوت حاصل ہوگی ...."

وہ قوت حاصل ہوئی لیکن اُسے غلط اور خطرناک طریقہ سے استعمال کیا

گیا - یہ بحث جدا گانہ ہے۔ اُس وقت تو مسٹر جناح فرما رہے تھے کہ

"اگر ہندستان کے لوگ فطرت کے اچھوت نہیں ہیں، اگر وہ اُن قوانین کی حدود سے باہر نہیں ہیں جو دنیا میں اور جگہ رائج ہیں اگر اُن کے دماغ علم کی قوت سے ترقی کر سکتے ہیں اور سوچ سکتے ہیں اور اپنی تنظیم کر سکتے ہیں اور سب کو مجتمع کر کے حال کی ضروریات اور مستقبل کی اجتماعی امیدوں کے لئے تیاری کر سکتے ہیں تو پھر اُن کے لئے ایک ہی مستقبل ہے اور وہ حکومت خود اختیاری کا مستقبل ہے یعنی ایسی قوت کا حصول جو مناسب اور منظم ذرائع سے قوم کے اجتماعی ارادوں کو میدان عمل میں لا سکے .... قدرت کا قانون اور عام انسانیت کے اصول مشرق و مغرب میں مختلف نہیں ہیں........."

تاریخ کا یہ ایک بڑا حادثہ ہے کہ قدرت کا قانون اور عام انسانیت کے اصول جو مشرق و مغرب میں مختلف نہ تھے تیس سال بعد اس طرح ہٹ گئے کہ اُنہوں نے خود ہندوستان کی وحدت کے دو ٹکڑے کر ڈالے اور اُن کے درمیان کوئی عنصر بھی مشترک نہ رہا! اور پھر اس تقسیم کے نظریہ نے راوی کے کنارے سے گنگا اور جمنا کے ساحل تک خون کی جو ندیاں بہائیں اُن کا تو ذکر بھی شرمناک ہے۔

بہرحال لیگ کا بڑا کارنامہ ۱۶ء میں یہی تھا کہ اُس نے آیندہ اصلاحات کے لئے ہندو مسلمانوں کی متفقہ تجاویز مرتب کر لیں اور

کانگریس کے لیڈروں کے مشورے سے ایک ایسا متفقہ دستور العمل تیار ہو گیا جو عرصہ تک ہندو مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی دستاویز سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنی یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"دسمبر ۱۶ء میں جبکہ لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا تھا اور ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی جا رہی تھی علاوہ مسٹر جناح اور مسٹر مظہر الحق کے جو کہ اُس وقت کانگریسی مسلمان کہے جاتے تھے مسلم لیگ کی جانب سے مہاراجہ محمود آباد سید وزیر حسن اور حکیم صاحب نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ لیکن حکیم صاحب کی رائے یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال کی نمایندگی میں مسلمانوں کی اکثریت خواہ وہ کتنی ہی قلیل ہو قایم رکھی جائے اور باقی صوبوں میں جہاں اُن کی اقلیت ہے اُن کی آبادی کے لحاظ سے کونسلوں میں نشستیں محفوظ کی جائیں۔ حکیم صاحب اس صورت کو اُس دوسری صورت پر ترجیح دیتے تھے جو کہ لکھنؤ پیکٹ کے ذریعہ سے منظور کی گئی۔ حکیم صاحب کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اقلیت کم ہو یا زیادہ لیکن وہ پھر بھی اقلیت ہی ہے اور اکثریت کے مقابلہ میں اُس کو ہمیشہ شکست ہو گی اور پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دینا نہ مقتضائے انصاف تھا اور نہ مفید۔ لیکن چونکہ لکھنؤ پیکٹ ہندو مسلمان لیڈروں کے اتفاق رائے سے منظور ہو گیا

اس لئے انہوں نے اُس کی مخالفت کرنے کو مصلحت وقت
کے خلاف سمجھا۔"

حکیم صاحب آخر تک اپنے اس خیال پر قایم رہے اور بعد کو انہوں نے بعض مواقعہ پر اپنی اس رائے کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُس وقت آیندہ اصلاحات کے متعلق انگریزوں کو پوری طرح ملک کی رائے عامہ سے متاثر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کانگریس اور لیگ کا سمجھوتہ زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس اور لیگ کی یک جہتی کے اس مظاہرہ نے حکومت برطانیہ کو اچھی طرح جتلا دیا کہ اب ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند خود ہندستان آنے پر مجبور ہوئے اور بعد میں دستوری اصلاحات کا ایک نقشہ بن سکا۔ یہی سمجھوتہ دو برس بعد آنے والے عوامی انقلاب کا پیش رو ثابت ہوا۔ سیاسی زندگی کی اس تعمیر میں اگر وہ سمجھوتہ سنگ بنیاد تھا تو بلا شبہ حکیم صاحب اُس عمارت کے معماروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

طبیہ کانفرنس سالانہ معمول کے مطابق چند روز سیاست کے ہنگامہ سے یک گونہ فارغ ہو کر حکیم صاحب ۱۹۱۷ء کے ابتدائی مہینوں میں طبیہ کالج کے کاموں میں مصروف رہے۔ طبیہ کانفرنس وسط مارچ میں منعقد ہوئی۔ اس دفعہ اُس کے صدر پنڈت مدن موہن مالوی تھے۔ اُن کا انتخاب نہ صرف ویدک اور یونانی ویدو کو کالج میں برابر کا حصہ دینے کے خیال سے کیا گیا بلکہ وہ ہندو لیڈروں سے حکیم صاحب کے بڑھتے ہوئے سیاسی تعلقات کا بھی

ثبوت تھا۔ چیف کمشنر اور والیانِ ریاست کے بجائے اب ملک کے سیاسی لیڈروں سے حکیم صاحب اپنی طبی تحریک کا اتصال پیدا کر رہے تھے۔ اس کانفرنس میں پہلی دفعہ حکیم صاحب نے ملک کی قومی یونیورسٹیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اداروں میں ملکی طبوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ اُن کی زندگی کے آخری دور میں اُن کا یہ مطالبہ ایک حد تک تسلیم کیا گیا اور ملک کی بعض قومی یونیورسٹیوں میں طب اور ویدک کی تعلیم کا انتظام ہوگیا۔ اب اُن کی طبی تحریک بھی اُن کی سیاسی زندگی کی طرح اپنے ارتقا کی منزلیں تیزی کے ساتھ طے کر رہی تھی۔

اسی جلسہ میں حکیم صاحب نے پھر ایک دفعہ رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی تقریر میں بہت تفصیل کے ساتھ ایکٹ کے اُن نتائج پر تبصرہ کیا جو قدیم طبوں کے لئے نہایت مضر ثابت ہو رہے تھے۔ اس تقریر کو ان صفحات میں نقل کرنا مشکل ہے اور زیادہ ضروری بھی نہیں اس لئے کہ حکیم صاحب کی زندگی کے اس دور میں اُن کا دامن ایسے اہم تر سیاسی مسائل سے بندھ گیا تھا جو انہیں پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

۲۴ مارچ کو مدرسہ طبیہ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت سر سنکرن نائر منعقد ہوا۔ حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کے آغاز میں سر سنکرن نائر کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس ابتدائی دور میں جب حکومت سے حکیم صاحب کے تعلقات کمزور ہوتے جاتے تھے کہا جاتا ہے کہ اُن کے خیالات پر سر سنکرن نائر کے تعلقات کا بھی بہت اثر پڑا۔ سر سنکرن اُس وقت حکومت ہند کی عاملہ کے رکن تھے اور اُن سے حکیم صاحب

کے دوستانہ تعلقات بہت گہرے تھے۔ سر سنکرن اپنے وسیع اور آزاد سیاسی خیالات کی وجہ سے زیادہ عرصہ حکومت ہند کا ساتھ نہ دے سکے اور کنارہ کش ہو گئے۔ جو کچھ بھی اثر حکیم صاحب پر سر سنکرن نائر کے خیالات کا ہوا ہو لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ محض سر سنکرن کے زیر اثر حکیم صاحب کے سیاسی احساسات میں کوئی تغیر پیدا ہوا۔ اُن کا مزاج ایک بہت مضبوط سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، وہ دوسروں کی رائے کو غور کے ساتھ سنتے تھے لیکن جب تک خود اُن کی قوت فیصلہ اپنا فیصلہ نہ دیدے اُس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت خود حکیم صاحب کے اندر جو سیاسی رجحانات موجود تھے اُن کو سر سنکرن نائر کے خیالات سے تقویت حاصل ہوئی اور صرف اسی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سنکرن سے اُن کی دوستی اُن کی سیاسی زندگی کا ایک عنصر بنا۔

دہلی کے لئے مجوزہ اسلامیہ کالج

جیسا کہ کہا جا چکا ہے طبی تحریک اور مسلم لیگ کے علاوہ حکیم صاحب شروع ہی سے تعلیمی تحریکوں سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں طبی کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی اُنہوں نے خاص دہلی کے لئے ایک اسلامی کالج کے قایم کرنے کے لئے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا۔ اس تجویز کے متعلق اُنہوں نے دہلی کے تمام معززین کو بہ آسانی اپنا ہم خیال بنا لیا اور اُس کی تکمیل میں وہ اس درجہ مصروف ہو گئے کہ پرانے کاغذات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دوسرے تیسرے دن اُن کے مکان پر جلسے ہوتے تھے ان جلسوں کی اکثر روئیداد وہ اپنے

قلم سے نکلتے تھے، پوری اسکیم کا مسودہ انہوں نے خود تیار کیا، شہر کے تقریباً تمام بااثر افراد خصوصاً ڈاکٹر انصاری، مولوی عبدالاحد، امام صاحب جامع مسجد، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور بہت سے مسلمان وکلا ادر بیرسٹر اور تاجر اُن کے شریک کار تھے اور اُن ہی کی مرتبہ اسکیم ۴۹ دستخطوں سے شائع ہوئی۔ کل اسکیم کے لئے سرمایہ کا تخمینہ ½ ۶ لاکھ تھا۔ بہت قلیل عرصہ میں اُنہوں نے ½ ۱ لاکھ جمع کر لیا۔ پھر جن الفاظ میں بقیہ ۵ لاکھ کے لئے انہوں نے اپیل کی وہ اُن کے بہت قوی اور گہرے جذبات کے آئینہ دار تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کی شرمناک تعلیمی پستی کا دور کرنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے ملک کی عام حالت بھی بہتر نہیں ہوسکتی۔ خود دہلی کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ

> اب وہ ہمارے بچے جو مدرسوں یا گھروں میں اعلیٰ تعلیم پاتے تھے گلی کوچوں میں مصروف دشنام دہی ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے کسی اسلامی محلہ میں چلے جائیے اور اپنے بچوں کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے .... اگر ہم سے آنے والی زندگی میں یہ سوال کیا گیا کہ تم نے اپنے بچوں کے لئے کیا کیا جن کی ذمہ داری تمہارے متعلق تھی تو کیا ہم یہ جواب دیں گے کہ ہم نے خلاف شریعت اُن کی تقاریب پر روپیہ قرض لیکر صرف کیا مگر اُن کو گلیوں میں آزاد چھوڑ دیا کہ وہ تمام دن اُن ذمائم کو اپنے دل و دماغ

میں جگہ دیں جو انسانیت اور اسلامیت کے دامن پر
نہ مٹنے والے داغ ہیں۔

پھر انہوں نے امتحانوں کے نتائج کے اعداد پیش کر کے بتایا کہ دہلی میں مسلمانوں کے بچوں کی تعلیمی حالت کس قدر پست ہے۔

یہ کوششیں زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکیں اس لئے کہ ملک کا سیاسی موسم بہت گرم ہو چلا تھا اور حکیم صاحب روز بروز اس سمندر کی موجوں سے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ ان حالات سے اسلامی کالج کی تحریک بھی متاثر ہوئی اور حکیم صاحب کو پھر کبھی اتنا موقعہ نہ مل سکا کہ اس تحریک میں ازسرنو جان ڈالتے۔ چندہ کی جو رقوم وصول ہو چکی تھیں وہ بعد میں واپس کر دی گئیں۔ چند روز بعد تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جب جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی تو حکیم صاحب کی تمام تر توجہ اُسی طرف مبذول ہو گئی۔

عربوں کی بغاوت کے بعد

جس قدر یورپ کے میدان کارزار کی خونریزی بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر ہندستان کا سیاسی موسم بھی گرم ہوتا جاتا تھا۔ عربوں کی غداری کے بعد اتحادیوں کا پلّہ بھاری ہو گیا تھا اور ترکوں کے قوائے جنگ کمزور ہو چلے تھے لیکن عین اُس وقت جبکہ ترکوں کو کمزور کر کے اتحادی جرمنی کے خلاف بھی بہت جلد فتح کا نقارہ بجانے کی اُمید کر رہے تھے ایک ایسا عظیم الشان حادثہ پیش آیا جو چند سال بعد دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا، یعنی روس میں وہاں کی قدیم شہنشاہیت کے خلاف عوام نے ایک زبردست بغاوت کی اور شہنشاہیت

کا تختہ اُلٹ دیا۔ اتحادیوں کی جنگ کا نقشہ اس انقلاب نے بالکل بگاڑ دیا ہوتا اگر عین اُسی وقت امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ نہ کر دیا ہوتا۔ روس کے انقلاب نے ترکوں کو تو کچھ سانس لینے کا موقعہ دیا لیکن جنگ میں امریکہ کی شرکت نے اتحادیوں کی تھکی ہوئی فوجوں میں ایک آخری کوشش کرنے کی ہمت پیدا کر دی۔

جب یورپ میں دولت عثمانیہ کا پیالہ لبریز ہو رہا تھا تو ہندستان میں ہر وہ شخص مورد عتاب تھا جس کے اندر ترکوں سے ہمدردی کا کوئی نشان پایا گیا۔ مسلمانوں کے بڑے لیڈروں میں محمد علی اور شوکت علی، جھنڈواڑہ میں نظر بند کئے جا چکے تھے، حسرت موہانی، فیض آباد کے جیل خانہ میں پابہ زنجیر تھے مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں مقید تھے، ظفر علی خاں پنجاب میں بند تھے اور مولانا محمود حسن مالٹا میں اسیر تھے۔ مسز اینی بیسنٹ بھی ہوم رول لیگ کی تحریک کے سلسلہ میں نظر بند کی جا چکی تھیں۔ لیکن اس تمام دار و گیر کا قدرتی ردعمل یہی تھا کہ عوام کے احساسات زیادہ قوی اور عوامی شورش زیادہ تیز ہو گئی۔ اُسی زمانہ میں ہوم رول لیگ کے صدر جسٹس سر سیوامی آئر نے امریکہ کے صدر ولسن کو ہندستان کے حالات پر ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی:-

> ہندستان والے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُن کو اجازت نہیں کہ وہ عام طور پر اُس نصب العین کے متعلق اپنی خواہشات ظاہر کریں جو آپ نے اپنے مشہور پیام میں پیش کیا ہے۔

ایک غیر قوم کے حاکم جو ایک غیر زبان بولتے ہیں
اپنی مرضی کے مطابق ہم کو مجبور کرتے ہیں - وہ ہماری
دولت چھین رہے ہیں - وہ ہم کو تعلیم دینے سے انکار
کرتے ہیں، بغیر ہماری مرضی کے ہم پر نا قابل برداشت
ٹیکس لگاتے ہیں اور ہمارے ہزاروں ہموطنوں کو قوم
پرستی کے جذبات ظاہر کرنے کی بنا پر جیل خانوں میں
بند کرتے ہیں۔

جب ایسے لوگوں کے جذبات کا جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور حکومت کی نظر میں وقیع تھے، جیسے کہ سر سیوا می آئر یہ حال تھا تو عوام کے جذبات کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے - اس گرمی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مسٹر مانٹیگو نے وزیر ہند کا عہدہ سنبھال لینے کے چند ہی روز بعد اپنا ایک اعلان شائع کیا جس میں مزید آئینی اصلاحات نافذ کرنے اور دستوری حقوق دینے کا وعدہ کرکے اس جلتی آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی - اور پھر وہ خود ہندستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے آ گئے۔

نظر بندوں کا مسئلہ

۲۰ راگست کو یہ اعلان شائع ہوا اور تھوڑے ہی دن بعد مسز اینی بیسنٹ رہا کر دی گئیں - انہوں نے رہا ہوتے ہی بقیہ نظر بندوں کی رہائی کے سوال کو پوری قوت سے اٹھایا اور یہ سوال اب ملک کی قومی جدوجہد کا ایک بہت نمایاں نشان راہ بن گیا - ۱۸ر نومبر کو مسز اینی بیسنٹ اس غرض سے دہلی آئیں کہ ویسرائے سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کریں - ملک کے بہت سے

ممتاز لیڈر بھی اس موقع پر اُن کی گفتگو کا نتیجہ معلوم کر کے اپنی تحریک کا پروگرام بنانے کے لئے جمع ہوئے ۳ اور ۴ اور ۵ نومبر کا یہ اجتماع دہلی میں لیڈروں کا ایک یادگار اجتماع تھا۔ شریف منزل اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر پر جوش اور معتدل، سخت اور نرم، سرد اور گرم بہت سے مسلمان لیڈر جمع تھے جو سب بلا تفریق عقائد سیاسی نظربندوں کے مسئلہ کا آخری فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ کئی دن کی مسلسل گفتگو کے بعد انجمن نظربندان اسلام قایم کی گئی جس کا مقصد نظربندوں کی رہائی کی تدابیر اختیار کرنا تھا اس مقصد کی تکمیل کے لئے طے پایا کہ کثیر سرمایہ جمع کیا جائے۔ مرکزی جماعت کے صدر راجہ صاحب محمود آباد منتخب کئے گئے اور سکریٹری ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن تجویز ہوئے۔ حکیم صاحب انجمن کے خزانچی بنائے گئے۔ تمام صوبوں میں اس انجمن کی شاخیں قایم کی گئیں۔ اس انجمن کی جد و جہد کی اگر کوئی تفصیلی تاریخ لکھی جائے تو وہ ہندستان میں قومی تحریک کا ایک اہم جزو ہوگی۔ اسی تحریک نے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں حکومت کے مقابلہ پر آنے کے لئے پوری طرح تیار کر دیا با وجودیکہ ستمبر و اکتوبر میں اضلاع بہار میں ہندو مسلمانوں کے درمیان سخت فساد ہو چکا تھا اور بیش بیں حکومت یہ کوشش کر چکی تھی کہ فرقہ واری جذبات کو مشتعل کر کے نظربندوں کی تحریک کے سلسلہ میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو ناممکن بنا دیا جائے تاہم اس تحریک میں ہر فرقہ کے لوگ شریک ہونے لگے اس لئے کہ اُس کا رخ اُسی حکومت کے خلاف تھا

جس سے کانگریس بھی حقوق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دسمبر ۱۷ء میں رولٹ کمیٹی اس غرض سے قایم کی گئی کہ وہ تمام نظربندوں کی مسلوں کو دیکھ کر فیصلہ کرے کہ کس کی نظربندی بجا تھی اور کس کی بیجا۔ معتدل خیال کے لیڈر اس کمیٹی کے تقرر کو اپنی جد و جہد کا کامیاب نتیجہ سمجھتے تھے، لیکن ملک میں اُس کمیٹی کے فیصلوں نے بہت زیادہ مایوسی پیدا کی۔

اس سال کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لئے مسز بیسنٹ منتخب ہوئیں اور مسلم لیگ کی صدارت کے لئے مولانا محمد علی کا انتخاب کیا گیا۔

مہاتما گاندھی اور اجمل خاں

دسمبر کا آخری ہفتہ کلکتہ میں قومی جوش و خروش کے مظاہروں کا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ حکیم صاحب کانگریس اور لیگ کے پلیٹ فارم پر موجود تھے اور لیڈروں کے اندرونی مشوروں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ اب وہ اپنی سیاسی زندگی کے اُس دور میں داخل ہو چکے تھے جب کوئی سیاسی اجتماع، شورے، کانفرنس یا اجلاس اُن کے بغیر مکمل نہ ہوتا تھا۔ غالباً پہلی دفعہ اسی موقعہ پر حکیم صاحب اور گاندھی جی ایک دوسرے کے قریب آئے۔ اور اس محبت اور یگانگت کی بنیاد رکھی گئی جو ۲۷ء تک قایم رہی۔ ڈاکٹر انصاری اپنی یادداشت میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:۔

> حکیم صاحب میں مردم شناسی کا ایک غیر معمولی مادہ
> تھا۔ یوں تو ہر شخص اپنے تجربہ اور سمجھ اور عقل کے مطابق

تھوڑا بہت قیافہ شناس ہوتا ہی ہے اور مختلف انسانوں کو پہچاننے لگتا ہے لیکن حکیم صاحب میں یہ بات غیر معمولی طور پر موجود تھی - وہ ایک نگاہ میں ہر شخص کا صحیح اندازہ کر لیتے تھے اور بہت کم غلطی کرتے تھے - اور سب سے زیادہ یہ بات تھی کہ اپنی رائے کا اظہار اُس شخص پر کسی طرح نہ ہونے دیتے تھے -

۱۷ء میں جبکہ کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا اور مسز اینی بیسنٹ صدر کانگریس منتخب ہوئی تھیں اُس سال مسلم لیگ کا اجلاس بھی کلکتہ ہی میں ہوا تھا۔ محمد علی صاحب جو کہ اُس وقت نظربند تھے لیگ کے صدر منتخب ہوئے تھے اس سال آرہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان نہایت سنگین جھگڑا ہوا تھا اور ہندوؤں کے ایک مجمع نے آرہ میں بہت خونریز تباہی مسلمانوں کے اوپر عائد کی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس واقعہ کی وجہ سے بیحد تلخی پیدا ہو گئی تھی اور کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں ایک رزولیوشن اس جور و تشدد کے کے خلاف اور مقتولین اور مجروحین سے اظہار ہمدردی کرنے کا کانگریسی اصحاب کی طرف سے پیش کیا جانے والا تھا۔ مسز اینی بیسنٹ کے مکان پر حکیم صاحب کے اور میرے ایما سے ایک مختصر میٹنگ مشورہ کے لئے بلائی گئی جس میں قریب تمام سربرآوردہ ہندو

لیڈر موجود تھے ۔ مہاتما گاندھی بھی جو اُس وقت تک ہندستان میں زیادہ مشہور نہ تھے اور نہ کانگریسی حلقوں میں کچھ زیادہ اثر رکھتے تھے وہاں موجود تھے اور پہلی مرتبہ اس جلسے میں اُن سے ہماری ملاقات ہوئی۔

جب آرہ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو بجز مسٹر مظہرالحق اور مسٹر محمد علی جناح کے جو اُس وقت کانگریس کے سربرآوردہ اصحاب میں سے تھے ہر شخص نے اس قسم کا رزولیوشن پیش کرنے کی مخالفت کی ۔ لیکن ہندوؤں میں مسٹر گاندھی اور مسٹر سی آر داس نے جو اُس وقت کانگریس کے حلقوں میں زیادہ اثر نہ رکھتے تھے بہت زور سے اس تجویز کی تائید کی پھر بھی یہ رزولیوشن کانگریس کے اجلاس میں تو کیا اُس کی سبجکٹ کمیٹی میں بھی پیش نہ ہو سکا ۔ حکیم صاحب جب اس صحبت سے لوٹ کر مکان آئے تو مہاتما جی کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا کہ " یہ شخص نہایت سچا، بلند حوصلہ اور اعلیٰ انسان ہے اور اگر زندہ رہا تو ایک روز کانگریس بلکہ تمام ہندستان کو ایک بڑے مرتبہ تک پہنچائے گا "۔

سی آر داس اُس وقت تک کانگریس میں کچھ زیادہ نمایاں حصہ نہ لیتے تھے لیکن کلکتہ بار میں بہت بڑی پوزیشن رکھتے تھے اور آمدنی کے لحاظ سے ہندستان کے سب سے بڑے ایڈوکیٹ سمجھے جاتے تھے ۔ امارت اور شان

سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے متعلق حکیم صاحب نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ:۔

"یہ شخص بہت مستغنی المزاج ہے، تمول نے اُس کے دماغ کو خراب نہیں کیا ہے، بہت عالی حوصلہ ہے اور تعصب مذہبی اس کو چھو نہیں گیا ہے۔ چند ہی سال بعد اُن کی اس رائے کی صداقت ظہور میں آگئی"۔

باوجودیکہ آرہ کے واقعات نے مسلمانوں کو بہت بد دل کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر انصاری کا خیال ہے کہ وہ حکیم صاحب ہی کی شخصیت کا اثر تھا کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد قایم ہوئی۔ محمد علی صاحب کے نظر بند ہونے کی وجہ سے لیگ کے اجلاس کی کرسی صدارت خالی رہی، لیکن کانگریس کے تمام بڑے لیڈر اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ حکیم صاحب آرہ کے واقعات سے متاثر ضرور تھے لیکن نہ اتنے کہ ہندو مسلم اتحاد کے عظیم تر مقصد کو کمزور ہونے دیتے۔ ساری عمر اس ایک ہی مقصد کے لئے اُنہوں نے اپنی بہترین خدا داد صلاحتیں صرف کیں۔ یہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس مقصد میں اپنی ناکامی کا داغ اُن کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔

لیگ کے اجلاس میں کرسی صدارت تو خالی رہی لیکن راجہ صاحب محمود آباد نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ وہ دن ہندستان در کلکتہ کے لاکھوں مسلمانوں کو یاد ہوگا جب مولانا محمد علی کی والدہ "بی اماں" لیگ کے اجلاس میں تشریف لائیں اور راجہ صاحب محمود آباد جیسے متعرب

بارگاہِ حکومت نے اپنی تقریر کو اس شعر سے شروع کیا:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
کہ یاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری!

دستورِ اساسی پر کانگریس کی کمیٹی کے ساتھ مل کر غور و خوض کرنے کے لئے لیگ نے بھی اپنی ایک کمیٹی منتخب کی جس کے اراکین ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی تھے۔ اس طرح لیگ اور کانگریس کے اشتراکِ عمل کا دوسرا قدم اُٹھا۔

دورِ ثالث کے ان آخری دنوں میں حکومت اور حکیم صاحب کے تعلقات کی نوعیت کچھ عجیب تھی۔

با من او بزمش او صورتِ موج است و کنار
با من او یز دو پیوستہ گریزاں از من!

حکیم صاحب جس قدر زیادہ قوم پرستی کی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے جاتے تھے، حکومت اتنی ہی زیادہ اُن کی طرف نظرِ التفات پھیرتی جاتی تھی۔ خوشنودیٔ مزاج کے جو مظاہرے اُن کے ساتھ حکومت کے حلقوں میں کئے جاتے تھے وہ سب اربابِ حکومت کی اس خواہش پر مبنی تھے کہ ایک اتنے با اثر شخص کو حکومت کے خیر طلبوں سے صف سے ہٹنے نہ دیا جائے لیکن حکیم صاحب کی معنوی زندگی اب اپنے مدارج جلد جلد طے کر رہی تھی اور حکومت کی کوئی قوت ــــ انعام و اکرام کی یا غیض و غضب کی ــــ اُن کے بڑھتے قدموں کو روک نہ سکتی تھی۔ ابھی تک اُن کی خدمت میں خوشنودیٔ مزاج کے پروانے پیش کئے جا رہے تھے اور آغازِ جنگ میں جو امداد اُنہوں نے حکومت کو دی تھی اُس کی سندیں عطا ہو رہی تھیں ــــ یعنی ان ریتے کی دیواروں سے بہتے ہوئے دریا کو روکا جا رہا تھا!

نصف النہار

سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۲۴ء

جب یورپ کی جنگ ایک آخری اور سخت ترین منزل سے گذر رہی تھی تو ہندستان کی سیاسی فضا میں بجلیاں چمکنی شروع ہوگئی تھیں اور انگریزوں کو ان گرجتے ہوئے بادلوں کے برسنے کا اندیشہ لاحق تھا۔ چنانچہ جب ایک طرف باروت اور فولاد دنیا کی قدیم و جدید تہذیب کے درمیان فیصلہ کر رہے تھے تو ہندستان میں برطانوی وزیر ہند ہندستانیوں کے مجروح دلوں کے لئے ایک خانہ ساز مرہم زنگار لیکر تشریف لائے تھے۔ سادہ لوح ہندستانی اب بھی اتنے سادہ لوح تھے کہ ایک ہی نظر عنایت پر صدیوں کی نمک پاشی کو بھول سکتے تھے۔ اُن کی سادہ لوحی نے بارہا انگریزی تدبر سے دہوکے کھائے تھے، لیکن اس دفعہ وہ ایک نئی دنیا اپنے سامنے دیکھ رہے تھے، نئی نئی آوازیں اُن کے کانوں میں آرہی تھیں "حق انتخاب حکومت" "آزادی اقوام" اور "انصاف" کی نئی نئی اصلاحیں جو امریکہ سے انگلستان تک فضا پر چھائی ہوئی تھیں اُن کے دل و دماغ میں بھی گھر بنانے لگی تھیں۔ اتحادیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ جنگ انصاف امن اور کمزور اقوام کے حقوق کے لئے لڑی گئی ہے، سیاسی حلقوں میں کچھ زیادہ قابل اعتماد تو نہ سمجھا گیا تھا تاہم عوام یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس دعوے کی جانچ کا اب وقت آگیا ہے۔ ۱۵ لاکھ سپاہی اور کروڑہا روپیہ امداد جنگ کے نام پر دینے کے بعد ہندستان اب اُس "آزادی" اور "انصاف" کا منتظر تھا جس کے خوشنما تخیل کی ہزاروں تصویریں، اخبارات، سرکاری و نیم سرکاری اعلانات، تقاریر اور مضامین کے ذریعہ سے پیش کی گئی تھیں۔

لیکن جنگ کے آخری دور میں جب امریکہ کی فوجوں کے میدان میں آجانے کے بعد اتحادیوں کا پلہ بھاری ہو چلا تھا ان وعدوں اور دعووں کے لہجہ میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا اور اُسے ہندستان کے لیڈروں نے بھی اور عوام نے بھی محسوس کر لیا۔ خود حکیم صاحب کا لہجہ بھی جو عموماً نرم اور سنجیدہ رہا کرتا تھا سخت ہو چلا تھا۔ یہ اُن کی سیاسی زندگی کے اُس دور کا آغاز تھا جب وہ "انصاف" اور "آزادی" کے سپاہیوں کی پہلی صف میں آ گئے تھے۔ اپنی ایک تقریر میں نظربندوں کے مسئلہ پر ملک کے جذبات کو اُنھوں نے اِن الفاظ میں ظاہر کیا کہ

"جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے اُس وقت سے نظربندیوں کا سلسلہ برابر جاری ہے...... ہمارے ایسے مذہبی پیشواؤں کو جن کی فضیلت اور تقدس کا تمام اہل اسلام تہ دل سے اعتراف و احترام کرتے ہیں نظربند کیا گیا ...... ہمارے ہردلعزیز لیڈروں کو آزادی سے محروم کیا گیا۔ ہمارے دلوں کو اس سے صدمہ پہنچا ہے۔ ہم نے فریاد کی مگر شنوائی نہیں ہوئی...... جنگ کے دوران میں ہم نے کامل سکوت سے کام لیا لیکن اب ہم مجبور ہیں کہ اُن لوگوں کی آزادی کے لئے آواز بلند کریں...... ہم بہت امن کے ساتھ زمانہ جنگ میں وقت گذارتے رہے اور اپنے مقدور بھر سلطنت کی خدمات بجا لائے...... مگر افسوس کہ واقعات کی وجہ سے مجبور کئے جاتے ہیں۔"

اُن کے دلوں سے صدائے احتجاج نکلتی ہے۔ یہ ایک غور طلب امر ہے کہ دل دکھائے جاتے ہیں تو بالآخر وفاداری کس حد تک قایم رہ سکتی ہے..........

مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران کی نظربندی کے مسئلہ نے مسلمانوں کے لئے تو ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا اور ہندو لیڈر بھی اُن سے اس بنا پر پوری ہمدردی رکھتے تھے کہ یہ مسئلہ ملک کی آزادی اور سول حقوق کے مسئلہ سے مربوط تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وزیر ہند بھی اس مسئلہ میں اتنی سختی پسند نہ کر سکتے تھے جتنی کہ حکومت ہند نے روا رکھی تھی۔ اُنھوں نے اپنے روزنامچہ میں مسلمانوں کے ایک وفد کا جو اُن سے ملنے گیا تھا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"رابرٹس نے مجھ سے کہا کہ ایک آل انڈیا ڈیپوٹیشن مجھ سے ملنے دلی آیا تھا۔ اُس سے کہا گیا کہ صرف اصلاحات کے متعلق گفتگو کرے۔ مگر اُس کے ایڈریس میں محمد علی کو آزاد کرنے کی بھی درخواست کی گئی۔ ممبران ڈیپوٹیشن سے کہا گیا کہ اس جزو کو نکال دیں۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے افسوس اگر چیمسفورڈ ذرا اُن سے گفتگو کر لیتے تو شاید اُن کو رضامند کر لیتے۔ اب وہ بد دل ہو کر واپس گئے۔ رابرٹس مجھ سے کہتے تھے کہ اُن میں سے دو اُن سے ملنے آئے تھے اور وہ دونوں یہ کہتے تھے کہ ہمیں محمد علی کی نظربندی سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ یہ نظربندی گورنمنٹ کی اس پالیسی کا جزو ہے

کہ خلیفہ سے تعرض کیا جائے اور اس ذلیل بڈھے شاہ حجاز
کو خلیفہ بنا دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت اس قسم کے امکانات مسلمانوں کی نظروں کے سامنے تھے اور انہیں اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ عربوں کو خوش کرنے کے لئے اس قسم کے منصوبے زیرِ غور ہیں۔

۲۷ اپریل کو ویسرائے نے دہلی میں ایک مجلس جنگ منعقد کی جس میں ملک کے ہر طبقہ کے لیڈر مدعو کئے گئے۔ ویسرائے نے بادشاہ کا ایک پیام پڑھ کر سنایا جس میں اُن کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے گئے کہ "آج سلطنت کی ضرورتیں ہندوستان کے لئے مواقعہ (حصول حقوق کے) پیدا کرتی ہیں" جن کا صاف ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم آج اگر سلطنت کی امداد کرو تو حقوق سیاسی کا استحقاق پیدا کر سکتے ہو۔ اس کانفرنس میں مہاتما گاندھی اور حکیم صاحب بھی شریک تھے اور مہاتما گاندھی نے اُس دن بھی حکومت کی تائید میں آواز بلند کی تھی۔ لیکن یہ آخری موقعہ تھا جب حکومت کے معاون اور دوست کی حیثیت سے یہ دونوں ایوان حکومت میں گئے۔ اس کے بعد اپنی عمر کے بقیہ زمانہ میں حکیم صاحب ہمیشہ اُس دروازہ سے دور اور اُس سنگ استان سے بیزار رہے۔

محمد احمد خاں کی نظر بندی

مئی میں حکیم صاحب کچھ عرصہ طبیہ کانفرنس کے اجلاسوں کے سلسلہ میں بمبئی رہے اور وہاں سے واپس آتے ہی مسئلہ نظر بنداں اور سیاسی حقوق کی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک ذاتی واقعہ

ایسا پیش آیا جس نے اُن کو حکومت کے طرزِ عمل سے اور زیادہ بیزار کر دیا۔ اس واقعہ کو ہم ڈاکٹر انصاری صاحب کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

سنہ ۱۹۱۸ء میں حکیم صاحب کے خیالات میں نمایاں تغیر پیدا ہوا۔ دلی کے چیف کمشنر سر مالکم ہیلی نے طبیہ کالج کے لئے حکیم صاحب کو زمین دئے جانے کی مخالفت کی۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ سے حکیم صاحب نے خود مل کر وہ وسیع زمین حاصل کر لی جس پر بعد میں طبیہ کالج تعمیر ہوا اس معاملہ میں حکیم صاحب اور چیف کمشنر کے درمیان بہت تلخی پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں حکیم صاحب کے بھتیجے حکیم محمد احمد خاں کو چیف کمشنر نے ۶ ماہ کے لئے دہلی میں نظر بندی کا حکم دیدیا۔ یہ ایک نہایت غلط کارروائی تھی۔ حکیم محمد احمد خاں کو سیاست سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے پیشہ طبابت میں ہمہ تن مصروف اور ہندستان کی سیاست سے بالکل بے تعلق تھے۔ (حقیقت یہ ہے کہ وہ خود حکیم صاحب کے سیاسی مشاغل کو ناپسند کرتے تھے) شاید وہ کبھی کوئی اخبار بھی نہ پڑھتے تھے۔ اُن کی ناواقفیت ہی کی وجہ سے اُن سے یہ فروگذاشت ہوئی کہ ایک مریض کو دیکھنے سرحدی علاقہ میں حکومت سے اجازت لئے بغیر چلے گئے اور چند روز علاج کر کے دہلی واپس آ گئے۔ اُن کے اس قیام سرحد کو خفیہ محکمہ نے خدا معلوم کس رنگ

میں رنگا۔ چیف کمشنر نے حکیم صاحب اور محمد احمد خاں سے اس سفر کا مقصد دریافت کیا اور محض طبی مقصد کو باور نہ کیا اور حکیم محمد احمد خاں کی نظربندی کا حکم دیدیا۔ اس واقعہ نے حکیم صاحب کو بہت آزردہ کیا اور انہیں اور بھی زیادہ یقین ہوگیا کہ انگریز حکومتی اقتدار کے نشہ میں مست ہے۔..........

حکیم صاحب اپنے خاندانی وقار کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان میں عزت نفس اور خودداری کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ وہ کبھی کسی بڑے سے بڑے حاکم یا رئیس کی بددماغی کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ مالکم ہیلی برطانوی سول سروس میں بہت ہی بددماغ انگریز کہا جاتا تھا۔ غالباً اُس کو غصہ اس بنا پر آیا کہ حکیم صاحب نے باوجود اُس کی مخالفت کے دیسرائے کے ذریعہ سے زمین حاصل کرلی۔ اس غصہ کو اُس نے حکیم محمد احمد خاں پر اتارا۔ غرض یہ کہ اس واقعہ کے بعد وہ جو تھوڑا سا ربط جو حکیم صاحب اور حکومت کے درمیان باقی رہ گیا تھا وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ سیاسی میدان میں تو حکیم صاحب آ ہی چکے تھے اور وہ مہاتما گاندھی کی تحریک میں ضرور شریک ہوتے لیکن اگر مالکم ہیلی اتنی عجلت نہ فرماتے تو ممکن ہے کہ حکیم صاحب کا اس میدان میں آنا چندروز بعد ہوتا۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

جولائی میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگی جس میں نہ صرف نظربندیوں کو زیادہ تر حق بجانب ثابت کیا گیا بلکہ آئندہ کے لئے حکومت کے اختیارات

میں اضافہ کی تجویزیں پیش کی گئیں اور موجودہ قانون کو ناکافی قرار دیا گیا۔ کچھ تعجب نہیں کہ دعاؤں کے اس اُلٹے اثر اور تمناؤں کے منقلب ثمر نے ہندستانیوں کے دلوں کی آگ پر تیل کا کام دیا۔ اس کے چند روز بعد جب معتدل فرقہ کی گذارشوں کو قبول فرماکر ایک اور کمیٹی کلکتہ کے ایک ہندستانی جج کی صدارت میں قایم کی گئی تو اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ اُس کی رائے میں ۸۰۶ نظربندوں میں سے ۸۰۰ کی نظربندی حق بجانب تھی۔

ستمبر میں مسٹر کھاپرڈے نے ایمپریل کونسل میں ایک رزولیوشن پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ رولٹ کمیٹی کی سفارشات فی الحال زیرِ غور نہ لائی جائیں اور ایک اور کمیٹی محکمہ تحقیقات جرایم (سی۔ای۔ڈی) کے حالات کی تحقیقات کرنے کے لئے بنائی جائے جس میں آدھے غیر سرکاری اور آدھے سرکاری ممبر ہوں۔ اس رزولیوشن پر جو بحث ہوئی اُس میں سر مائیکل رِدڈایر نے بہت شد و مد سے حصہ لیا اور سی۔ای۔ڈی کی بڑی تعریفیں کیں۔ شاستری، بنرجی اور سپرو نے جو کونسل کے ممبر تھے اس رزولیوشن کی تایید نہیں کی اس لئے کہ یہ اصحاب اپنی ساری قوت صرف اصلاحات کے مسئلہ پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رزولیوشن صرف دو آدمیوں کی تایید حاصل کر سکا یعنی صرف دو آرا ئین موافق اور ۴۶ مخالف رہے۔ یہ واقعہ بھی اُس زمانہ کی سیاست میں اعتدال پسندوں اور ترقی پسندوں کے ذہنی اختلافات کی ایک مثال تھی۔ شاستری، بنرجی اور سپرو کا نقطہ نظر ہمیشہ آہستہ اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا۔ لیکن

ہندستان کی قومی زندگی میں اب آئین و دستور کی نزاکتوں اور باریکیوں کا لحاظ کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی جاتی تھی۔

راستہ کا ایک اہم موڑ شروع ستمبر میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس بہ صدارت راجہ صاحب محمود آباد بمبئی میں منعقد ہوا اور اس میں آئینی اصلاحات کے متعلق لیگ کے مطالبات پیش ہوئے (جن کی نسبت کانگریس سے مشورہ ہو چکا تھا) لیکن جب نومبر میں جنگ یورپ ختم ہوئی اور ہندستان میں "یوم فتح" سرکاری طور پر منایا گیا تو ٹرکی اور اسلامی ممالک کی قسمت کا سوال بالکل سامنے آگیا۔ ہندستان کے عوام نے محسوس کر لیا کہ اگر شرائط صلح میں ترکی اور دوسرے اسلامی اور ایشیائی ممالک کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا گیا تو پھر ہندستان کی محکومیت میں کمی ہونے کے بجائے یقیناً اضافہ ہوگا۔ ملک کی عام فضا اب ان سامراجی منصوبوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھی اور قانون تحفظ ہند کی جابرانہ گرفت نے اس کے جذبات کو آخری نقطۂ حدت تک پہنچا دیا تھا۔ ستمبر میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کلکتہ میں ایک سخت ٹکر ہوئی۔ اس فساد کے سلسلہ میں قانون تحفظ ہند کے تحت بہت سے لوگوں کو جلا وطن اور نظربند کر دیا گیا۔ اس فساد کا سبب اسلام کے متعلق ایک اینگلو انڈین اخبار کی دریدہ دہنی تھی جس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے بنگال کے مسلمانوں نے علما کی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ حکومت نے آخر وقت پر اس اجتماع کو ممنوع قرار دیکر روکنا چاہا اور جب اجتماع شروع ہوا تو دو دن

تک اُس پر پولس اور فوج نے گولیاں برسائیں حتّٰی کہ کولوٹولہ کی مسجد کے اندر بھی مسلمان قتل کئے گئے۔

مسلم لیگ اور کانگریس کا سالانہ اجلاس دو ہی مہینہ بعد دہلی میں ہونے والا تھا اور یہ بات ظاہر تھی کہ یہی اجلاس راستہ کا وہ موڑ ہے جہاں سے "جنگ آزادی" کا آغاز ہوگا۔

دہلی کا تاریخی اجتماع

لیگ کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے اور کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم صاحب منتخب ہوئے تھے۔ ستمبر سے آخر دسمبر تک اُن کا تمام وقت لیگ وکانگریس کے اجلاسوں کی تیاری کے کام صرف ہوا۔ حتّٰی کہ جس کام کو وہ کسی حالت میں ترک نہ کرتے تھے یعنی مطب وہ بھی ترک ہوگیا۔ جن لوگوں نے ۱۹۱۸ء کا آخری زمانہ دہلی میں دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتے کہ کس انہماک کے ساتھ حکیم صاحب ان کاموں میں مصروف تھے۔ لیگ کے صدر بنگال کے مسلمان لیڈر مولوی فضل الحق منتخب ہوئے۔ لیگ نے اپنے اس اجلاس میں مسلمانوں کے اور ملک کے چار سب سے اہم مسائل پر بحث کی۔

(۱) حق انتخاب حکومت

(۲) مسئلہ خلافت

(۳) مسئلہ تحفظ اماکن مقدسہ اور جزیرۃ العرب

(۴) ہندو مسلم اتحاد

علما میدانِ سیاست میں

اس اجلاس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ تمام ہندستان کے علما

مدعو کئے گئے تھے اور موجود تھے یعنی اسی اجلاس سے ملک کی سیاست میں علما کی شرکت کا آغاز ہوا۔ اس موقعہ پر جماعت علما کے خیر مقدم میں جو تقریریں ہوئیں اُن کا جواب دیتے ہوئے مولانا کفایت اللہ نے فرمایا کہ

علما عامتہ الناس سے کبھی علٰحدہ نہیں رہے وہ مسلمانوں کے کسی فریق سے کبھی جدا نہیں رہے اور نہ اب ہیں اور نہ آیندہ رہیں گے۔ علما کسی جماعت سے علٰحدگی کو پسند ہی نہیں کرتے۔ اُن کا مطمح نظر علٰحدگی نہیں ہے

اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"اسلام میں مذہب اور سیاست دو علٰحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ ایک زمانہ تک مذہب و سیاست یکجا رہے ہیں مگر اب شاید نئی تعلیم یافتہ جماعت نے مذہب اور سیاست کو علٰحدہ سمجھ لیا۔ مگر اُن کا یہ خیال غلط ہے اُنہوں نے یہ سوچا کہ مذہب تو علما کے حوالے کردو اور سیاست کو اپنے لئے مخصوص کردو۔"

آج یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ کس حد تک مذہب اور سیاست یکجا ہو سکتے ہیں۔ یہ محل اس بحث پر کچھ کہنے کا نہیں ہے لیکن واقعات نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ سوائے خاص خاص علما کے جو شخصی طور پر سیاسی مسائل کے لئے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا رکھتے ہیں، عام طور پر ہر جبہ و عمامہ کا سیاست کے میدان میں آجانا گو کہ وقتی طور پر خلافت کی تحریک کے لئے مفید ثابت ہوا ہو لیکن بعد کو

اور گذشتہ چند سال میں جب انگریزوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ہندوؤں اور کانگریس کے خلاف استعمال کیا سیاست اور مذہب کی یہ آمیزش ملک کی سیاسی تعمیر کے لئے بہت ہی مضر ثابت ہوئی۔ خلافت کی تحریک کے شروع ہونے تک قوم کی سیاسی زندگی سے علما کا تعلق برائے نام بھی نہ تھا سوائے اُن چند مجاہدین اور اُن کے متعقدین کے جنہوں نے ۵۷ء کے بعد ملک کی آزادی کی تحریک کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ عام طور پر علما کی جماعت اپنے حجروں میں اور اپنے مریدوں کے اجتماع میں قال اللہ وقال الرسول سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ بہرحال اس اجلاس میں علما کی شرکت نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نئے تجربہ کا آغاز کیا۔ اس نئے محاذ کی بنیاد حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ تحریک خلافت کے دوران میں اور اُس کے بعد خود مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کو اس تجربہ کے جن نتائج کا مقابلہ کرنا پڑا ان پر اوراق میں بحث کرنا بے محل ہوگا۔

پہلے مسلمان یا پہلے ہندستانی؟ گو کہ لیگ کے پلیٹ فارم پر اس وقت بعض مذہبی مسائل سب سے زیادہ نمایاں تھے لیکن ملک کی آزادی کا سوال بھی پوری قوت کے ساتھ سامنے آگیا تھا۔ حکیم صاحب نے حق انتخاب حکومت کے متعلق ایک قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> اس معاملہ میں مختلف طریقوں سے مختلف اصحاب نے ممبران لیگ کے طبائع پر اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

کوئی کہتا ہے اول ہم لوگ مسلمان ہیں پھر ہندستانی۔ مگر
صوبجات کی اندرونی آزادی سے کسی کے مسلمان ہونے
کا کیا تعلق ہے.......... بھائیو۔ بدگمانی سے کوئی
فائدہ نہیں۔ کوئی مجھے بتائے کہ اہل اسلام نے اس بدگمانی
کی بنا پر۔ ۳۰ سال تک کانگریس سے علیحدہ رہ کر کیا فائدہ
اُٹھایا۔ میرے خیال میں تو کانگریس سے علیحدہ رہ کر ہمارا
اس قدر نقصان ہوا ہے کہ اُس کی تلافی دشوار معلوم ہوتی
ہے۔ پس کیوں اپنے ہموطنوں کے ساتھ قدم آگے نہ
بڑھایا جائے۔ اس قسم کی باتوں میں پیچھے رہنے سے مسلمانوں
کو نقصان پہنچنے کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ مسلمانوں
اور ہندوؤں کی رایوں کی جو نسبت بتائی گئی ہے یہ اگر
صحیح بھی ہو تو اس کا علاج کیا ہے۔ اگر اسی نسبت کا خیال
کیا جائے تو یقین کر لیجئے کہ تا قیامت ہندستان کے مسلمان
کسی تحریک ترقی میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ بیشک بعض
اوقات کچھ ہندوؤں کی طرف سے بہت بڑے تعصب
اور تنگ خیالی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ہندو ایسی زیادتی کریں
وہ یقیناً قابل نفرت ہیں۔ لیکن اُن کی وجہ سے ملک کی ترقی کو
کیوں رد کا جائے۔ شاہ آباد میں جن ہندوؤں نے مسلمانوں
کے ساتھ زیادتی کی وہ سزائیں بھگت رہے ہیں۔ کٹارپور
کے ظالموں کو بھی ضرور سزائیں ملیں گی۔ مگر ان واقعات
سے ملک کی ترقی میں روڑا اٹکانا سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔

اس قسم کے فسادات انسانی فطرت کی کمزوری پر مبنی ہوتے
ہیں۔ بھائیوں میں بھی بعض اوقات لڑائیاں ہو جاتی ہیں
مگر ان لڑائیوں کی وجہ سے خاندان مشترکہ کی فلاح و بہبود
سے ہاتھ اٹھا لینا دانائی کے خلاف ہے۔

جیسا کہ حکیم صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے لیگ کے
اجلاس میں بہت سے مسلمان شاہ آباد اور کرتار پور کے واقعات سے
متاثر تھے اور یہ فتنہ انگیز سوال پیدا ہو چکا تھا کہ پہلے مسلمان یا پہلے ہندستانی۔
جس سیاسی عقیدہ کو حکیم صاحب نے اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا وہ اُن
کا بنیادی عقیدہ تھا اور وہ کبھی دوسرے واقعات سے متاثر ہو کر
اس عقیدہ سے سرمو روگرداں نہ ہوسکے۔ اسی اجلاس مسئلہ خلافت اور
اماکن مقدسہ کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ

"جنگ کی وجہ سے مسلمان سلطنتیں متزلزل ہو رہی ہیں۔
اس وقت قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کئے جا رہے ہیں۔
بہت پُرانے قصے چکائے جا رہے ہیں۔ خدا جانے
کہ فیصلے کیا ہونگے۔ کہاں تک انصاف کیا جائے گا
اور انصاف کا کیا رنگ ہوگا۔ اس حالت میں آپکا فرض
ہے کہ آپ اپنے جذبات برملا ظاہر کریں۔ دنیا کا نظام
سیاسی بدلنے والا ہے۔ نہیں معلوم وہ کس طرح بدلے گا۔
انصاف کمزور اقوام کے ساتھ ہی ہوگا یا وہ گوری اقوام
کے لئے مخصوص رکھا جائے گا۔ آزادی کا دستور سب کے
ساتھ یکساں ہوگا یا کسی کو زیادہ اور کسی کو کم اُس کا حصہ ملے

سمجھا جائے گا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو ہم کو اپنی خواہش ظاہر
کر دینی چاہئیں .... یہ آواز خواہ سیاسی سمجھی جائے
یا مذہبی مگر یہ ہمارے دل کی آواز ہے ....

نظربندوں کے متعلق حکیم صاحب کا لہجہ اور بھی زیادہ تلخ تھا۔

لیگ کے اس اجلاس کی ایک اور نمایاں خصوصیت وہ خطبہ تھا جو ڈاکٹر انصاری نے جماعت استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے پڑھا۔ اس خطبہ کی اہمیت کا اظہار کرنے کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ سرکار نے فوراً ہی اُسے ضبط کر لیا اور اُس کی اشاعت ممنوع قرار دیدی، لیکن اس سے پہلے اُس کی ہزارہا کاپیاں ملک میں تقسیم ہو چکی تھیں اور ڈاکٹر انصاری کا پیام اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا۔

اس خطبہ میں ڈاکٹر انصاری نے ایک طرف تو مستند احکام شرعی پیش کر کے ثابت کیا تھا کہ خلافت اور اماکن مقدسہ کا تحفظ مسلمانوں کے لئے کتنا ضروری ہے اور دوسری طرف ہندستان کے سیاسی حقوق کے مطالبہ کی پوری پوری وکالت کی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لیگ کے پلیٹ فارم پر اس خطبہ نے ہندی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک نیا دروازہ کھولا اور اُن کے سامنے باعزت زندگی کی ایک نئی منزل پیش کی۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے مذہبی مسائل کی صحیح نوعیت کو صاف صاف بیان کر کے کانگریس اور مہاتما گاندھی کی ہمدردیاں بھی مسلمانوں کے ساتھ کر لیں۔ اسی طرح حکیم صاحب نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو خطبہ پڑھا وہ ایسا تھا جس میں بیک وقت ملک کے سیاسی مسائل اور مسلمانوں کے مذہبی مسائل کا توازن قایم کیا گیا تھا

ان دونوں خطبوں نے اُس سوال کو منہدم کر دیا کہ پہلے مسلمان یا پہلے ہندستانی اور اب کانگریس کے تمام لیڈر سوچنے لگے کہ جب مسلمان ملک کی آزادی کے سوال میں پوری طرح اُن کے ساتھ ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک بڑے مذہبی مسئلہ میں تمام ہندو مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں۔ درحقیقت مذہب اور سیاست کے اس امتزاج کا سارا نقشہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ہی کا بنایا ہوا تھا۔ اس نقشہ کے ہر خانہ میں انگریز کے قدیم اصول "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی شکست لکھی ہوئی تھی۔

کانگریس کا نیا رُخ

اب کانگریس کا رُخ بھی بدلا۔ ایک طرف تو اُس کے پلیٹ فارم پر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی مسائل نے اہمیت حاصل کی اور دوسری طرف آئینی اصلاحات، سیلف گورنمنٹ، رولٹ کمیٹی "حق انتخاب حکومت" اور ایسے تمام ملکی مسائل کے متعلق اُس کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کی آواز بلند ہونے لگی۔ درحقیقت دہلی کے اجلاس کانگریس کے اس کارنامہ میں بڑا حصہ حکیم صاحب ہی کا تھا۔ اس موقعہ پر کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو قرار دادیں منظور کی گئیں وہ خود اس حقیقت پر دلیل ہیں۔ ایورویدک اور طب یونانی کے متعلق پہلی دفعہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے آواز اٹھی۔ انگلستان کو کانگریس کا ایک سیاسی وفد بھیجنے کی تجویز منظور ہوئی جس کے ایک رکن حکیم صاحب بھی منتخب ہوئے۔

خلافت اور اماکن مقدسہ کے متعلق اسی اجلاس کے دوران میں

حکیم صاحب کے مکان پر کانگریسی لیڈروں سے مشورے ہوتے رہے اور پہلی دفعہ مہاتما گاندھی نے بتایا کہ وہ کن خطوط پر قومی تحریکوں کو چلانا چاہتے ہیں۔

قصہ مختصر دسمبر ۱۹۱۸ء کی آخری تاریخیں، دہلی ہندستان اور خود حکیم صاحب کی زندگی کے اہم ترین دن تھے جب ہندستان میں ایک نئی ملت جنم لے رہی تھی اور متحدہ قومیت کا ایک نیا نظام وجود میں آرہا تھا۔ اس نظام کا نقشہ بنانے والے مہاتما گاندھی تھے اور معمار کانگریس کے وہ لیڈر تھے جو اب مہاتماجی کے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے۔

اس دور کی قیادت اور بعد کی قیادت عظمیٰ

لیگ کے اجلاسوں کے آخری دن جب سکرٹری کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو اس کے متعلق حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری اور دوسرے مسلمان لیڈروں اور نوجوان جماعت کے درمیان ایک ناخوشگوار اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات کا بیان کرنا چنداں ضروری نہیں صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ نوجوانوں کی وہ جماعت جس کے سردار حکیم صاحب ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی تھے، راجہ صاحب محمود آباد اور خصوصاً سید وزیر حسن سکرٹری مسلم لیگ کے طرز عمل سے غیر مطمئن ہو گئی تھی اور چاہتی تھی سکرٹری کے عہدہ پر کسی دوسرے شخص کا انتخاب ہو لیکن یہ اصحاب راجہ صاحب محمود آباد کی تائید کر رہے تھے جن کا کہنا یہ تھا کہ وہ بغیر سید وزیر حسن کے لیگ کی صدارت قبول نہ کریں گے۔ اس اختلاف

نے ایک اصولی اختلاف کی صورت اختیار کر لی تھی حتیٰ کہ لیگ کی کونسل کے جلسہ میں بھی برسرمیدان نوجوان جماعت کے لوگوں نے اپنے لیڈروں سے اختلاف کرنا ضروری سمجھا اور یہ جلسہ بہت ہی ناخوشگوار حالات میں ختم ہوا۔ اس ناخوشگوار اختلاف کی طرف اشارہ کرنا ضروری نہ ہوتا اگر اُس زمانہ کی سیاست اور اُس زمانہ کے لیڈروں کی فراخدلی کا ایک خاص پہلو نمایاں کرنا مدنظر نہ ہوتا نوجوانوں کی جو جماعت اس مسئلہ میں حکیم صاحب اور دوسرے لیڈروں کے طرزِ عمل سے اختلاف کر رہی تھی وہ ان اصحاب کے مخلص احباب اور نیازمندوں کی جماعت تھی۔ اُس جماعت میں بعض تو ایسے جانباز تھے جو حکیم صاحب کے ہر نقش قدم کو اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتے تھے۔ لیکن اُس اثر و اقتدار کے باوجود جو اُس زمانہ کی سیاست میں بجا طور پر ان محبوب قائدین کو حاصل تھا اُن کی قیادت اتنی زیادہ خودمختار بھی نہ تھی کہ اپنے عقیدتمندوں کی آزادی رائے کو سلب کر سکتی۔ وہی لوگ جو حکیم صاحب یا ڈاکٹر انصاری کے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے جب ضرورت سمجھتے تھے تو بے محابا ان دونوں کی رائے سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ مگر اس اختلاف رائے سے کبھی اُس باہمی اعتماد اور عقاید اور اصولوں کے اتحاد میں فرق نہ آتا تھا جو پوری جماعت کو متحد رکھتا تھا اور نہ کبھی کوئی نوجوان صرف کسی ناگوار اختلاف کی وجہ سے اپنے لیڈروں کے اعتماد سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ یہ انفرادی اور اجتماعی تعلق اس کامل یقین پر مبنی تھا کہ اگر ان میں سے کوئی غلطی بھی کرے گا تو وہ اجتہادی

غلطی ہو گی اور اس کا سبب ہٹ دھرمی، ضد یا بد دیانتی نہیں ہو سکتا۔ کس قدر بعد المشرقین تھا اس زمانہ کی قیادت اور بعد کی "قیادت عظمیٰ" کے درمیان! دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشے دیکھے کہ "قائد اعظم" کے حضور میں اُن کے قریب ترین شرکائے کار بھی دم مارنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ جس کسی نے ایک دفعہ مزاج قیادت کے خلاف ایک سانس لی اور ایک حرف عرض کیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردود قرار پایا۔ لکھی جائے تو ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان ہندستان میں مسلمانوں کی "قیادت عظمیٰ" کا یہ دور کم و بیش اُس دور سے مشابہت رکھتا ہے جو یورپ میں ایک بے پناہ آمریت کا گذرا۔ اس آمریت کا نتیجہ یہ ہوا کہ "قائد اعظم" نے انگریزوں کی مدد سے پاکستان تو بنا لیا لیکن وہ جمہوریت آزادیٔ ضمیر اور آزادی رائے کی کوئی روایت قایم نہ کر سکے قطع نظر اس امر کے "قائد اعظم" نے پاکستان اور پاکستان کے ساتھ اپنی قیادت عظمیٰ کی عظمت کا ایک اونچا مینار تعمیر کر لیا دنیا کا آنے والا مورخ کس طرح اس حقیقت کو بھول جائے گا کہ پاکستان جب "قیادت عظمیٰ" کے عظمتوں اور بڑائیوں سے آباد اور آراستہ ہوا تو ساتھ ہی ساتھ خود قائد اعظم کے ہمقوموں کے کروڑوں گھر بے چراغ اور کروڑوں دل ویران ہو گئے! بہر حال کہنا تو صرف اتنی سی بات تھی کہ ایک وہ ۱۸ء کی قیادت تھی جس کے حاشیہ نشیں اپنے بڑے سے بڑے لیڈر پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کر سکتے تھے اور پھر بھی دائرہ عقیدت و خدمت سے خارج نہ ہوتے تھے اور ایک ۴۷ء و ۴۸ء کی وہ قیادت تھی

جس کے حاشیہ نشیں زبان حال سے عرض کرتے تھے کہ

ہمیں تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے!

اس قیادت اور اُس قیادت کا تفاوت مسلمانوں کے سیاسی نشیب و فراز کی ایک تفسیر ہے — دن کی روشنی کی طرح صاف! اس چوکھٹے میں حکیم صاحب کے کردار کی تصویر بہت نمایاں ہے۔ اُن کے اکثر عقیدتمند اُن پر "کمزوری" اور "مروت" کا الزام لگایا کرتے تھے اس لئے کہ وہ دوسروں کی خطاؤں کو بہت جلد معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ بُرے سے بُرا آدمی بھی اُن کے قریب پہنچ سکتا تھا اور بہت سے دنیا پرست آسانی سے انہیں دھوکہ میں بھی ڈال سکتے تھے۔ ایک پہلو سے دیکھئے تو یہ خصوصیات بہت اعلیٰ انسانی اور اسلامی اخلاق کا نمونہ تھیں، لیکن پبلک زندگی کی کشمکش میں ان ہی خوبیوں سے بعض اوقات دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ اُن کے خاص خاص احباب بھی اکثر اُن کی فطرت کے اس پہلو پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی خصوصیت اُن کی اُس ارفع انسانیت کا پرتو ہے جسے اُن کا ظاہر چھپائے رکھتا تھا۔

داستان کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے ٹوٹ گیا تھا، وہ اب پھر اس طرح شروع ہوتی ہے کہ لیگ کے اجلاس کے بعد ۱۹ءکے ابتدائی مہینوں میں حکیم صاحب زیادہ تر طبی تحریک کے سلسلہ میں مصروف رہے دہلی میں اُنہوں نے اطبا اور ویدوں کی ایک اہم کانفرنس طلب کی جس میں زیادہ زور اس بات پر دیا کہ اب تمام ہندستان میں متعدد طبی کالج قایم کئے جائیں۔ اس اجتماع میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے

بھی شرکت کی اور تمام شرکا یہ وعدہ کرکے اٹھے کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں ان کالجوں کے قایم کرنے کی کوشش فوراً شروع کردینگے لیکن ۱۹ء کا سیاسی موسم بہت گرم ہوگیا اور خلافت اور سوراج کی تحریکوں نے بقیہ تمام قومی تحریکوں کو ملتوی کر دیا۔

۲۱ر فروری کو جب کراچی کی طبیہ کانفرنس میں حکیم صاحب بحیثیت صدر تشریف لے گئے تو وہاں بھی اُنہوں نے جدید کالجوں اور مدرسوں کے قیام پر زور دیا۔

امیر حبیب اللہ خاں اور امان اللہ خاں

۲۱ر فروری کو حکیم صاحب نے کراچی کی طبیہ کانفرنس میں اپنا خطبہ پڑھا اور اُس کے دوسرے ہی دن افغانستان میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے حکیم صاحب ذاتی طور پر بہت متاثر ہوئے۔ ۲۲ر فروری کو جلال آباد کے قریب امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دئے گئے۔ جس زمانہ میں امیر ہندستان آئے تھے تو اُن کے اور حکیم صاحب کے درمیان خاص شخصی تعلقات پیدا ہوگئے تھے اور وہ حکیم صاحب کے فہم و تدبر سے اس قدر متاثر ہوگئے تھے کہ افغانستان واپس جانے کے بعد انہوں نے اپنے معاملات ملکی میں حکیم صاحب سے مشورہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ افغانی سفیر متعینہ دہلی کے ذریعہ سے وہ اکثر خاص خاص امور میں حکیم صاحب کی رائے دریافت کرتے رہتے تھے۔ اس طرح حکیم صاحب افغانستان کے اندرونی حالات سے بہت زیادہ واقف ہوگئے تھے۔ اسی لئے امیر کے قتل کی خبر سن کر اُن کو بہت اندیشہ تھا کہ ملک میں طوائف الملوکی شروع ہو جائے گی۔ لیکن عین وقت پر

امان اللہ خاں نے حالات کو سنبھال لیا۔ اُن سے بھی حکیم صاحب کے تعلقات بہت جلد قایم ہو گئے اور اس میں شک نہیں کہ اُس آخری ملاقات تک جو وفات سے چند ہی روز پہلے حکیم صاحب کی امان اللہ خاں سے ہوئی افغانستان کے مسائل میں ان دونوں کے درمیان اکثر مشورے ہوا کرتے تھے۔ راتوں کو ٹیلیفون پر امیر سے باتیں ہوتی تھیں اور دستی خطوط آتے جاتے تھے۔ اسی طرح بعض دوسرے اسلامی ممالک کے ارباب کار سے بھی حکیم صاحب کے شخصی تعلقات قایم رہتے تھے۔ اسلامی ممالک کے علاوہ وہ ایشیائی قوموں کے حالات سے بھی بہت متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ آخر زمانہ میں جب چین میں سخت جنگ جاری تھی اور ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ ہندستان کے اخباروں میں سب سے پہلے چین کی خبریں ڈھونڈھا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی وسعت نظر اور تعلقات کے اعتبار سے اُس وقت حکیم صاحب ڈاکٹر انصاری مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کی وسعت نظر وہی تھی جو آج پنڈت جواہرلال نہرو کی ہے۔

سیاہ قانون فروری کے مہینے میں بہت جلد جلد اہم واقعات اور حادثات رونما ہوتے رہے۔ کراچی سے حکیم صاحب واپس آئے تو جو مادہ تیار تھا وہ رولٹ ایکٹ کے کونسل میں پیش ہوتے ہی پھوٹ نکلا۔ ہوم رول لیگ کی جد و جہد نے ایک فضا پیدا کر دی تھی۔ مہاتما گاندھی اب اپنے دستور العمل کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے اور اجمل خاں کی سیاسی زندگی کا آفتاب بھی اب نصف النہار پر آ گیا تھا۔

ہندستان میں دامن ہمالیہ سے سیلون تک اور پشاور سے کلکتہ تک ہزاروں احتجاجی جلسے ہر روز ہو رہے تھے اور ہوا میں لاکھوں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ۶ فروری کو رولٹ بل کونسل میں پیش ہوا جس کا منشا صرف یہ تھا کہ جنگ کے بعد بھی ایک دوسری صورت میں قانون تحفظ ہند کے جابرانہ اختیارات کو حکومت کے ہاتھ میں باقی رکھا جائے۔ امپریل کونسل کے تمام غیر سرکاری ممبران کی جانب سے بہت شدید مخالفت کا اظہار کیا گیا۔ لیکن حکومت اس مخالفت سے صرف اتنی ہی متاثر ہوئی کہ اُس نے اعلان کر دیا کہ یہ قانون مستقل نہ ہوگا بلکہ عارضی تین سال کے لئے پاس کیا جائے گا۔ بمبئی میں مسز بسینٹ اس "سیاہ قانون" کے خلاف سخت شورش پیدا کر رہی تھیں۔ یکم مارچ کو مہاتما گاندھی نے بھی ستیاگرہ کا اعلان کر دیا۔ اور حکومت کو خبردار کر دیا کہ اگر یہ قانون پاس کیا گیا تو وہ اپنی تحریک کو ملک کے سامنے پیش کر دیں گے۔ لیکن اُن کے اس اعلان نے اعتدال پسند طبقہ کے اعصاب کو متاثر کر دیا۔ چنانچہ اُن لوگوں کی طرف سے ستیہ گرہ کی تجویز کے خلاف ایک اعلان شائع ہوا۔

شروع مارچ میں قومی لیڈروں کی ایک کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی وہاں بھی کچھ لوگ خلاف ورزی قانون کی تحریک کے متعلق متردد تھے۔ لیکن حکیم صاحب اور پنڈت موتی لال نہرو کی کوشش سے پوری قوم پرست جماعت متفق ہو گئی۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی ویسرائے سے ملنے گئے۔ جیسا کہ خیال تھا اس ملاقات میں سمجھوتہ اور صلح کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ ۱۸ مارچ کو کونسل میں "سیاہ قانون" پاس ہو گیا اور مہاتما گاندھی

نے ۳۰ر مارچ کو تمام ہندستان میں ہڑتال کرنے کی ہدایت جاری کی۔ بعد کو ۳۰ر مارچ کے بجائے ۶ر اپریل ہڑتال کی تاریخ مقرر کی گئی۔ لیکن دہلی میں تاریخ کے اس تغیر کی اطلاع بروقت نہ پہنچ سکی اس لئے ۳۰ر مارچ ہی کو ہڑتال شروع ہو گئی۔

ملک کے ہر طبقہ میں احساسات بیدار ہو گئے تھے اور ایسے لیڈر بھی جو مہاتما گاندھی کے اصول کار سے متفق نہ تھے بڑی حد تک عام احساسات کا ساتھ دے رہے تھے۔ اعتدال پسند طبقہ کے ایک نمایاں لیڈر سر نیواس شاستری نے تو کونسل ہی میں صاف کہدیا تھا کہ:۔

> شورش شروع ہو گئی ہے۔ اگر ہمارا اپیل نہیں سنا جاتا اور قانون پاس کیا جاتا ہے تو مجھے یقین نہیں کہ کوئی شخص بھی ایسا یہاں ہوگا جو اس شورش میں شریک نہ ہو اور پھر یہ سمجھے کہ وہ اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے گوشہ عزلت سے مہاتما گاندھی کو جو پیام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ:۔

> میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ ہماری روحانی آزادی کو کمزور کرنے والی کوئی چیز آپ کے راستہ میں حائل نہ ہو۔ حق کے لئے شہادت کا جذبہ محض ظاہری توہم پرستی اور مذہبی جنون میں نہ بدل جائے اور وہ خود فریبی پیدا نہ ہو جائے جو قابل احترام ناموں کے پردے میں اپنا چہرہ چھپایا کرتی ہے۔

دہلی کے ہنگامہ کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ملک کی عام حالت

کا اندازہ حسب ذیل مختصر روزنامچہ سے ہو سکتا ہے۔

یکم - ۴ فروری		رولٹ ایکٹ کے خلاف تمام ملک میں جلسے
۶	فروری	رولٹ بل کونسل میں پیش ہوا۔
۱۶	"	مسز اینی بیسنٹ نے بمبئی میں شورش شروع کی
یکم - مارچ		مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کا اعلان کیا
۱۸	"	قانون پاس ہو گیا
۲۳	"	مہاتما گاندھی نے ۶ اپریل کو ہڑتال کرنے کی ہدایت کی۔
۳۰	"	دہلی میں عظیم الشان جلسہ اور بلوہ
۳۱	"	دہلی میں عام ہڑتال اور جنازوں کا جلوس
یکم - اپریل		دہلی میں عام ہڑتال
۲	"	امرتسر میں کچلو اور ستیہ پال کو تقریریں کرنے کی ممانعت
۶	"	تمام ہندستان میں ہڑتال
۹	"	مہاتما گاندھی پلول کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔
۱۰	"	ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری
	"	امرتسر میں بلوہ۔ کئی انگریز مار ڈالے گئے
		لاہور میں گولی چلی۔
		احمد آباد میں بلوہ ہوا۔
"	"	ویرمگام میں بلوہ۔
		سورت میں بلوہ
۱۲	"	لاہور میں گولی چلی۔ ریلوے اسٹیشن لوٹ لیا گیا۔
		قصور میں بلوہ۔

۱۳ - اپریل جلیانوالہ باغ میں ڈائر نے گولی چلائی۔ ... ۵ مقتول ۱۵سو زخمی۔

۱۴ ؍؍ گجرانوالہ میں بلوہ۔ تمام سرکاری عمارتیں جلادی گئیں۔

بٹالہ میں بلوہ

رہتک میں بلوہ

دہلی میں ہڑتال اور کشت وخون۔

وائسرائے نے پنجاب میں مارشل لا کا اعلان کردیا۔

حافظ آباد۔ وزیرآباد۔ گجرات اور جہلم وغیرہ میں بلوے۔

۱۷ ؍؍ دہلی میں پھر بلوہ۔

دہلی میں حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، سوامی شردھانند، رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ، ستیہ گرہ اور ہڑتال کے طوفان میں بجائے ۶ اپریل کے ۳۰ مارچ ہی کو مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ تین ہفتے دہلی میں ۵۷ء کے حالات کی یاد دلاتے تھے اور یہی وہ تین ہفتے تھے جب دہلی میں حکیم صاحب بے تاج کے بادشاہ بن گئے۔ راقم الحروف کی طرح جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے وہی جان سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کی شخصیت کے بہترین جوہر اس موقعہ پر کس طرح نمایاں ہوئے۔ ۳۰ مارچ کو جب "یوم دعا" اور ہڑتال کے سلسلہ میں ریلوے اسٹیشن پر بلوہ کا آغاز ہوا اور عوام پر گولی چلائی گئی تو اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے عوام نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کے اراکین رائے صاحب پیارے لال، حکیم صاحب، رائے بہادر سلطان سنگھ وغیرہ تھے۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب اور دوسرے مقامی لیڈر ہڑتال کو ختم کرانے کی کوشش کررہے تھے، لیکن پولس اور فوج کی موجودگی کی وجہ سے ہر جگہ عوام کے اشتعال میں اضافہ ہوتا تھا۔

۱۴ر اپریل کو دہلی کے ڈپٹی کمشنر نے قیام امن کے لئے معززین شہر کا ایک جلسہ کیا۔ حکیم صاحب بھی اُس جلسہ میں شریک تھے، لیکن اُس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ ۶ر اپریل کو پھر پولس اور فوج کی اشتعال انگیزی کی وجہ سے شہر کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ ۸ر اپریل کو جب مہاتما گاندھی بمبئی سے دہلی آرہے تھے تو پلول کے اسٹیشن پر اُنہیں گرفتار کر کے بمبئی واپس بھیج دیا گیا اور دہلی اور پنجاب میں اُن کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا اس واقعہ نے ہڑتال اور انتقام کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ہر روز دہلی میں بہت بڑے بڑے جلسے ہوتے رہے۔ ۱۴ر اپریل کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ چیف کمشنر نے ۱۴ معززین شہر کو ٹاؤن ہال میں بلایا۔ حکیم صاحب بھی وہاں گئے۔ ٹاؤن ہال کے گرد جو ہزارہا آدمی جمع تھے اُن کے دلوں میں کسی طرح یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ شاید حکیم صاحب کو گرفتار کر لیا جائے گا یا مار ڈالا جائیگا۔ سرکاری فوج بھی کثیر تعداد میں ٹاؤن ہال کے احاطہ میں موجود تھی۔ اس شبہ نے یقین کی صورت اختیار کر لی اور مجمع تیار ہوگیا کہ ٹاؤن ہال پر حملہ کر دے۔ جب اس صورت حال کی خبر ٹاؤن ہال کے اندر پہنچی تو ڈپٹی کمشنر نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ باہر جا کر لوگوں کو مطمئن کریں۔ چنانچہ حکیم صاحب باہر آئے۔ اُس زمانہ میں اُن کا نام دہلی کے عوام کے لئے جادو کا اثر رکھتا تھا۔ اُسی دن شام کو ایڈورڈ پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ایک سی۔ ای۔ ڈی کا انسپکٹر اور ایک ہیڈ کانسٹبل سخت زخمی کیا گیا۔ اس واقعہ کا اثر حکیم صاحب کے دردمند دل پر اتنا تھا کہ جب تک وہ دونوں ہسپتال میں رہے حکیم صاحب دونوں وقت اُن کو دیکھنے جایا کرتے تھے حالانکہ یہ انسپکٹر وہ شخص تھا جس کے

متعلق معلوم تھا کہ وہ عرصہ تک حکیم صاحب کے متعلق اپنی سرکاری خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اس حادثہ کے بعد اُس نے سرکاری ملازمت سے استعفےٰ دیدیا اور حکیم صاحب نے ایک بڑی رقم نقد اُس کو دیکر موٹر کار کا کاروبار شروع کرادیا اور چند روز ہی بعد اُسے حکومت افغانستان کی موٹروں کا ٹھیکہ دلوا دیا۔ چنانچہ چند ہی سال میں اُس کا کاروبار کہیں سے کہیں پہنچا۔ ہزاروں مثالوں میں سے یہ ایک مثال حکیم صاحب کی اُس فطری فراخدلی اور انسانی ہمدردی کی ہے جس کے دروازے ہمیشہ دوست اور دشمن سب کے لئے کھلے رہتے تھے۔

۱۵ اراپریل کو حکیم صاحب اور سوامی شردہانند نے شہر کے بازاروں کا گشت کرکے ہڑتال ختم کرانے کی کوشش کی لیکن ۱۶ اراپریل کو جب بازاروں میں پھر فوج اور پولس آگئی تو شہریوں نے پھر ہڑتال کردی۔ ڈپٹی کمشنر کو سمجھایا گیا کہ وہ پولس اور فوج کے مظاہرے بند کردیں ورنہ اہل شہر کا اشتعال کم نہ ہوگا چنانچہ ۱۷ اراپریل کو پولس کے ہٹتے ہی دوکانیں کھلوادی گئیں۔ لیکن ۱۱ بجے دن کو پھر پولس بازار میں نظر آئی اور پھر ہڑتال ہوگئی۔ ان واقعات کی تفصیلات اُس زمانہ کے قومی اخباروں میں برابر شائع ہوتی رہیں۔ دہلی کی ہڑتال اُس زمانہ کی سیاسی تحریک کا ایک ایسا اہم واقعہ تھا کہ اُس کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے اور اگر لکھی جائے تو اُن اوراق پر حکیم صاحب کی تصویر بہت نمایاں نظر آئے گی۔ ہم حکیم صاحب کے متعلق ڈاکٹر انصاری کے قلم سے اُس زمانہ کے کچھ مختصر حالات پیش کرتے ہیں۔

"تمام شہر میں انتقام کا ایسا جذبہ بھڑک اٹھا تھا کہ پبلک

بالکل آپے سے باہر ہوگئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے اگر اپنی بے مثل شخصیت سے کام نہ لیا ہوتا تو یقینی ۱۸۵۷ء کا جیسا قتل عام جس کے لئے حکومت بالکل تیار تھی دلی میں دوبارہ ہوتا۔

اُس زمانہ میں یوں کہنا چاہیئے کہ حکیم صاحب دلی کے بے تاج کے بادشاہ تھے۔ تمام محلوں میں سے نمایندے منتخب ہوکر ایک پنچایت بنائی گئی تھی پنچایت نے حکیم صاحب کو اپنا صدر اور پانچ آدمیوں کو مختلف شعبوں کا رکن بنایا تھا۔ شہر کے امن و امان، صفائی، تجارت، اور ہر قسم کی دیکھ بھال پنچایت کے کارکن کرتے تھے بعض دن تو شہر میں ایک پولس مین بھی نہ رہتا تھا لیکن کانگریس اور خلافت کے والنٹیر شہر کی حفاظت و امن کا پورا انتظام کرتے تھے۔ حکیم صاحب کا دماغ انتظامی اور تعمیری کاموں کے لئے مخصوص تھا۔ اس زمانہ میں ہم کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کس خوبی سے اور خاموشی کے ساتھ وہ کام کیا کرتے تھے۔ اُن کا گھر شہر کا قلب اور کاموں کا مرکز تھا۔ ایک ہی وقت میں ایک طرف مریضوں کو دیکھتے تھے، دوسری طرف پنچایت کے ممبروں سے کچھ شہر کے انتظامات کا مشورہ ہوتا رہتا تھا۔ تیسری جانب طبیہ کالج کے متعلق کچھ کمیٹی بھی ہوتی رہتی تھی اور ہر ایک کو حکیم صاحب نہایت مناسب اور موثر مشورہ اور رائے دیتے تھے۔ اُن کے

دماغ کی ساخت ایسی غیر معمولی تھی کہ ایک آن واحد میں
مختلف قسم کے کام وہ کر سکتے تھے۔ نپولین بوناپارٹ
کے متعلق تو یہ ضرور سنا گیا ہے کہ وہ بیک وقت متعدد
کام کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے تو یہ بات حکیم صاحب ہی
میں دیکھی کہ ایک وقت میں مختلف نوع کی اہم خدمات
معقولیت اور سنجیدگی سے انجام دیتے تھے۔ میں نے
کوئی دوسرا نہ ایسا آدمی دیکھا نہ سنا۔"

اُس زمانہ میں حکیم صاحب کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک واقعات کی کشاکش انہیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھی۔ ابھی ایک طرف سے گشت کرکے واپس آئے ہیں، اور ابھی دوسری طرف سے بدامنی کی اطلاع آئی تو اُدھر روانہ ہو گئے۔ دو دو تین تین دن بغیر کھائے اور کئی کئی راتیں بستر پر آرام کئے بغیر گذر گئیں۔ اُن کی کمزور صحت نے دلی کے ان تین ہفتوں میں جو جھٹکا اٹھایا اُس سے وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے۔ اُن کی شخصیت نے اُس زمانہ میں اپنی کردار کے بہترین جواہر اہل شہر کی خدمت میں لٹائے۔ خود عمال حکومت معترف تھے کہ اگر حکیم صاحب کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو دلی کی سرزمین پر خون کے دریا بہتے اور خدا جانے کب تک بہتے رہتے۔ دلی کے اس ہنگامہ کی تفصیلات آج ہمارے لئے درس عبرت ہیں۔ برطانوی سامراج کے دار السلطنت میں آزادی اور حقوق انسانیت کے اس مورچہ پر جو خون بہا وہ اُن مخلص قومی رضاکاروں کا تھا جو پہلے دفعہ پوری قوت سے آزادی کے جھنڈے کے نیچے

اور رہا تما گاندھی کی آواز پر جمع ہوئے تھے۔ لیکن ابھی ایک دفعہ اور اس سرزمین پر خون بہنا تھا اور یہ خون ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی کے بعد بہا۔ اس خونریزی میں ہاتھ تو ہندو، مسلمان یا سکھ کا کام کرتا تھا لیکن خبیث روح وہی کارفرما تھی جو ڈیڑھ سو برس کی انگریزی حکومت نے پیدا کی تھی۔ اسی زمین کی مٹی میں اجمل خاں بھی محو خواب ابد ہیں جس پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس بستی کے باشندوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ اگر مرنے کے بعد بھی روحیں اس دنیا سے کوئی تعلق رکھتی ہیں تو نہ جانے اجمل خاں کی روح پر ان دنوں میں کیا گزری ہوگی اور کیا اُسے وہ زمانہ یاد نہ آیا ہوگا جب ۱۹۱۹ء میں ملک کی آزادی اور عزت کی خاطر اس مٹی میں ہندو مسلمان کا ملا جلا خون جذب ہوا تھا!

جلیان والا

جب دلی میں حکومت کے استبداد اور رعایا کی حمیت قومی کے درمیان یہ کشمکش جاری تھی تو پنجاب میں انتہائی جبر و تشدد کی تیاریاں جاری تھیں۔ صوبہ کے گورنر مائیکل اوڈائر نے اپنی کونسل میں صاف کہدیا تھا کہ

> "برطانوی گورنمنٹ جس نے غیر ملکوں میں اپنے دشمنوں کو کچل ڈالا ہے اور جو اندرونی بغاوتوں کو بھی کچلنے کی طاقت رکھتی ہے بے تکلف ان شورش پسندوں کے ساتھ بھی حقارت کا برتاؤ کر سکتی ہے .... وہ لوگ جو جذبات کو ابھارتے ہیں اور جہلا کو مشتعل کرتے ہیں اُن کے لئے ایک یوم الحساب آنے والا ہے۔"

وہ "یوم الحساب" دو چار ہی دن کے بعد آگیا۔ جب لاہور اور امرتسر کے

بارود خانوں میں چنگاری گری اور ہر طرف حکومت کے جبر و تشدّد کی ایک انسانیت سوز آگ لگ گئی۔ جلیان والا باغ (امرتسر) میں جنرل ڈائر نے ۳۰ سکنڈ کے اندر تقریباً پانچ سو انسانوں کو قتل اور کم و بیش پندرہ سو انسانوں کو مجروح کر کے سرکار کے اقتدار کا جھنڈا گاڑ دیا! مائیکل اوڈائر نے دو ہی دن پہلے ایک سکھ سردار سے میز پر گھونسہ مار کر فرما دیا تھا کہ :۔

"یاد رکھئے سردار صاحب! روحانی طاقت سے قوی تر ایک دوسری طاقت بھی ہے!"

جنرل ڈائر نے اپنے گورنر کے فرمودہ کی تفسیر جلیانوالہ باغ میں پیش فرمائی! اگر اس سورما کے کارنامے نے درحقیقت ہندستان کے قوم پرستوں کے لئے خدمت وطن کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ مہاتما گاندھی کی ہزاروں تقریروں اور حکیم صاحب کے لاکھوں نباتات سے جو اثر پیدا نہ ہوتا وہ ڈائر نے تیس سکنڈ کے عرصہ میں پیدا کر دیا۔ ان حالات کی کچھ تفصیل خود حکیم صاحب کے قلم سے آپ اگلے صفحات پر دیکھیں گے۔

پنجاب میں مارشل لا جاری کر دیا گیا جس کا سبب بدامنی کے سوا افغانستان کی طرف سے فوجوں کی نقل و حرکت تھی۔ اس واقعہ کا تذکرہ ڈاکٹر انصاری اپنی یادداشت میں اس طرح کرتے ہیں کہ

"افغانستان میں امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد امیر امان اللہ خاں تخت و تاج پر قابض ہوئے اور اپنے غیر معمولی جذبہ حُب الوطنی اور خدمت خلق کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر مقبول عوام ہوئے کہ ملک کی حالت

بدل گئی۔ اُنھوں نے استقلال افغانستان کے لئے اور اپنے
پڑوسی ہندستانیوں کے مصائب سے متاثر ہوکر انگریزوں
سے جنگ شروع کر دی پنجاب میں مارشل لا نافذ کرنے کا
یہی سب سے بڑا سبب ہوا۔ لیکن ہندستان کی سیاست
میں یہ موقعہ نازک تھا۔ اس لئے کہ ایک طرف تو افغانستان
انگریزی حکومت سے جنگ کر رہا تھا اور دوسری طرف
پنجاب میں مارشل لا کے خلاف اور تمام ہندستان میں
خلافت کے متعلق شورش ہو رہی تھی۔ تمام ہندستانی عموماً
اور مسلمان خصوصاً افغانستان کی آزادی و استقلال کے
سوال کی تائید کر رہے تھے۔ وہ اس جنگ میں افغانستان
کی کامیابی کو اپنی آزادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ لیکن
اسی کے ساتھ ہندوؤں کے بعض گوشوں میں یہ اندیشہ
بھی پیدا ہو گیا تھا کہ شاید ہندستانی مسلمان افغانستان کے
ذریعہ سے ہندستان پر اسلامی تسلط قایم کرنے کی کوشش
کر رہے ہیں۔ اس نازک موقعہ پر حکیم اجمل خاں صاحب نے
ایک اہم اور موثر بیان اخباروں کو دیا جس میں ایک
طرف تو افغانستان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور
دوسری طرف ہندو بھائیوں کے بیجا خوف و خطر کو رفع
کیا۔"

ایسے نازک مواقع پر حکیم صاحب کا تدبر خود مہاتما گاندھی کے خیالات
پر بھی فائق ہو جایا کرتا تھا۔ اُس وقت انگریز بھی یہ کوشش کر رہا تھا کہ

ہندوؤں کے اس اندیشہ کو تقویت دیکر خلافت کی تحریک کو کمزور کرادے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

افغانستان کی پیشقدمی رک جانے کے بعد جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندستان کے مسلمان میدانِ جنگ میں افغانستان کی کوئی مدد کرنے کے نہ تو قابل تھے اور نہ اس پر آمادہ تھے) پنجاب میں مارشل لا بھی ختم ہو گیا۔ لیکن خاتمہ سے پہلے اُس نے اتنے زخم عوام کے دلوں پر لگا دیے کہ گویا وہاں آزادی کی تحریک کا سنگ بنیاد مستحکم کر دیا۔ جب تک مارشل لا جاری رہا پنجاب کی خبریں پنجاب کے باہر نہ پہنچ سکتی تھیں لیکن مارشل لا کے ختم ہوتے ہی وہ تمام زخم عریاں ہو گئے اور مہاتما گاندھی اور حکیم صاحب اور دوسرے لیڈر جو اپنے اپنے مقام پر امن قایم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اب متحد ہو کر پنجاب کے مارشل لا کی پردہ دری کرنے پر متوجہ ہو گئے۔ اور رولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد کے ساتھ ہی مظالم پنجاب کی آواز بلند ہونے لگی۔ حکیم صاحب نے مسلم لیگ کے سکرٹری کو اپنی رائے لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مسلم لیگ کو فوراً آواز بلند کرنی چاہیے اور پنجاب کے واقعات کے متعلق یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ

"ان تمام واقعات کی تحقیقات کے لئے ہندستانی اور غیر ہندستانی ممبروں کا ایک کمیشن بٹھایا جائے جس میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ ہندستانی ممبر ایسے ہوں جن پر ملک کو اعتماد ہو اور غیر ہندستانی ممبروں میں سول سروس کا ایک بھی ممبر نہ ہو۔"

اس تحقیقات اور احتجاج کا قصہ بعد میں آئے گا لیکن پہلے اُن نتائج کا ذکر کر دیا جائے جو واقعات پنجاب سے پیدا ہوئے۔

کانگریس اور خلافت کا اتحاد

جب پنجاب کے مظالم کی خونچکاں داستان ہندستان کے ہندو مسلمانوں کے دلوں کو بیچین کر رہی تھی اُسی زمانہ میں خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے لئے سخت تردد کا باعث بن گیا تھا۔ اماکن مقدسہ اور خلیفہ کے متعلق برطانوی وزرا کے تمام وعدے جھوٹے ثابت ہو چکے تھے اور صلح کانفرنس کی جو خبریں ہندستان آرہی تھیں اُن سے واضح ہوتا تھا کہ نہ تو ترکوں کے لئے آزادی اور عزت کا کوئی راستہ کھلا رکھا گیا ہے اور نہ جزیرۃ العرب کے متعلق برطانوی حکومت کے وعدوں کے پورا کئے جانے کے کوئی آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اب عام مسلمانوں اور اُن کے لیڈروں کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر انتہائی قربانیاں نہ کی گئیں تو ان مسائل کا خاتمہ بہت بُری طرح ہو گا۔ شوکت علی اور محمد علی ہنوز چھنڈواڑہ میں نظربند تھے، مولانا ابوالکلام آزاد بھی مقیّد تھے۔ مسلمان لیڈروں میں صرف ڈاکٹر انصاری، حکیم صاحب اور مولانا عبدالباری ہی ایسے تھے جو مہاتما گاندھی، مسٹر تلک اور بعض دوسرے لیڈروں سے ان مسائل کے متعلق مشورے کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی اس بات پر آمادہ تھے کہ خلافت کے مسئلہ کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ بنا کر خلافت اور مظالم پنجاب اور آزادی وطن، سب کے لئے ایک ہی محاذ جنگ قایم کیا جائے۔ پنجاب کے مظالم نے اعتدال پسند جماعت کو بھی کانگریس اور گاندھی جی کی تجاویز کے جانب مائل کر دیا تھا۔ اور اس لئے مسلمانوں

کی پہلی آل انڈیا کانفرنس کے دعوت نامہ پر بہت سی غیر سیاسی و راعتدال پسند لوگوں کے بھی دستخط تھے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری دہلی میں اور مولانا عبد الباری لکھنؤ میں اس کانفرنس کے بڑے داعی تھے۔ دعوت نامے میں ترکی اور خلیفہ کی مشکلات کا ذکر کر کے تمام مسلمانوں سے بلا امتیاز عقائد اپیل کی گئی تھی کہ وہ مالی امداد دیکر تحفظ خلافت اور اماکن مقدسہ کے متعلق ارباب کار کی کوششوں کو کامیاب بنائیں۔ لکھنؤ میں یہ پہلی کانفرنس بہت کامیاب ہوئی۔ اور اس کے بعد تمام ہندستان میں "یوم دعا" منایا گیا جس میں ہندوؤں نے بھی حصہ لیا۔

دو ماہ گذرنے کے بعد ہی دہلی میں ۲۴ نومبر کو خلافت کانفرنس کے نام سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس کے مہتمم اور بانی حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری تھے۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ وہ کسی طرح جشن صلح میں شرکت نہیں کر سکتے اور یہ کہ "اگر صلح میں ترکی اور مسئلہ خلافت کے مسائل مسلمانوں کی عام خواہشات کے خلاف طے ہوئے تو اُس صورت میں مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ انگریزی مال کا بائیکاٹ کر دیں اور حکومت کے ساتھ اتحاد عمل کی پالیسی کو ترک کر دیں"۔ اس طرح خلافت کانفرنس ہی کے پلیٹ فارم سے مہاتما گاندھی کے آیندہ پروگرام کی ایک آواز سب سے پہلے بلند ہوئی۔

دوسرے ہی دن ایک مشترکہ جلسہ بصدارت مہاتما گاندھی منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں تمام ممتاز ہندو لیڈر اور مسٹر تلک مرحوم بھی شریک تھے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں مسئلہ خلافت کے تمام پہلوؤں پر ایک پر مغز تقریر کی اور مسلمانوں کو یقین دلایا کہ خلافت کے مسئلہ میں

مسلمانوں کے ساتھ اُن کے ہندو بھائی ہر طرح آمادۂ رفاقت ہیں۔ مہاتما گاندھی نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ "وہ اُس وقت تک جشن صلح میں شریک نہ ہوں جب تک انہیں اس بات کا پورا اطمینان نہ دلایا جائے کہ سلطنت عثمانیہ کے بٹوارے اور خلافت کے برقرار رکھنے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔" اس طرح "جشن صلح" نے ہندو مسلمانوں کے متحدہ محاذ کا سنگ بنیاد نصب کر دیا۔

اس موقعہ پر مہاتما گاندھی نے انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تجویز سے اختلاف کیا۔ جو رزولیوشن جشن صلح کو بائیکاٹ کرنے کے متعلق پیش ہوا اُس کے محرک حکیم صاحب تھے۔ یہ زمانہ کا عجیب انقلاب تھا کہ وہی حکیم صاحب جو دوران جنگ میں برطانیہ کے ساعی اور مددگار رہتے تھے اور جلسوں میں تائید اور حمایت کے رزولیوشن پیش فرمایا کرتے تھے سب سے پہلے "جشن صلح" کی مخالفت کرنے اس کانفرنس میں کھڑے ہوئے۔ مسلم لیگ کے سکرٹری کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اب یہ سوال کہ جشن صلح میں شرکت کی جائے یا نہ کی جائے اختلافی نہیں رہے۔ یہ سوال خود اپنا جواب ہے۔ انگلستان اور ایران کا معاہدہ اور ترکوں کے ساتھ شرائط صلح بالکل کھلی چیز ہیں........ اس معاہدہ کو جتنا بھی بُرا کہا جائے کم ہے۔"

یعنی اب یہ ۱۴ھ یا ۱۷ء کے اجمل خاں نہ تھے!

ہنٹر کمیٹی | مظلومین پنجاب اور اُن کے ہمدردوں کی اشک شوئی

کے لئے حکومت نے ۲۹ اکتوبر کو ہنٹر کمیٹی کے تقرر کا اعلان کیا۔ کمیٹی کا پہلا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اُس کے بعد اُس نے لاہور، احمد آباد اور بمبئی کا دورہ کیا۔ کانگریس نے اس کمیٹی کا بائیکاٹ کیا اور خود اپنی ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے مقرر کی۔ ہنٹر کمیٹی کے ممبران میں سخت اختلاف ہوا۔ تینوں ہندستانی ممبران یعنی پنڈت جگت نراین، صاحبزادہ سلطان احمد خاں اور سر سیتلواد نے بقیہ چار انگریزوں کی رائے سے اختلاف کیا اور اپنی رپورٹ میں حقیقت حال کو ظاہر کر دیا گو کہ لہجہ بہت محتاط اور نرم تھا۔ ہندستانی ممبران نے جنرل ڈائر کے متعلق لکھا کہ اُس کا طرز عمل ایسا نہ تھا جس کی کوئی صفائی پیش کی جا سکے اور دوسرے حکام پر یہ الزام عائد کیا کہ اُنھوں نے زخمیوں اور لاشوں کے اُٹھانے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا۔ ان ممبران نے گورنر اوڈائر پر بھی یہ الزام لگایا کہ اُس نے واقعات کی تحققات کئے بغیر جنرل ڈائر کے طرز عمل کو سراہا۔ اس رپورٹ کے بعد حکومت ہند نے ناچار بہت نرم الفاظ میں مارشل لا کی کارروائیوں کو قابل اعتراض قرار دیا جنرل ڈائر کو صرف اتنی سزا ملی کہ وہ اپنے عہدے سے معزول کئے گئے۔ لیکن حکومت ہند نے جس طرح گورنر اور دوسرے حکام کی ناروا کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اُس کا اثر ہندستان کے لیڈروں اور عام طبائع پر بہت بُرا پڑا اور لوگوں نے یہ معلوم کرکے کہ حکومت اپنے عمال کے مظالم سے چشم پوشی کرتی ہے سمجھ لیا کہ ایسی حکومت سے انصاف کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اُس وقت تمام ملک ایک سخت اضطراب کی حالت میں تھا جب دسمبر میں مسلم لیگ اور کانگریس کے

اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے پانچ سال کی نظربندی کے بعد اب شوکت علی اور محمد علی بھی آزاد ہو کر چھندواڑہ سے براہ راست امرتسر پہنچے۔ مسلم لیگ کے جلسہ کے صدر حکیم صاحب تھے اور اُن کا خطبہ صدارت واقعات پنجاب اور ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ایک تاریخی بیان تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پارلیمنٹ میں منظور ہو چکا تھا اور آئینی اصلاحات کا یہ کھلونا ہندستانیوں کو بہلانے کے لئے تیار کر لیا گیا تھا۔ لیکن زخم اتنے گہرے تھے کہ یہ مرہم اُن کے لئے بیکار تھا۔ نظربندوں کی رہائی سے بھی حکومت توقع کرتی تھی کہ ان زخموں کا کچھ اندمال ہو سکے گا۔ لیکن پنجاب کے واقعات نے جو نتائج پیدا کئے اُن کا علاج آئینی اصلاحات کی ایک قلیل قسط یا نظربندوں کی رہائی نہ تھی۔ اب ہندستانی رعایا "حق انتخاب حکومت" اور آزادی کا مفہوم سمجھنے لگی تھی اور اُس کے مطالبہ کی آواز سخت اور بلند ہو گئی تھی۔ بقول ڈاکٹر انصاری صاحب۔

امرتسر کا تاریخی اجتماع اور قربانی گاؤ کا مسئلہ

دسمبر کا مجمع امرتسر میں ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور مسلم لیگ کے صدر حکیم اجمل خاں صاحب منتخب ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے پہلی مرتبہ ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ بقرعید کے موقعہ پر گائے کے بجائے بکرے کی قربانی کیا کریں۔ اُن کے اس اپیل کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ نے ایک رزولیوشن اس بارے میں پاس کر دیا۔ حکیم صاحب چونکہ

خود ایک زبردست عالم تھے اُنھوں نے علما کے گروہ میں
بھی ایک معقول طبقہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ حکیم صاحب کی
اس تحریک کا گہرا اثر ہندو مسلم تعلقات پر ہوا۔

حکیم صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں واقعات پنجاب کے متعلق جس صفائی کے ساتھ حکومت کی سخن آفرینی کا شیرازہ بکھیرا وہ اُن کے خطبہ صدارت کی امتیازی خصوصیت تھی اور وہ خطبہ مسلم لیگ اور کانگریس کے پلیٹ فارم پر شاید پہلا ہی خطبہ تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد کے اہم سوال نے اپنا پورا وزن حاصل کیا۔ حکیم صاحب نے پہلی دفعہ قربانی گاؤ کا سوال اُٹھاتے ہوئے صاف کہا کہ:

گاؤ کشی کا ذکر ہم لوگ عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلہ کا زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے تاکہ ہم کسی معقول نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے جو طریقے گاؤ کشی کے انسداد کے اختیار کئے تھے وہ بعض صورتوں میں بہت زیادہ قابل اعتراض تھے اور وہ قدرتی طور پر حصول مدعا میں ناکامیاب ثابت ہوئے۔ اب کہ ہندو اور مسلمان ایک نئے دور سے گذر رہے ہیں اور اُن کے اختلافات مٹ مٹا کر اتحاد کی صورتیں اختیار کر رہے ہیں یہ بات بہت دور ہوتی جاتی ہے کہ آیندہ زمانہ میں پچھلے انسدادی طریقے ہمارے سامنے آئیں، بلکہ ان دونوں قوموں میں وہ اسپرٹ پیدا ہوگئی ہے جو صرف گاؤ کشی ہی کے

مسئلہ کے لئے نہیں بلکہ بہت سے اختلافی مسائل کے حل کرنے کے لئے ایک مضبوط بنیاد کا کام دیگی۔ جب دو مختلف گروہ آپس میں محبت کے ساتھ ایک دوسرے کے کاموں میں شرکت کرتے ہیں تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے اختلافی مسائل، اختلاف کے مختلف مدارج سے گذرتے ہوئے اور مختلف حالتیں بدلتے ہوئے ایک اتحاد کے نقطہ پر خود بخود یا تھوڑی سی مناسب وقت کوشش سے پہنچ جاتے ہیں اور پھر یہ اختلافی مسائل ایسی زمین بن جاتے ہیں جس میں اتحاد کی تخم ریزی آسانی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔

ہمارے ہندو بھائیوں نے ایک عرصہ سے ہر جگہ اتحاد کا ہاتھ ہماری طرف بڑھانے میں پیش دستی کی ہے جس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔ اور جو حقیقت میں اُن کی یادہٗ وقت شناسی کی ایک مضبوط دلیل ہے۔ اب ہم مسلمان بحیثیت ایک شریف قوم کے اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں دے سکتے کہ زیادہ جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھائیں۔

حکیم صاحب نے اپنی اس تقریر میں ہندستان کے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ گائے کی قربانی ایسی چیز نہیں کہ وہ مذہبًا ناگزیر ہو۔ اسلامی ممالک کے کروڑوں مسلمان کبھی گائے کی قربانی نہیں کرتے۔ پھر اُنہوں نے مذہبی احکام کا حوالہ دیکر بتایا کہ ان احکام میں گائے کی قربانی کہیں بھی صراحتًا لازم نہیں ہے بلکہ حدیث میں بھیڑ کی قربانی کو افضل بتایا گیا ہے۔ پھر اُنہوں نے

فرمایا کہ

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ اس مسئلہ کی طرف عملی قدم کس طرح اٹھانا چاہئے تو میں سب سے پہلے یہ مشورہ دونگا کہ ہندوؤں کے مقدس شہروں سے جیسے کاشی، اجودھیا، متھرا، اور بندرابن میں اس کا آغاز کیا جائے اور ان شہروں میں جس قدر جلد ممکن ہو دوسرے جانوروں کو قربانی کو اختیار کیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں میں بھی اس کوشش کا آغاز کیا جائے۔

اسی کے ساتھ حکیم صاحب نے اس امر پر زور دیا کہ مسلم لیگ کو یہ تحریک شروع کرنی چاہئے۔

لیگ کے پلیٹ فارم سے حکیم صاحب کے اس اقدام نے ہندوؤں کے دلوں پر بہت اچھا اثر پیدا کیا خود مہاتما گاندھی نے نیگ انڈیا میں لکھا کہ:

مسئلۂ قربانی کے متعلق حاذق الملک حکیم اجمل خاں نے اپنے بے مثل خطبہ صدارت میں...... مذہبی اور عملی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے خطبہ صدارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا یہ خیال کہ قرآن اور حدیث گائے کی قربانی کو لازمی قرار نہیں دیتے جس قدر وطن پرستی کے جذبات پر اتنا ہی فہم عامہ اور اخلاق حسنہ پر مبنی تھا۔ یہ حکیم صاحب کی درحقیقت بہت بلند خیالی اور عالی حوصلگی تھی اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے مسلمان ہموطن اسی بلند خیالی

کے ساتھ اس اپیل پر اور حکیم صاحب کی اُن عملی تجاویز پر
لبیک کہیں گے جو بقول اُن کے "ایمانداری اور سچائی اور
گہرائی" سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس طرح وہ (مسلمان) ملک
کی اندرونی امن کے ضامن بنّے اور اُس کی طرف سب سے
پہلے قدم اُٹھانے کا افتخار حاصل کریں گے...... اس کے
کہنے کی ضرورت نہیں کہ حکیم صاحب نے اس قدر عالی حوصلگی
اور جرأت کے ساتھ ایک مشکل معاملہ کا حل پیدا کرکے ہندو
قوم کو مرہونِ منت کر لیا ہے۔

مسئلہ اس قدر صاف تھا اور حکیم صاحب کی بحث اس قدر سلجھی ہوئی تھی کہ اگر انگریز ہندو مسلمانوں کے اس بڑھتے ہوئے اتحاد سے خوف زدہ ہو کر اپنی قدیم عیاریوں کو اختیار نہ کرتا اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے ادنے تعصبات نہ بھڑکائے گئے ہوتے تو حکیم صاحب کے نصب کئے ہوئے اس سنگ بنیاد پر ہندستان کے قومی اتحاد کی ایک عظیم الشان عمارت تیار ہو چکی ہوتی۔

حکیم صاحب کے خطبہ صدارت کے آخری الفاظ بہت شاندار اور خود اُن کی فطرت کی مکمل تصویر تھے:۔

اس حیثیت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور
دوسری قوموں کے ساتھ اسی ملک کے فخر کرنے والے
وارث بنے ہم اُن فرائض کو جو ہماری نزاد و بوم ہم پر عاید
کرتی ہے نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی جوش کے ساتھ
اُن کے ادا کرنے کے لئے اپنے ہندو عیسائی پارسی اور دوسر

بھائیوں کے ساتھ آمادہ ہیں ....

ہندستان کے لئے ایک نادیدہ مستقبل ہیں وہ عظمت اور شان پنہاں ہے کہ اس کی ماضی کا زیادہ سے زیادہ عظیم بالشان زمانہ بھی اس کے مقابلہ میں کم اور حقیر نظر آتا ہے۔ آئیے اب ہم سب متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اسی مستقبل کے چہرہ سے جو ہمارے ذہنی مگر اعلیٰ تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔

علی برادران

اس طرح حکیم صاحب مطالبہ حقوق کی جنگ اور ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کو پہلی منزل پر لا چکے تھے جب طویل نظربندی کے بعد علی برادران نے ہندستانی سیاست کے طوفانی سمندروں میں قدم رکھا۔ ۱۹ء سے پہلے جو تخم علی برادران زمین پر ڈال گئے تھے وہ اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی نگرانی میں ایک تناور درخت بن گیا اور اب وہ بڑی بڑی آندھیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ عین اسی وقت دونوں بھائی پھر میدان میں آ گئے۔ لیگ کے اجلاس میں حکیم صاحب نے ان دونوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا:-

"گورنمنٹ کے شاہی اعلان کے مطابق ان کی جو رہائی عمل میں آئی ہے اس کے لئے ہم حکومت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی پیہم درخواستوں، میموریل اور عرضداشتوں پر گورنمنٹ ان کو چھوڑ دیتی تو مسلمان سچے دل سے اور مناسب طریقہ

سے شکریہ ادا کرتے اگر جب مسلمان اپنی التجاؤں میں ناکامیاب
رہے اور رنج و غصہ کی وجہ سے خاموش ہو گئے اور انہوں
نے دیکھ لیا کہ اُن کی درخواستیں پامال کر دی گئیں اُن کی
عرضداشتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی تو انہوں نے اپنی جبین
نیاز کو احکم الحاکمین کے آگے خم کیا اور اپنی کوششوں کو
خدا کی رضا پر چھوڑ دیا۔ اس لئے اُن کی رہائی گورنمنٹ کا ایک
فعل ہے جو شاہی اعلان کے مطابق عمل میں آیا۔ گورنمنٹ
مسلمانوں کے شکریہ کی ذرا بھی مستحق نہیں ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جسے بجا طور پر ہندستان کی سیاسی جنگ کا اور خود حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کا نصف النہار کہنا چاہیے۔ علی برادران کی سیاسی جدوجہد کا نصف النہار بھی یہی دور تھا۔

اعلانِ جنگ

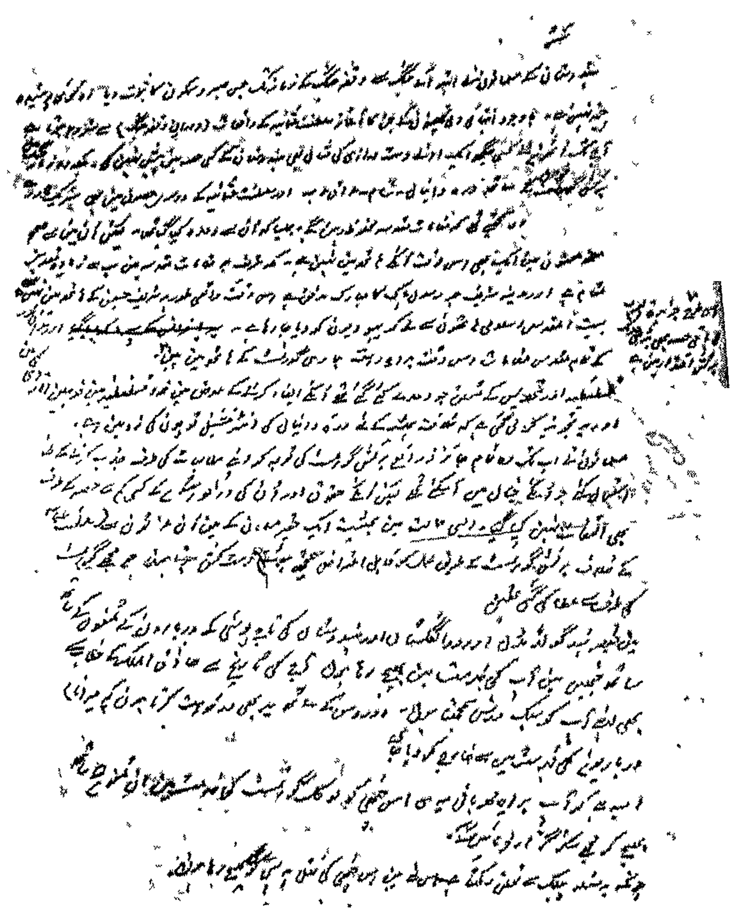
۱۹۱۹ء میں قومی زندگی کے دریا میں جو پانی چڑھا تھا اُس کے منجھدار اب حکیم صاحب کی کشتی جا رہی تھی۔ اُس کشتی کے بادبان ہوا سے بھرے ہوئے تھے اور اب اُن کی زندگی کا ہر سانس قومی ارتقا کی تحریکوں کے ساتھ وابستہ تھا۔ حتیٰ کہ اب اُن کی طبی تحریک بھی جسے وہ ہمیشہ سیاسی آب و ہوا سے جدا رکھا کرتے تھے قومی تحریک کا ایک جزو بن گئی۔ طبیہ کالج کی سالانہ رپورٹ میں انہوں نے فرمایا کہ

اگر ہم اپنے ملک کو انتظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیں
تو اُس کے لئے ہمیں جتنا اپنی دوسری قومی چیزوں کو سنبھالنا
ہے اتنی ہی ہمیں دیسی طریقہ علاج کی طرف بھی توجہ کرنی نہایت

ضروری ہے کیونکہ ہماری سچی ترقی کا مدار اُن ہی چیزوں پر ہوگا اور جب تک ہم باہر کی چیزوں سے بے نیاز نہ ہونگے اُس وقت تک ہم اپنے ملک کی صحیح خدمت کرنے سے قاصر رہیں گے۔

۱۹ر جنوری ۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک وفد ترکی کی شرائط صلح کے متعلق ویسرائے کے پاس گیا اور عرض حال کرنے کے بعد واپس آیا۔ اُس کے واپس آتے ہی مسلمانوں کی طرف سے ایک عام اعلان شائع کیا گیا جس میں صاف صاف کہا گیا کہ اگر ترکی کے ساتھ ایسی شرایط پر صلح کی گئی جو اسلامی جذبات اور مذہب کے خلاف ہیں تو حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری پر ناقابل برداشت بوجھ پڑے گا۔ اس کے بعد بمبئی میں جمعیتہ خلافت کا ایک اہم جلسہ منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ فوراً مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان جاکر وزرائے انگلستان کو اُن کی پالیسی کے نتائج پر متنبہ کر دے اور مسلمانوں کے مطالبات کو ایک حجت آخری کی طرح پیش کر دے۔ فروری میں یہ وفد انگلستان روانہ ہو گیا۔

۲۲ر مارچ کو حکیم صاحب نے ملک کے تمام ہندو مسلمان لیڈروں کو دہلی میں مدعو کیا اور اس مشورے کا جو کئی دن تک شریف منزل میں ہوتا رہا یہ نتیجہ نکلا کہ شروع اپریل میں مہاتما گاندھی نے حکومت کے مقابلہ پر اعلان جنگ کر دیا۔ حکیم صاحب نے اپنا خطاب "حاذق الملک" اور تمغہ "قیصر ہند" حکومت کو واپس کر کے حاکمانہ جبر و تشدد کے خلاف اپنے رنج اور اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ گو کہ ابھی ترک موالات کا پروگرام جاری نہ ہوا تھا لیکن ملک میں عام ہیجان اس قدر شدید



عطائے تو بہ لقائے تو !

صورت اختیار کر چکا تھا کہ لوگوں نے حکیم صاحب کے خطاب کی واپسی کے بعد تمام سرکاری خطابات واپس کرنے شروع کردیے حکیم صاحب کی زندگی میں خطابات کی واپسی ذاتی حیثیت سے تو کوئی اہم واقعہ نہ تھا لیکن خاندانی حیثیت سے ایک بڑا معاملہ تھا۔ خاندانِ شریفی حکومت وقت کے درباروں سے ڈیڑھ سو برس تک وابستہ رہا تھا۔ لیکن اب وہ پہلی دفعہ جدا ہوگیا حکیم صاحب اپنے خاندان میں تیسرے "حاذق الملک" تھے، پہلے دو "حاذق الملک" دربارِ مغلیہ کے منصب دار تھے اور حکیم صاحب کی خاندانی وراثت کی سرکار انگریزی نے بھی تجدید کی تھی لیکن اکمل خاں اور عبدالمجید خاں کی اس وراثت سے دست بردار ہوکر حکیم صاحب نے اپنے خاندانی اعزاز کے لئے قومی زندگی کا راستہ کھولا۔ چند ہی روز بعد جمعیتہ العلما نے اپنے اجلاس کانپور میں یہ تجویز منظور کی کہ حکیم صاحب کو سرکاری خطاب کے بجائے مسیح الملک کا قومی خطاب دیا جائے اور وہ ہندستان کے ہر گھر میں اسی خطاب سے یاد کئے جانے لگے حقیقت یہ ہے کہ اُن کے نام کے ساتھ حاذق الملک کبھی بھی اس قدر چسپاں نہ ہو سکا تھا جس قدر کہ "مسیح الملک" چسپاں ہوگیا بلکہ اُن کے نام کا بدل ہو کر بجائے خود نام بن گیا۔ جس عام فضا میں جمعیتہ علما کی طرف سے یہ خطاب دیا گیا تھا اُس عام فضا کا قدرتی اقتضا بھی یہی تھا۔

ہجرت

اُسی زمانہ میں دفعتاً لکھنؤ سے مولانا عبدالباری نے یہ فتوے شائع کر دیا کہ جو لوگ دشمنان اسلام کی حکومت میں رہنا پسند نہ کریں وہ آزاد اسلامی ممالک میں چلے جائیں۔ امیر امان اللہ خاں

نے کابل میں اپنے والد کی برسی کے موقعہ پر جو تقریر کی اُس میں اُنہوں نے مظلوم مسلمانان ہندستان کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ہجرت کا فتوے شائع ہوتے ہی ہزارہا ہندستانی مسلمان ترک وطن کرکے درۂ خیبر کی طرف چل پڑے۔ ابتدا میں تو ہجرت کی تحریک نے ایسا اثر پیدا کیا کہ ترک موالات کی تحریک بھی اُس کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔ دہلی میں مہاجرین کے لئے ایک باقاعدہ دفتر قایم ہو گیا جو قافلوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچاتا تھا۔ دراصل یہ تحریک زیادہ تر جذباتی تھی اور سیاسی حیثیت سے ہر طرح ناقص تھی۔ حکیم صاحب سب سے زیادہ اس تحریک سے غیر مطمئن تھے۔ اُن کی رائے میں ترک وطن کی تحریک وطن پرستی کے صحیح مفہوم کی نفی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آزادی کی جنگ وطن ہی کی سرزمین پر لڑی جانی چاہیے ہندستان کے غلام باشندے جس ملک میں بھی جائیں گے غلام ہی سمجھے جائیں گے تاآنکہ وہ خود اپنے وطن کو آزاد کرالیں۔ چند ہی روز بعد اس غلط تحریک کی غلطی کا لوگوں کو احساس پیدا ہوا اور مہاجرین کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ خود حکومت افغانستان بھی اس آبادکاری کے انتظام سے پریشان ہو گی جتی کہ حکیم صاحب نے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ مہاجرین کے سلسلہ کو بند کرائیں۔ اُس زمانہ میں جب ہجرت کا سلسلہ جاری تھا۔ حکیم صاحب اور امیر کے درمیان خاص ذرائع سے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ *حکومت ہند کو بھی اس کا علم تھا۔

ہجرت کی تحریک نے ہندستان کے ہزارہا خاندانوں کو برباد کردیا۔ لیکن یہی غلطی ۲۰ سال بعد پھر ہونے والی تھی۔ مسلم لیگ کے لیڈروں

نے اس غلطی سے کچھ نہیں سیکھا اور تقسیم ہند کے مطالبہ کے ساتھ ہی وہ نہایت سنجیدگی سے اس امر پر بحث کرنے لگے کہ ہندستان کے مسلمان پاکستان میں آباد کئے جاسکیں گے۔ لیکن اس خام خیالی کا جو نتیجہ نکلا وہ آج نظر کے سامنے ہے۔

ریشمی خطوط جنگ یورپ کے دوران میں شیخ الہند مغفور کو انگریزوں نے شریف مکہ کی مدد سے گرفتار کرکے مالٹا میں قید کردیا تھا اور مولانا عبیداللہ دہلی سے بھاگ کر کابل چلے گئے تھے۔ حکیم صاحب ان اصحاب کی سازشوں میں شریک سمجھے جاتے تھے لیکن اُن کے خلاف حکومت کو کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا۔ اسی زمانہ میں "ریشمی خطوط کی سازش" کا بہت چرچا ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اپنی یادداشت میں اس "سازش" کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:۔

زمانہ جنگ میں مولانا عبیداللہ دہلی سے کابل گئے اور امیر حبیب اللہ خاں کے دربار میں اُنہوں نے بہت اثر پیدا کیا۔ امیر کے قتل کے بعد امیر امان اللہ خاں سے اُن کے مراسم بہت زیادہ ہوگئے۔ مولانا عبیداللہ ہندستان کی آزادی کی تدبیروں میں ہمیشہ مصروف رہا کرتے تھے۔ ترکی اور جرمنی کے وفود جب کابل آئے تو ان لوگوں سے بھی مولانا کے تعلقات بہت زیادہ ہوگئے۔ اُن کے چند خطوط جو اُنہوں نے ہندستان بھیجے تھے پکڑے گئے اور خصوصاً ایک خط جو ریشم کے کپڑے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی جاسوسوں کے ہاتھ آیا۔ سرچارلس کلیولینڈ نے

جو محکمہ خفیہ پولس کے ڈائرکٹر تھے اُس خط کو ایک بڑی سازش کی بنیاد قرار دیا جس کی ایک شاخ کابل میں اور ایک حجاز میں قایم سمجھی گئی۔ لیکن اُس کی درمیانی کڑی کا جو ہندستان میں خیال کی جاتی تھی پتہ نہ چلتا تھا مگر کلیو لینڈ کا خیال تھا کہ حکیم صاحب اور میں وہ درمیانی کڑی ہیں اس وجہ سے دیوبند، سہارن پور، پانی پت اور دہلی میں بہت سے سربرآوردہ مسلمانوں کی تلاشی کرائی گئی۔ اُن کے بیانات لئے گئے اُن کو دہمکایا گیا اور اُن پر تشدد کیا گیا۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اسی سلسلہ میں حکیم صاحب کا اور میرا بیان لیا گیا۔ ہمارے مکان اور مطب پر اور ہمارے سفر میں خفیہ آدمی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے اور ہماری ڈاک مسلسل دو سال تک سنسر کی گئی مگر کوئی ثبوت یا پتہ ہاتھ نہ آیا۔

حکیم صاحب کے متعلق یہ شبہات آخر زمانہ تک قایم رہے لیکن اُنھوں نے پھر بھی افغانستان سے اپنے تعلقات قایم رکھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک طاقتور افغانستان بحیثیت ایک ہمسایہ کے ہندستان کی جنگ آزادی میں بہت معاون ہوسکتا ہے۔

ترکوں پر آخری وار

مئی سنہ ۲۰ء میں صلحنامہ کی وہ شرائط شائع کردی گئیں جن کے قبول کرنے پر ترکی کو مجبور کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ویسرائے کی طرف سے ایک بیان بھی شائع ہوا جس میں اس کڑوی گولی پر شکر چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن آگ

لگی ہوئی تھی اُس کو اس بیان نے اور زیادہ بھڑکا دیا۔ مسلمانوں کو اچھی طرح اس امر کا احساس ہو گیا کہ برطانیہ ترکوں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اُس کے تمام وعدے جھوٹے ثابت ہو گئے تھے۔ ۲۸ مئی کو بمبئی میں پھر ایک خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مہاتما گاندھی کے مجوزہ پروگرام کو منظور کر لیا گیا اور طے پایا کہ وائسرائے کو ایک ماہ کا نوٹس دے کر ترک موالات کی تحریک کا کام شروع کر دیا جائے۔ اُسی زمانہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ بنارس میں منعقد ہوا جس میں تحریک ترک موالات کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر جون میں ہندو مسلمان لیڈروں کی مشترکہ کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی جس کے بعد مسلمان لیڈروں نے وائسرائے کو یہ پیام بھیجا کہ اگر وہ شرائط صلح پر نظر ثانی کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو تحریک ترک موالات شروع کر دی جائے گی۔ مہاتما گاندھی نے بھی وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ اُسی زمانہ میں حکیم صاحب نے دہلی میں ایک روزانہ اخبار جاری کرنے کا انتظام کیا۔ اس کا نام صباح تھا۔ اُس کی ایک ابتدائی اشاعت میں حکیم صاحب کا ایک پیام شائع ہوا جس میں اُنہوں نے قومی اخباروں کے متعلق حکومت کی سخت گیری کا اس طرح ذکر کیا کہ

"گو میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ دفتری اقتدار کا پنجہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی اخباروں پر زیادہ آسانی سے چلایا جاتا ہے لیکن یہ بھی کچھ ایسے آدا گوں سے واقف ہو گئے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اُن کی زندگی ختم

کر دی جاتی ہے تو پھر دوبارہ بدلے ہوئے روپ میں
جلوہ افروز ہو کر اپنے عزم و استقلال کا ثبوت دئے
بغیر نہیں رہتے۔ یادش بخیر جمہور نے جب اپنے چہرہ پر فنا
کی نقاب ڈالی تو صباح کی برقعہ کشائی نے اُس کی تلافی
کر دی۔ اس لئے مجھے اطمینان ہے کہ اگر صباح نے بھی
اپنے برادر مرحوم کا ساتھ دیا تو پھر اُسی جمہور کی روح
کسی اور روپ میں اپنی رونمائی سے باز نہیں رہے گی۔

ہندستان میں اسلامی اخبارات کے لئے یہ ایک عجیب زمانہ تھا۔ کوئی قومی اخبار ایسا نہ تھا جس پر حکومت کے دست درازی کی دو چار ضربیں نہ لگی ہوں۔ روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں کی موت و زیست کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک اخبار بند ہوتا تھا تو اُس کی جگہ دو اور نکل آتے تھے۔ ہر اخبار نویس دو چار مہینہ میں ایک دفعہ تو ضرور ہی اپنے اخبار کا نام بدلتا تھا۔ نہ حکومت اُس کو تازیانے مارتے مارتے تھکتی تھی نہ وہ آواگون کے اس تسلسل سے رُکتا تھا۔

تحریک ترک موالات مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی ہندستان کے طول و عرض میں دورہ کر رہے تھے اور اُن کی تقریروں اور بیانات نے تمام ملک کو انتہائی قربانیوں کے لئے تیار کر دیا تھا۔ آخر ۳۱ اگست کو "یوم خلافت" کے نام سے ملک کے ہر گوشہ میں ہڑتال ہوئی اور اس ہڑتال سے "تحریک ترک موالات" کا آغاز ہوا۔ دنیا کی سیاسی تاریخ میں یہ ایک نئی طاقت مطالبہ حقوق آزادی کے میدان میں آئی۔

مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء کے بلوہ اور بدامنی کی پاداش میں حکومت نے اہل دہلی سے ایک بڑی رقم بطور تاوان وصول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن کوئی شخص اس تاوان کے ادا کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ حکیم صاحب نے بھی اس حکم کی تعمیل سے قطعاً انکار کر دیا اور ترک موالات یا نافرمانی قانون کا یہ پہلا قدم تھا جو انہوں نے اٹھایا۔ اسی زمانہ میں اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ

"اہل دہلی اس تاوان کو ناپسند کرتے ہیں اور چونکہ وہ اسے خلاف انصاف سمجھتے ہیں اس لئے اس کو ادا کرنا نہیں چاہتے۔ ...... میرے خیال میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ایک طرف دہلی کے ہندو اور مسلمانوں کی بہت سی قیمتی جانیں بعض حکام کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ضائع ہوں اور دوسری طرف وہ اس غیر متوقع تاوان کو خوشی کے ساتھ برداشت کریں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اپنے وطن کے ہندو اور مسلمانوں کے جائز اور واجبی احساس میں شرکت کروں اور اس ناجائز تاوان کو ادا نہ کروں۔"

دہلی میں جب اجمل خاں کہیں کہ یہ تاوان ادا نہ کروں گا تو سمجھ لیجئے کہ ہر بچہ اور بوڑھا یہی کہہ رہا ہوگا۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب کی آواز دہلی کی آواز تھی۔ خیال تھا کہ شاید اس انکار کے بعد حکومت زبردستی تاوان وصول کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن تحریک ترک موالات کے ہنگامہ میں جب کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ شورش کے مقابلہ میں حکومت کو اپنے حاکمانہ اقتدار ہی کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا یہ مقامی مسئلہ نظر انداز نہ

ہو گیا۔

ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں حکیم صاحب کا زیادہ وقت کلکتہ میں صرف ہوا جہاں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت اور جمعیۃ علما کے فیصلہ کن جلسے ہو رہے تھے۔ کانگریس نے مہاتما گاندھی کی تجاویز کو باوجود اختلاف رائے کے بہت بڑی اکثریت سے منظور کر لیا تھا۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے فیصلہ کا اتباع کیا، خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علما نے بھی کانگریس کے پروگرام کے قدم بقدم حرکت شروع کی۔ ہجرت اور نظام شرعی قائم کرنے کی تجاویز کے علاوہ جو جمعیۃ نے پیش کی تھیں باقی تمام پروگرام پر تمام جماعتوں نے متفق ہو کر ایک مورچہ قایم کر لیا۔ ترک خطابات اور ملازمت سرکاری، عدالتوں کا بائیکاٹ۔ طلبا کی مدارس سے علٰحدگی اور اسی قسم کی ہدایات نان کوآپریشن کے پروگرام میں منظور کی گئیں۔

کم و بیش دو برس تک سیاست کے میدان میں کام کرنے کے بعد علما کی جماعت نے ایک "نظام شرعی" قایم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھایا۔ اس تجویز کا تخیل بظاہر یہ تھا کہ ایک نظام شرعی کے تحت علما کی جماعت مسلمانوں کی قومی زندگی پر اپنا اقتدار قایم کرے۔ اس تخیل سے جس میں ہندستان کی قدیم "برہمنیت" کا ایک پہلو نمایاں ہوتا تھا حکیم صاحب متفق نہ تھے۔ وہ علما کو ایک حد سے آگے سیاست کے اندر لانا نہ چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوائے چند کے باقی جماعت سیاسی تصورات کی وسعت میں اپنی ناآزمودہ کاری اور ناواقفیت کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا باعث ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک زمانہ دراز کے جمود اور قدامت پسندی کے بعد ہندستان کے علما سیاسی

کاروبار سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ وہ سیاسی میدان میں قیادت کی ذمہ داریوں کو سنبھال نہیں سکتے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس جماعت کے بعض بہت صائب الرائے اراکین نے جو میدان میں آئے بسا اوقات اپنے اعلیٰ تدبر کا ثبوت دیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایسے مدبر چند ہی تھے اور جمعیۃ کے زیادہ اراکین ایسے تھے جن کا کتابی علم فہم عامہ کے پس منظر سے محروم تھا۔ جہاں تک ملک کے اعتدال پسند طبقہ کا تعلق تھا یہ لوگ کانگریس کی روز افزوں رفتار کے ساتھ دوڑ نہیں سکتے تھے اور چونکہ کلکتہ میں ایک انقلابی پروگرام زیر بحث تھا اس لئے سر نیدر و ناتھ بنرجی اور نواب ڈھاکہ جیسے لوگ کانگریس اور لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کرنے پر آمادہ نہ کئے جا سکے۔ حکیم صاحب کانگریس کے فیصلوں سے بہت مطمئن آئے اور دہلی آکر انہوں نے جو بیان اخبارات کو دیا اس سے ترک موالات کے پروگرام کے متعلق ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ

> "لیڈروں کا یہ عزم کہ وہ ہر حال میں کانگریس کے فیصلے پر قایم رہیں گے اس امر کی ضمانت ہے کہ قوم پرستوں کی جماعت بہمہ وجوہ متحد رہے گی......... مسٹر سی آر داس مسٹر پٹیل مسٹر پال اور سر اسوتوش چودھری اور دوسرے احباب نے بھی جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں موجود تھے کانگریس کی منظور کردہ تجویز کی تعمیل کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے اپنی سچائی۔ وسیع الخیالی اور حب وطن کا ثبوت دیا۔ ایک ایسی کمیٹی بنایا جاتا جس کے ممبر مسٹر پٹیل پنڈت

موتی لال نہرو اور مہاتما گاندھی ہیں اور جس کی غرض یہ ہے کہ ترک موالات کی تحریک کو عملی صورت میں لانے کے لئے قواعد مقرر کرے نہایت دانشمندانہ کارروائی ہے۔ اینگلو انڈین اصحاب یہ دیکھ کر مایوس ہونگے کہ قوم پرستوں کی جماعت میں جس نفاق کی امید پر وہ خوش ہو رہے تھے وہ امید موہوم ثابت ہوئی۔ لیکن باقی ہندستان یہ دیکھ کر مسرور ہوگا کہ اُس کے لیڈروں نے آخرکار آزادی ضمیر آزادی افراد اور کامل سوراج کے لئے جدوجہد کرنے پر کمر باندھ لی ہے۔"

کمر بندی

کانگریس کے اس اجلاس کی مزید تفصیل ڈاکٹر انصاری نے اپنی یادداشت میں اس طرح بیان کی ہے کہ

ستمبر ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کانگریس کا جو خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اُس اجلاس میں مہاتما گاندھی نے گورنمنٹ کے خلاف نان کوآپریشن کی تحریک پیش کی۔ مہاتما گاندھی کے ہم خیال ہندو لیڈروں میں صرف پنڈت موتی لال نہرو تھے اور جواہر لال نہرو جو اُس وقت بہت ہونہار نوجوان سمجھے جاتے تھے اپنے والد کے ہم خیال تھے لیکن آل انڈیا لیڈروں میں سے خود صدر کانگریس لالہ لاجپت رائے، مسٹر سی۔آر داس، بپن چندر پال، بومکیس چکرورتی، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسز اینی بیسنٹ کیلکر، آسنے موسجے، وسجے رگھواچاریہ، یہ سب مخالف تھے۔ البتہ مسلمانوں میں سوائے مسٹر محمد علی جناح کے سب مہاتما جی کے موافق تھے

اور منجملہ اُن کے شوکت علی صاحب، حکیم اجمل خاں صاحب،
مولوی ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر مظہر الحق
خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اس کانگریس میں مسلمان کثرت
سے شریک ہوئے تھے اور نان کواپریشن کا رزولیوشن باوجود
بنگال کے لیڈروں کی بے انتہا کوشش کے جس کے لئے
کئی سو نئے ڈیلیگیٹ آخر وقت میں شریک کرائے گئے تھے
مسلمانوں کی کثرت آرا سے جو بقدر ایک ہزار ووٹ کے تھی
منظور ہو گیا ...... کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ
مسلمانوں نے اپنی کثرت تعداد کی وجہ سے کانگریس کو ایک
دلیرانہ اور جارحانہ پروگرام منظور کرنے پر مجبور کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور ایسی حقیقت ہے جس پر مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیئے کہ اُن ہی کی قوت نے حکومت اور کانگریس کے مقابلہ کا میدان تیار کیا اور اُس تحریک کا آغاز کیا جو بعد میں آزادی کی کامیاب تحریک ثابت ہوئی۔ گو کہ بعد کے حالات اور مسلم لیگ کی فرقہ پرست قیادت نے مسلمانوں کے دامن پر تقسیم ہند اور دو قومی نظریہ کا دھبہ لگا دیا لیکن اُس ابتدائی دور کا کوئی بڑا مسلم لیڈر ایسا نہ تھا جو آخر تک جنگ آزادی کے میدان میں قایم نہ رہا ہو۔

انگریز کا حربہ

ایوان حکومت میں کانگریس کے اس فیصلہ نے تہلکہ مچا دیا اور پھر ایک دفعہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اسلحہ خانہ کے ہتھیاروں سے کام لیا جانے لگا۔ کانگریس کے اجلاس کے بعد مہاتما گاندھی، علی برادران اور حکیم صاحب ہندستان کا دورہ

کر رہے تھے، انگلستان میں جو وفد مولانا محمد علی کی سرکردگی میں گیا تھا وہ جد و جہد کر رہا تھا اور وسط ایشیا میں بولشویک فوجیں آندھی کی طرح چڑھ رہی تھیں اور وہ ایک سیلاب تھا جو اُن ممالک کے تمام نظام کہنہ کو بہائے لئے جا رہا تھا، بخارا فتح ہو چکا تھا اور امیر بخارا افغانستان میں پناہ گزیں تھا۔ آیرلینڈ میں جنگ آزادی جاری تھی۔ اس طرح برطانیہ ہر طرف سے سخت تردداتَ میں مبتلا تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے غافل نہ تھا کہ اگر ہندستان میں قومی تحریک نے زور پکڑا تو اُس کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ چنانچہ فرقہ بندی کے فتنہ کو پھر جگایا گیا اور جس وقت ملک کے لیڈر دورہ کر رہے تھے۔ مختلف گوشوں سے ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب کو جن کی زندگی کا واحد مقصد فرقہ واری اتحاد تھا ان خبروں نے بیچین کر دیا۔ آگرہ میں اس فتنہ نے بدترین صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ چند قومی کارکنوں کو ساتھ لیکر وہ فوراً آگرہ گئے اور جب تک کہ فساد کو ختم کرا کے فریقین میں صلح نہ کرا دی وہاں جمے رہے۔ آگرہ میں حالت یہ ہوگئی تھی کہ کوئی مسلمان ہندوؤں کے محلہ میں اور کوئی ہندو مسلمانوں کے محلہ میں قدم نہ رکھ سکتا تھا اور نہ فریقین مصالحت کی بات کرنے پر آمادہ تھے۔ انگریزی حکام اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے۔ شہر کے جو لوگ اُن کے پاس فریاد لیکر جاتے تھے اُن سے کہا جاتا تھا کہ جاؤ ہوم رول والوں سے امداد چاہو۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب خود ہندوؤں کے اُن محلوں میں گئے جہاں کوئی مسلمان اپنا سر ہتھیلی پر رکھے بغیر نہ جا سکتا تھا بالآخر اُن کی جد و جہد

کا نتیجہ حسب مراد حاصل ہوا اور فریقین نے حلف اٹھایا کہ وہ اب صلح اور دوستی کے ساتھ متحد رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حکیم صاحب اُس وقت آگرہ نہ پہنچ گئے ہوتے تو وہی آگ جو ۱۹۲۳ء میں لگائی گئی ۱۹۲۰ء ہی میں لگ چکی ہوتی مہاتما گاندھی بھی ان واقعات سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے ینگ انڈیا میں لکھا کہ

بیان کیا جاتا ہے کہ جب فریقین میں سے کوئی حکام کے پاس جاتا تھا تو اُس سے کہدیا جاتا تھا کہ "شوکت علی یا گاندھی کے پاس جاؤ" خوش قسمتی سے ہم سے بہتر ایک آدمی قریب ہی موجود تھا۔ حکیم جی اجمل خاں ایک سچے مسلمان ہیں جن پر دونوں قوموں کو اعتماد ہے۔ چنانچہ وہ اپنے چند شرکا کو لیکر آگرہ گئے اور وہاں جا کر اُنہوں نے جھگڑا طے کر دیا .... مگر حکیم اجمل خاں ہر جگہ اور ہر وقت صلح اور امن کے فرشتے کی طرح تو نہیں پہنچ سکتے نہ میں اور مولانا شوکت علی ہر جگہ اور ہر وقت پہنچ سکتے ہیں .... دونوں قوموں میں کامل صلح اور امن قایم رہنی چاہیئے خواہ اُن کے اندر تفریق پیدا کرنے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جائیں۔

کلکتہ کانگریس کے بعد اکتوبر نومبر اور دسمبر میں مولانا محمد علی انگلستان سے واپس آئے اور مہاتما گاندھی کے ساتھ نان کوآپریشن کے کام میں شریک ہو گئے۔ اسی زمانہ میں پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی۔ آر۔ داس نے اپنی وکالت کے پیشہ کو ترک کر کے ملک کے سامنے عظیم الشان ایثار

اور قربانی کا نمونہ پیش کیا۔

تعلیمی نان کو اپریشن

نان کو اپریشن کے پروگرام میں حکیم صاحب تعلیمی نان کو اپریشن کی تحریک سے متفق نہ تھے اُن کا خیال تھا کہ طلبا کو تعلیم سے علیحدہ کرنا اتنا مفید ثابت نہ ہوگا جتنا کہ اُن کے سلسلہ تعلیم کا منقطع ہونا ملک کے لئے نقصان رساں۔ خصوصاً طبیہ کالج کو جس کے وہ سکریٹری اور بانی تھے اور جو حکومت سے کوئی امداد نہ لیتا تھا اور نہ صحیح معنی میں ایک قومی ادارہ تھا وہ نقصان پہنچانا نہ چاہتے تھے۔ لیکن مہاتما گاندھی نے یہ کہہ کر اُنہیں اپنی رائے سے متفق کرلیا کہ جب خود مادر وطن بیمار ہو تو سب پر مقدم اُس کا علاج ہے۔

نومبر ۲۰ء میں حکیم صاحب، علی برادران اور اُن کے ہم خیال اصحاب نے ایک مشترکہ مکتوب کے ذریعہ سے علی گڑھ یونیورسٹی کے ارباب کار کو دعوت دی کہ وہ گورنمنٹ کی امداد لینا بند کردیں اس لئے کہ "اُس کے ذریعہ سے گورنمنٹ اپنا اثر و اقتدار یونیورسٹی کے نظم ونسق میں حاصل کررہی ہے جو مسلمانوں کے لئے ایک سم قاتل سے کم نہیں"۔ اس مراسلہ میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ حکومت نے جو ناانصافیاں مسلمانوں کے ساتھ کی ہیں اُن کا تقاضہ یہ ہے کہ "تمام ایسی درسگاہوں کا جن کو گورنمنٹ چلاتی ہے یا جن کو گورنمنٹ مالی امداد دیتی ہے بائیکاٹ کیا جائے۔" آخر میں ٹرسٹیوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ ۲۹ راکتوبر تک وہ اس فیصلہ کو قبول نہ کرلیں گے تو پھر اساتذہ اور طلبا سے اپیل کی جائے گی کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ دیں۔ اس مراسلہ پر حسب ذیل دستخط تھے:۔

اجمل خاں - مختار احمد انصاری، معظم علی، ظہور احمد، شوکت علی، محمد علی محمد اسمٰعیل خاں، حاجی موسیٰ خاں۔

میران کورٹ کے جلسے میں حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مسٹر عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر انصاری، تصدق احمد خاں شروانی اور مولانا شوکت علی وغیرہ نے میران کو پھر ایک دفعہ ترک موالات کی دعوت دی، لیکن علی گڑھ کے قدامت پرستوں کی طرف سے اس دعوت کا جواب یہ ملا کہ انہوں نے ان سب کے خلاف بے اعتمادی کا رزولیوشن پاس کر دیا۔ اس رزولیوشن کے بعد لیڈروں نے براہ راست طلبا سے اپیل کی۔ اس اپیل کے جواب میں تقریباً ۲ سو طلبا نے مسلم یونیورسٹی کو چھوڑ دیا۔ اس وقت یہ سوال سامنے آیا کہ اب ان طلبا کے لئے کوئی درسگاہ قایم کی جائے یا اُن کو نان کوآپریشن کی تحریک کا مبلغ بنا کر ملک کے گوشوں میں پھیلا دیا جائے۔ مولانا محمد علی کی یہی رائے تھی لیکن حکیم صاحب اور اُن کے ساتھ ڈاکٹر انصاری عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی وغیرہ کی یہ رائے تھی کہ ان طلبا کے لئے ایک قومی درسگاہ قایم کی جائے۔

جامعہ ملیہ ۵ر نومبر ۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن با وجود اپنی علالت اور ضعیفی کے علی گڑھ تشریف لائے اور ایک بہت بڑے جلسہ میں جو مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں منعقد ہوا مولانا نے جامعہ ملیہ کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے دس ہزار روپیہ ماہانہ کی امداد اس ادارہ کے لئے منظور کی۔ حکیم صاحب امیر جامعہ منتخب ہوئے اور آخر عمر تک اس عہدے کے فرائض انجام دیتے

رہے۔ عبدالمجید خواجہ شیخ الجامعہ مقرر کئے گئے۔ چند ہی روز میں ہندستان کے قابل ترین اشخاص قلیل تنخواہوں پر اس ادارہ میں درس دینے کے لئے آگئے۔ خود حکیم صاحب اس ادارہ کی روح رواں بن گئے اور جس طرح اُن کی پہلی اولاد معنوی طبیہ کالج تھا جامعہ ملیہ دوسری اولاد معنوی بن گیا۔

۲۹ر اکتوبر کو جامعہ ملیہ علی گڑھ کے چند بنگلوں اور کچے مکانوں میں قایم ہوا اُس کی ترقی کا ذکر آیندہ صفحات میں آئے گا۔

علی گڑھ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی بنارس یونیورسٹی میں بھی یہی پیام لیکر گئے۔ اُس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ بنارس میں موجود نہ تھے اس لئے کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ لیکن بعد میں جب مہاتما گاندھی نے پنڈت جواہرلال نہرو اور ڈاکٹر انصاری کو پھر بنارس بھیجا تو تقریباً چار سو طلبہ یونیورسٹی سے نکل آئے۔ اُسی وقت کاشی ودیا پیٹھ قایم ہوا جس کے پرنسپل بابو بھگوان داس اور سکریٹری سری پرکاش مقرر ہوئے۔

ترک موالات کے چند گوشے

۱۹ر نومبر سے دہلی میں جمعیتہ علما کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حکیم صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور اس حیثیت سے اُن کا خطبہ اُن خطبات میں سے ایک بہترین خطبہ تھا جو اب تک جمعیتہ کے پلیٹ فارم پر پڑھے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ مکمل خطبہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اس خطبہ میں حکیم صاحب نے ترک موالات کی تمام تجاویز کے متعلق اپنے خیالات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے تھے اور علما کو خاص خاص قومی

ضرورتوں پر متوجہ کیا تھا۔

نومبر اور دسمبر میں جب کانگریس کے اجلاس ناگپور سے پہلے حکیم صاحب دہلی کے مقامی کاموں میں مصروف تھے تو حالت یہ تھی کہ ترکوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آرہا تھا۔ برطانیہ کی امداد سے یونانی سمرنا پر قبضہ کر چکے تھے۔ مصطفٰے کمال خود قسطنطنیہ کی حکومت کی نظر میں باغی قرار پائے تھے۔ لیکن دنیا کی نظریں اب اُنھی طرف لگی ہوئی تھیں۔ صلحنامہ پر دستخط ہو جانے کے بعد بھی آزادی وطن کا یہ مجاہد پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

> "ترکی گورنمنٹ کو اپنے محضر قتل پر دستخط کرنے پڑے دول نے اس قسم کی چوری کی ہے جیسے جرمنی نے بلجیم کے متعلق ۱۹۱۴ء میں کی تھی۔ لیکن اہل ترکی اس کی اجازت کبھی نہ دیں گے کہ اُن کو اس طرح لُوٹا جائے۔ میرے پس پشت سارا عالم اسلام ہے اور میں نے ایک بزرگ ترین معاون (خدا) ڈھونڈھ لیا ہے جو میری مدد کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہے۔"

بہت کم لوگ اُس وقت جانتے تھے کہ ہندستان کے ۷ کروڑ مسلمانوں کی درخواستوں، التجاؤں، سیاسی قربانیوں اور شورشوں سے جو مقصد حاصل نہ ہو سکا اُسے مصطفٰے کمال بزور بازو حاصل کر سکے گا۔ خلافت کا مسئلہ ابھی اناطولیہ میں آخری فیصلہ کا منتظر تھا اور اُدھر ہندستان میں استبداد اور جبر کے تمام آلاتِ حرب تحریک ترک موالات کے خلاف استعمال ہو رہے تھے۔ خلافت اور کانگریس

کے والنیٹر خلاف قانون قرار دیئے جا چکے تھے اور قانون مجالس مغویانہ نافذ ہو چکا تھا۔ لیکن تحریک آگے بڑھ رہی تھی۔ خلافت لیگ اور کانگریس کے اجلاس ناگپور میں منعقد ہوئے ڈاکٹر انصاری اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

ناگپور کے اجلاس کانگریس کے سلسلہ کا سفر کرسمس کے ہفتہ ۲۰ء میں کبھی نہ بھولے گا......... اس سال کانگریس کے صدر وجے رگھوا چاریہ اور خلافت کانفرنس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کا صدر میں منتخب ہوا تھا۔ کانگریس کے صدر تحریک ترک موالات کے سخت خلاف تھے۔ مسٹر جناح بپن چندر پال اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے سبجکٹ کمیٹی میں اور کھلے اجلاس میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کی سخت مخالفت کی۔ مگر مسٹر سی آر داس اور لالہ لاجپت رائے ناگپور میں مہاتما جی کے ہم خیال ہو گئے.......
دراصل مہاتما جی کو ناگپور میں ایسی مکمل کامیابی ہوئی کہ اس کے بعد سے کانگریس پوری طرح اُن کے زیر اثر آ گئی۔ ناگپور میں علاوہ نان کواپریشن کے کانگریس کی کریڈ بھی تبدیل کر دی گئی اور عدم تشدد کا اصول تسلیم کر لیا گیا...... اقلیتوں کی نمایندگی کے لئے خاص قاعدے بنائے گئے.........

پہلی دفعہ کانگریس کے پلیٹ فارم پر خلافت کے متعلق

مسلمانوں کے ایک خالص مذہبی مطالبہ کی تائید کی گئی۔
اس قرارداد کے محرک خود مہاتما گاندھی تھے اور اس کی تائید کرنے کے لئے مسٹر سی۔آر۔داس، پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم صاحب تجویز ہوئے تھے۔ لیکن حکیم صاحب نے مہاتما جی کو مشورہ دیا کہ اگر یہ قرارداد صرف ہندو لیڈروں کی تائید سے منظور کی جائے تو اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر پہلی مرتبہ ڈاکٹر انصاری نے مسلمانوں کو یہ نوید دی کہ صلحنامہ ترکی میں ترمیم و تغیر کے آثار نمایاں ہیں اور یہ کہ اتحادی اور برطانیہ حالات سے عاجز آکر اب صلحنامہ کی ترمیم پر آمادہ ہیں۔ حکیم صاحب نے بھی جا بجا اپنی تقریروں میں بہتر امیدوں کا اظہار کیا۔ کانگریس و لیگ کے اکثر لیڈر یہ محسوس کر رہے تھے کہ حکومت کا بڑھتا ہوا تشدد اس کی کمزوری کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور کچھ عجب نہیں کہ تحریک ترک موالات کے ذریعہ سے وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو ڈیڑھ سو سال کی مسلسل نیازمندی اور موالات سے حاصل نہ ہوا تھا۔
ڈاکٹر انصاری کے خطبہ صدارت کے آخری الفاظ یادگار تھے:-

"جھوٹی امیدوں اور ڈرانے والے خطروں سے ہماری ہمتوں کو کمزور نہ ہونے دو۔ ہم کو نہ صرف اپنے ملک کی حفاظت کرنی ہے بلکہ ہمیں تمام انسانیت کو اس مادیت سے بچانا ہے جو روحانیت کو مٹا دینے والی ہے۔ آدھے راستے پر رک جانے اور دم لینے کا خیال بھی نہ کیجیے۔ راستہ

کی پرچھائیوں سے دھوکہ نہ کھائے۔ ایوان آزادی کے عظیم الشان مینارے ہماری نظر کے سامنے ہیں اور اگر ہم میں ترک موالات کا سفر جاری رکھنے کی قوت ارادی ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہم بہت جلد اعلیٰ انسانی تقدیر کے لازوال حصار میں اپنے کو محفوظ پائیں گے۔"

امیدوں اور حوصلوں کی اس بلندی پر ۱۹۲۱ء کے پہلے دن کا آفتاب طلوع ہوا۔

۱۹۲۱ء

حکیم صاحب کی زندگی میں ایک اہم واقعہ طبیہ کالج کا افتتاح تھا جس کی رسم مہاتما گاندھی نے انجام دی۔ کالج کی عمارتوں کے لئے حکیم صاحب محض اپنے ذاتی تعلقات کے ذریعہ سے ۱۰ لاکھ روپیہ جمع کر چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں یہ عمارتیں تیار ہو گئیں۔ ان کا سنگ بنیاد لارڈ ہارڈنگ نے نصب کیا تھا۔ لیکن اب حکیم صاحب کی یہ تحریک قومی تحریکوں سے وابستہ ہو چکی تھی اس لئے جب عمارتوں کے افتتاح کا وقت آیا تو مہاتما گاندھی سے اس رسم کے انجام دینے کی درخواست کی گئی۔ حکیم صاحب کے سیاسی تصورات کے ارتقا کا یہ ایک نظر افروز مظاہرہ ہے کہ کالج کے دروازہ پر ایک طرف لارڈ ہارڈنگ کا نام کندہ ہے تو دوسری طرف مہاتما گاندھی کا۔ دروازہ کی اس چند گز کی چوڑائی میں چار قدم دروازہ کے ایک ستون سے دوسرے ستون تک رکھئے تو حکیم صاحب کی پبلک زندگی لارڈ ہارڈنگ کے نام سے شروع ہو کر مہاتما گاندھی کے نام پر تکمیل پاتی ہے!۔

اس موقعہ پر مہاتما گاندھی نے جو تقریر کی وہ شروع ان الفاظ سے ہوتی تھی کہ "میں نہایت افسوس کے ساتھ اس کالج کا افتتاح کرتا ہوں" پھر انہوں نے فرمایا کہ

میں موجودہ نظام طب سے خوش نہیں ہوں۔ میری ناراضگی کی وجہ بالکل ذاتی ہے وہ یہ کہ دواؤں اور شفاخانوں کی نسبت میرے عجیب خیالات ہیں۔۔ ۔۔۔۔۔ لیکن لائق و فائق حکیم جی کے خیال نے میری کشیدگی کو رفع کر دیا میں صدق دل سے اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اس کالج کا افتتاح سیاسی غرض سے کیا ہے۔ میں حکیم صاحب کو ہندو مسلم اتفاق کا رکن اعظم سمجھتا ہوں جس کے بدوں ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ میں اس کالج کو بھی اُس یگانگت کا پیش خیمہ جانتا ہوں۔۔۔۔

پھر مہاتما جی نے طب کے متعلق اپنے عقائد کی اس طرح توضیح فرمائی کہ:-

میرا اعتقاد ہے کہ شفاخانوں کی کثرت۔ بجائے اس کے کہ وہ تہذیب کا نشان ہو تنزل کی علامت ہے۔ جہاں مویشی خانے زیادہ ہو جاتے ہیں وہاں کے آدمی اپنے جانوروں کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ لیکن مجھ کو امید ہے کہ اس کالج کا مدعا شفا دینے کے بجائے بیماریوں کا روکنا ہوگا۔ علم حفظانِ صحت علم شفا کی بہ نسبت اعلیٰ اور افضل ہے۔ لیکن اُس پر عمل قدرے مشکل ہے۔ میں موجودہ طبی نظام کو کالا جادو سمجھتا ہوں کیونکہ اس

سے ناجائز تن پروری تو ضرور ہوتی ہے لیکن روح
پروری سے تغافل شعاری اختیار کی جاتی ہے۔ میں
طلبا اور کالج کے پروفیسروں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ
ایسے قوانین کی تحقیقات کریں جن سے روح کو صحت
حاصل ہو۔ تب اُن کو معلوم ہوگا کہ جسم کی صحت کے بجائے
روح کی صحت سے کس قدر تعجب انگیز نتائج نکلتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات طبیہ کالج کے احاطہ میں غالباً اس سے پہلے کبھی نہ سنے گئے ہونگے۔

اس موقعہ پر طبی کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا جس میں حکیم صاحب نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ تمام سرکاری اور قومی درسگاہوں میں یونانی طب اور ویدک کے پروفیسر مقرر ہونے چاہئیں۔

پھر دل طواف کوئے ملامت کو جائے ہے

حکیم صاحب طبیہ کالج کی مصروفیات سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ اُسی زمانہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا اس سلسلہ میں ملک کے تمام ہندو اور مسلمان لیڈر صبح سے شام تک شریف منزل میں جمع رہتے تھے۔ اسی دوران میں اطلاع ملی کہ صدر خلافت سیٹھ جان محمد چھوٹانی کو انگلستان کے وزیر اعظم کا ایک تار وصول ہوا ہے اور نمایندہ مسلمانوں کا ایک وفد مسئلہ خلافت اور صلح کی شرائط پر گفتگو کرنے کے لئے انگلستان بلایا گیا ہے اور حکومت کی یہ خواہش ہے کہ صدر خلافت کمیٹی بھی انگلستان آئیں۔ دہلی میں حکیم صاحب اور دوسرے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ سیٹھ صاحب کے ساتھ

ڈاکٹر انصاری بھی جائیں۔ بہت سے اہم مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ خلافت کے تمام لیڈر فوراً بمبئی میں جمع ہوں۔ چنانچہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری فوراً بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں دن بھر مشورہ کرنے کے بعد یہ وفد ۱۴؍فروری ۲۱ء کو روانہ ہوگیا۔

یہ وفد جس وقت لندن پہنچا تو وہاں ترکی کے دو وفود پہنچ چکے تھے۔ ایک استنبول کی مفلوج حکومت کا جو اتحادیوں کے زیر اثر تھی اور دوسرا آزاد انقرہ کا۔ دونوں وفود سے گفت وشنید شروع ہو چکی تھی لیکن درحقیقت انقرہ ہی کا وفد پیش پیش تھا۔ دوسرا وفد محض نمائشی تھا۔ ہندستان کے مسلمانوں کے وفد کے اراکین حسب ذیل اصحاب تھے:۔

سیٹھ چھوٹانی، آغا خاں، سید حسن امام، ڈاکٹر انصاری، شیخ مشیر حسین قدوائی، قاضی عبدالغفار۔

سید حسن امام وفد کے وکیل بنائے گئے۔ وزیر اعظم لائیڈ جارج سے وفد کی دو ملاقاتیں ہوئیں لیکن جیسا کہ معلوم تھا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ برطانوی حکومت کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔ ترکوں سے کوئی منصفانہ مصالحت مدنظر ہی نہ تھی، مقصد تو صرف یہ تھا کہ یونانیوں کو اسلحہ اور روپیہ دیکر انقرہ سے جنگ جاری رکھنے کی ہمت دلائی جائے۔

لہذا انگلستان کے طرز عمل سے مایوس ہو کر یہ وفد ہندستان واپس آیا اور اُس نے اہل ملک کو انگلستان کی بدنیتی کا کچا چٹھا سنا دیا۔

ایک کروڑ کی کسوٹی

مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بجواڑہ میں ہندستان کے قومی جوش وخروش کو ایک کسوٹی پر رکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا کہ تلک سوراج فنڈ

کے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس کسوٹی پر اہل ملک کی ہمتیں کامیاب اتریں اور ایک ہی مہینہ کے اندر یہ رقم بلکہ اس سے کچھ زیادہ جمع ہوگئی۔ کانگریس کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علما کا قدم بھی بڑھ رہا تھا۔ جمعیتہ کے مذہبی فتوے اب حکومت کی نظریں کانگریس کے رزولیوشنوں سے زیادہ خطرناک سمجھے جانے لگے تھے چنانچہ جس وقت جمعیتہ نے گورنمنٹ کی ملازمت اور خصوصاً پولس اور فوج کی ملازمت کے خلاف ایک امتناعی فتوے شائع کیا تو اُسے فوراً ضبط کر لیا گیا۔ لیکن مسلمان اس ضبطی کے خلاف عملاً احتجاج کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اس عرصہ میں شملہ پر وائسرائے نے مہاتما گاندھی سے ملاقات کی اور اُن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُن کے مسلمان شرکا خصوصاً علی برادران عدم تشدد کے اصول کی پابندی نہیں کرنا چاہتے۔ مہاتما جی نے دونوں بھائیوں کی طرف سے وائسرائے کو یقین دلایا کہ اُن کا یہ خیال غلط ہے اور وہاں سے واپس آکر علی برادران کی ایک تحریر وائسرائے کے پاس بھجوا دی۔ اس تحریر سے حکومت نے فوراً یہ فائدہ اُٹھایا کہ ہر طرف اس بات کی شہرت ہوگئی کہ علی برادران نے "معافی" مانگ لی ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس مفروضہ "معافی" کو بے اصل قرار دیا اور اس امر کو ظاہر کر دیا کہ اُن کی ملاقات سے حکومت نے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے بہرحال خود علی برادران کے طرز عمل سے بہت جلد اس مفروضہ "معافی" کی حقیقت ظاہر ہوگئی گمان یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کے بعد حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے

بھی ویسرائے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حکومت کی اس بدنیتی کا اندازہ کر کے ان دونوں اصحاب نے شملہ کا رخ کرنا پسند نہ کیا بلکہ ایک مشترکہ بیان شائع کر دیا جس میں اُنہوں نے کہا کہ

> یہ امر سخت افسوس ناک ہے کہ اعلیٰ طبقوں میں معمولی واقعات کو چالاکی سے کچھ اور ہی رنگ دینے کے لئے بیتابی کا اظہار کیا گیا ہے تاکہ اُن لوگوں کے مقابلہ میں ایک عارضی فائدہ حاصل کیا جائے جن کو گورنمنٹ کے وقار دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن سمجھدار اشخاص کے نزدیک جن کی پولیٹیکل دانائی ناموافق نتائج سے قریب معلوم ہوتی ہے فتح کا یہ قبل از وقت راگ جو ویسرائے کی تقریر کا ایک نمایاں پہلو ہے آیندہ تبادلہ خیالات کے لئے کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ ویسرائے نے اپنی چیمسفورڈ کلب والی تقریر میں انصاف کی حکومت کرنے کا جو ناخوشگوار ذکر کیا ہے اُسے آج سے دس سال پہلے تو نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اہم دستاویز

شروع جولائی میں کراچی کی خلافت کانفرنس میں علما کے اس فتوے کی توثیق اور حکومت کے حکم کی خلاف ورزی یہ اعلان عام کی گئی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ علی برادران، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دوسرے لیڈروں نے کانفرنس میں اور جلسوں میں اس فتوے کو پڑھا اور شائع کیا۔ ہزارہا اشخاص نے اس فتوے پر دستخط کر کے اُسے حکومت کے پاس بھیجدیا۔ حکومت

نے اس اعلانِ حق کا یہ جواب دیا کہ جن لیڈروں نے خلافت کانفرنس میں فتوے کی اشاعت کی تھی انہیں گرفتار کرلیا۔ اور اس طرح مشہور مقدمہ کراچی کا آغاز ہوا۔ لیکن جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا تو وہاں بھی ۲۶ ہندو مسلمان لیڈروں نے اس فتوے کے مطابق ایک اعلان پر دستخط کرکے اُسے شائع کر دیا اور گورنمنٹ کو چیلنج کیا کہ وہ ان سب لیڈروں کو بھی گرفتار کرلے۔ اعلان پر دستخط کرنے والوں میں صفِ اوّل کے تقریباً تمام لیڈر شامل تھے مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، عباس طیب جی، ولبھ بھائی پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، سیٹھ جمنا لال بزاز، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالباری، راجندر پرشاد، مولانا حسرت موہانی، سیٹھ چھوٹانی وغیرہ۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تاریخ میں اور خصوصاً ہندو مسلم اتحاد کی تاریخ میں یہ دستاویز ایک بہت اہم دستاویز ہے اور ایک بہت بڑا چیلنج تھا جس کا کوئی جواب حکومت نہ دے سکی۔ عوام کے محاذ پر اب حکومت کی زبردستیوں کا پورا پورا مقابلہ کرنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور حکومت بھی سمجھ چکی تھی کہ اُس کو اپنے اقتدار کے لئے ایک آخری لڑائی لڑنی ہے۔ چنانچہ پہلے تو یہ منصوبہ پکایا گیا کہ ہندستان کے شہنشاہیت پسند اور "وفادار" طبقہ کو خوش کرنے کے لئے انگلستان کے ولی عہد کو ہندستان لایا جائے اور دنیا کو یہ دکھایا جائے کہ ملک میں شورش پسندوں کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہے۔ لیکن ولی عہد کی آمد کا اعلان ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے کانگریس کو مشورہ دیا

کہ تمام ہندستان میں ولی عہد کی آمد کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس تحریک کو کانگریس نے منظور کر لیا۔

مظلوم موپلے

دوسری طرف حکومت نے مالابار کے موپلوں کے قضیہ کو فرقہ واری فتنہ میں تبدیل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حقیقت یہ تھی کہ مالابار کے موپلے جو عربی النسل ہیں خلافت کے مسئلہ میں حکومت کے طرزِ عمل سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اُنہوں نے بغاوت شروع کر دی۔ یہ ہنگامہ ماہ جون سے ستمبر تک جاری رہا۔ حکومت کو اس سلسلہ میں فرقہ واری فتنہ کو جگانے کا یہ ایک اچھا موقعہ ملا۔ اوّل تو وبیسرائے نے ایک خاص ارڈنینس کے ذریعہ سے موپلا قوم پر جس میں بچے بوڑھے اور عورتیں سب ہی شامل تھے ایسے مظالم توڑے جن کی مثال ۵۷ء کے بعد اس ملک کی تاریخ میں مل نہیں سکتی۔ ہزاروں موپلا بری طرح مارے گئے۔ اُن کے مکانات اور کھیت جلا دیے گئے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں بے آب و دانہ لقمہ اجل بنائی گئیں۔ اسی کے ساتھ اُن کے ہندو ہموطنوں کو حکومت کا جاسوس بنا لیا گیا اور خود جاہل موپلوں میں فرقہ واری اشتعال پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ چونکہ موپلا ایک جاہل اور جنگجو فرقہ تھا اور ابھی تک عدم تشدد کے اصول سے متاثر نہ ہوا تھا لہذا وہ حکومت کے اس جال میں پھنس گیا۔ چنانچہ بعض مقامات پر اُس نے ہندوؤں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کیں۔ انہیں قتل کیا اور زبردستی مسلمان بھی بنایا۔ لیکن اسی کے ساتھ مالابار کے ایک حصہ میں

موپلوں کے سردار تنگڑے نے اپنے ہندو ہمسایوں کو بہت دلیری کے ساتھ خطرات سے بچایا اور پناہ دی۔ ملک کے اخباروں میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ وحشی موپلے ہندوؤں کے دشمن ہیں اور زیادہ تر جبریہ تبدیل مذہب کے افسانے خوب رنگ کر پھیلائے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک کے ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہوا اور یہی حکومت کا عین مقصد تھا۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب نے اس فتنہ کی حقیقت کو واضح کرنے میں اپنے شخصی اثرات کو ہر سمت میں استعمال کیا اور مظلوم موپلوں کی امداد میں بھی بہت جد و جہد کرتے رہے۔

ولی عہد کا بائیکاٹ

اگر اس وقت ولی عہد کے بائیکاٹ کی تحریک نے ملک کو متوجہ نہ کر لیا ہوتا تو تعجب نہیں کہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو جاتے۔ پھر بھی پنجاب کی فضا پر موپلوں کی شورش کا بہت برا اثر پڑ چکا تھا جس کے نتائج بعد میں بیان ہونگے۔ نومبر میں ولی عہد انگلستان بمبئی پہنچے جس دن اُنہوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھا اُسی دن بمبئی میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ بدقسمتی سے بعض مواقع پر عوام اور پولس کے درمیان تصادم ہو گیا اور گولیاں چلیں۔ مہاتماجی نے عوام کے اس تشدد کی وجہ سے بطور کفارہ تین دن کا روزہ رکھا۔ نومبر دسمبر ۲۱ء اور جنوری اور فروری ۲۲ء میں حکومت ولی عہد کو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ہر جگہ اس نے کوشش کی کہ اُن کا خیر مقدم شاندار طریقے سے ہو۔ لیکن اُسے کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی لارڈ ریڈنگ

نے پنڈت مدن موہن مالویہ اور دوسرے اعتدال پسندوں کے ذریعہ سے مہاتماجی سے گفت و شنید شروع کی۔ اسی دوران میں الہ آباد لکھنؤ، کلکتہ، اور لاہور میں ولی عہد کی آمد کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے اور مختلف مقامات پر اکثر لیڈر اور ہزارہا کانگریسی گرفتار کر لئے گئے۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے بھی گرفتار کر لئے گئے۔

مہاتماجی اور لارڈ ریڈنگ کی ملاقات ہوئی لیکن جو شرائط مہاتماجی نے پیش کیں وہ وائسرائے نے منظور نہ کیں اس وجہ سے مزید ملاقات اور کوئی صلح کانفرنس نہ ہو سکی۔ اُس وقت مسٹر سی آر دی داس جیل میں تھے لیکن بقول ڈاکٹر انصاری اُن کی رائے یہ تھی کہ مہاتماجی کو صلح پر آمادہ ہو جانا چاہئے تھا اس لئے کہ وائسرائے اور حکومت بہت جھک گئی تھی اور اُس موقعہ سے پورا فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے آنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور وائسرائے بیتاب تھا کہ کسی طرح لیڈروں سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے اس لئے کہ بائیکاٹ کے سلسلہ میں حکومت کی غیر ممالک میں کافی بدنامی ہو رہی تھی۔ آخر جب اعتدال پسند لیڈروں کے ذریعہ سے بھی مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو حکومت نے مزید تشدد کا اعلان کر دیا۔ اُس وقت حکیم صاحب کی رائے بھی یہی تھی کہ مجوزہ گول میز کانفرنس کے انعقاد کو شرائط سے مشروط نہ کیا جائے بلکہ گول میز کانفرنس منعقد کرا کے اُس میں اپنے مطالبات کے لئے لڑنا چاہئے۔ بہرحال یہ صورت مہاتماجی نے پسند نہ کی اور

حکومت کے جبر و تشدد کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گی۔

اسی زمانہ میں علی برادران اور دوسرے علما کی گرفتاریوں کے متعلق حکیم صاحب نے ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ

> حکومت ہند اس امر پر آمادہ ہے کہ ملکی آزادی کی لہر کو جو ہندستان کے ہر حصہ میں موجزن ہے جبر و استبداد کی سنگین دیواروں سے روک دے ابنائے وطن بڑی بیتابی سے مستقبل کا انتظار کر رہے ہیں .... موجودہ تحریک نے ہندستان کے سیاسی سمندر میں ایک خوفناک طوفان برپا کر رکھا ہے اور عدم تعاون ایک ایسی زبردست طاقت ہے کہ مادی دنیا کی تمام مجتمع طاقتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آزادی کے شیدائی عدم تعاون کے نشہ میں سرشار ہو کر ملک و قوم کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں کر رہے ہیں۔ وہ خاموشی اور صبر سے مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ اور اسی کو اپنی کامیابی کا راز سمجھتے ہیں..... رہنمایانِ قوم اور فخر ملت جیل میں ڈالے گئے ہیں پس اہل ملک کے سامنے ایک ہی مرحلہ ہے اور وہ یہ کہ اس جبر و استبداد کے باوجود ان کا رویہ بلا تشدد و عدم تعاون کے عین مطابق ہو .... برادرانِ وطن آزادی کی جنگ لڑتے جاؤ اور عدم تشدد اور عدم تعاون پر کاربند رہو۔ اپنا فرض انجام دو اور معاملہ خدائے تعالیٰ

کے ہاتھ میں چھوڑ دو کہ وہی قضا و قدر کا مالک ہے اللہ اکبر۔

حکیم صاحب اُس زمانہ میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ اس حیثیت سے اُنہوں نے مجلس خلافت کی طرف سے عید الضحیٰ کے موقعہ پر ایک اعلان شائع کرایا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی نہ وہ عدم تعاون کے پروگرام پر پوری طرح عمل کریں۔ اس بیان میں حکیم صاحب نے زیادہ زور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ اور کھدر کے استعمال پر دیا۔

ہندو مہاسبھا شروع نومبر میں جب مہاسبھا کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا سبھا کی طرف سے حکیم صاحب کی قومی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ وہ سبھا کے صدر استقبالیہ منتخب کئے گئے۔ وہ تنہا ایک مسلمان تھے جو مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر اس حیثیت سے نظر آئے اور جن پر اس طرح مہاسبھا نے اظہار اعتماد کیا۔ نہ اُن سے پہلے اور نہ اُن کے بعد کبھی کسی مسلمان کو یہ مقام حاصل ہو سکا۔ یہ سچ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے رجحانات ۲۰ء و ۲۱ء میں اس قدر شدید نہ تھے جتنے کہ بعد میں ہوئے اور نہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عناد کا وہ سمندر حائل تھا جو بعد میں پیدا ہوا۔ پھر بھی یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ دہلی میں حکیم صاحب کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا اعتماد اس قدر حاصل تھا جتنا کہ کسی دوسرے مسلمان کو کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر اپنے خطبہ صدارت میں اُنہوں نے صرف ایک ہی نقطہ اتحاد پر اپنا سارا زور قلم صرف کیا۔ اُنہوں نے تاریخی اسناد پیش کرکے بتایا کہ مسلمان بادشاہوں نے کس حد تک گائے کی قربانی کے متعلق رواداری اور وسیع الخیالی

کا ثبوت دیا تھا۔ اُس کے مقابلہ میں اُنہوں نے بتایا کہ انگریز دل اور انگریزی فوجوں کے لئے کس قدر گائیں کاٹی جاتی ہیں سو وہ ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا کرتے تھے کہ ہندستان میں عام مسلمان ہرگز گائے کا گوشت اتنا نہیں کھاتے جتنا کہ انگریزی فوجیں کھاتی ہیں اور عوام کی اس تنگ نظری پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے ہموطن مسلمانوں کے خلاف تو گاؤکشی کے مسئلہ کا محاذ بناتے ہیں لیکن کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ حکومت اپنی فوجوں کے لئے جو گاؤکشی کرتی ہے اُس سے احتراز کیا جائے۔ اسی پہلو کو واضح کرکے وہ بتایا کرتے تھے کہ ہندستان کے عوام اتنے سادہ دل ہیں کہ گاؤکشی کے مسئلہ پر انگریزوں ہی کے اشارے سے اتنا بڑا فتنہ کھڑا کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اُن کو اشتعال دلانے والے انگریز خود سب سے زیادہ گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مسلمانوں کی اس ناسمجھی پر متاسف ہوتے تھے کہ جو چیز اُن پر مذہباً فرض نہ تھی اُس کو بلا وجہ فرض قرار دیکر اُنہوں نے اپنے اور اپنے ہموطن بھائیوں کے درمیان اتنی گہری خلیج پیدا کرلی ہے۔

تشدد۔ تحریک کی کمزوری

آخر ۲۱ء میں جب حاکمانہ تشدد کی دست درازیوں نے تقریباً تمام ممتاز لیڈروں کو جیل خانوں میں بند کردیا تو میدان میں صرف مہاتما گاندھی حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری باقی رہ گئے لیکن ملک کے طول و عرض میں تشدد آمیز رجحانات بڑھنے لگے اور غالباً حکومت کا بھی یہی منشا تھا کہ عوام مشتعل ہوں تاکہ اُسے تشدد کرنے کا زیادہ موقعہ ملے۔ ملک

کے حالات سے متاثر ہو کر اُس وقت حکیم صاحب نے ایک بیان شائع کیا جس میں اُنہوں نے کہا کہ۔

گورنمنٹ نے قومی تحریکات کے متعلق جو پالیسی اختیار کی ہے اب وہ کوئی راز نہیں رہی ہے۔ ہمارے وہ لیڈران جو سکون اور امن کے ساتھ ان تحریکات کی رہنمائی کر رہے تھے اور عوام کو قابو میں رکھے ہوئے تھے اُن کو قید کر دیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے اب ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور ہم اس بات کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں اور قومی کارکنوں کو اُن کے اولین اور ضروری فرض سے آگاہ کر دیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ فطرت انسانی عموماً خارجی حالات اور واقعات سے جلد متاثر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت سخت قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک ایسا کامل نظام بنایا جائے جو لوگوں کو زیر اثر رکھ سکے .... اپنے جذبات کو عقل پر قابو پا لینے کا موقعہ نہ دینا چاہئے اور اگر ہم بہیمانہ قوت کو اپنی روحانی طاقت کے ماتحت رکھیں تو ہم یقیناً کامیاب ہونگے۔ حال کے واقعات نے ہمارے انسانی جذبات کو شدید آزمائش میں ڈال دیا ہے........

اُس وقت اُن لیڈروں کی جو جیل خانہ کے باہر رہ گئے تھے یہ پالیسی تھی کہ وہ باہر ہی رہیں تاکہ امن عامہ کے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال سکیں اور عوام کے جذبات کو قابو میں رکھ سکیں۔ چنانچہ ایک دوسرے

بیان میں حکیم صاحب نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ :-

"وہ اپنے پاک مقصد کا لحاظ رکھیں اور کسی قسم کے تشدد اور فساد کا موجب نہ بنیں۔ مسلمانانِ ہند نے مہاتما گاندھی سے یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ اُن کی پرامن اور غیر استشدادی تحریک کی پابندی کریں گے۔ پس ہمیں اس وعدہ پر قایم رہنا چاہیئے .... مسلمانوں کو اپنے ہندو برادران کی طرح استقلال اور ضبط کے ساتھ گورنمنٹ کی جبر و سختی کو برداشت کرنا چاہیئے .... تحریک خلافت نے تمام ہندستان کو بیدار کر دیا ہے۔ سوراج کے معاملہ میں بھی مسلمانوں کو پیش پیش رہنا چاہیئے اور یہ اس طرح کہ وہ کامل سکون و امن کے ساتھ انتہائی اشتعال کے باوجود ترک موالات کے پروگرام پر عمل کرتے رہیں تاکہ جب تحریک خلافت کامیاب ہو جائے اور ہم سوراج حاصل کر لیں تو اُس وقت تاریخ کے زرین صفحات پر مسلمانوں کا نام خاص کر اس پہلو سے روشن رہے کہ اُنہوں نے آزادی مذہب اور ملک کی آزادی کو تباہی سے بچا لیا ہے۔"

حکیم صاحب کے ذہن میں خلافت اور سوراج کا تخیل جدا جدا نہ تھا، وہ ان دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عدم تشددی کا طریقہ ایک ایسا طریقہ ہے جو حکومت کی قوت کا مقابلہ کر سکتا ہے ورنہ عوام کے تشدد کو کچل دینا حکومت کے لئے آسان ہے اور اس طرح حکومت کو قومی تحریکوں کا خاتمہ

کر دینے کا ایک اچھا بہانہ مل جاتا ہے۔

امارت شرعیہ

حکیم صاحب کے مذہبی احساسات قوی تھے، لیکن وہ مذہبی فرقہ کے اعلیٰ اقتدار کو ایک دو دھاری تلوار سمجھتے تھے اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں کوئی ایسا نظام پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے جس میں مذہبی آمریت کا کوئی پہلو پیدا ہوتا ہو۔ وہ جمعیتہ علما کے بعض گوشوں میں خواہش اقتدار کا عکس دیکھ رہے تھے اور اُسے ملکی سیاست کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس وقت جمعیتہ علما نے ایک "تنظیم شرعی" کا تخیل پیش کیا اور اس تنظیم کے تحت ایک "امیر شریعت" کے تقرر کی تجویز سامنے لائی گئی تو حکیم صاحب نے اُس سے اختلاف کیا اور اُن ہی کی رائے کے مطابق مسلم لیگ نے بھی اس تجویز پر اعتراض کیا اور جمعیتہ سے درخواست کی کہ اس تجویز کو فی الحال ملتوی رکھا جائے۔ اُس مذہبی جوش کے زمانہ میں بہت سے مسلمان لیڈر سطحی طور پر اُس تجویز کو بہت خوش نما پاتے تھے اور اُس کی تائید کر رہے تھے لیکن حکیم صاحب کی نظر بہت دور جا رہی تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندستان کا مستقبل صرف جمہوری ہی ہو سکتا ہے اور جمہوری تنظیم میں سیاست کو مذہبی اقتدار کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ اُس زمانہ میں جب علی برادران کی ضرورت سے زیادہ عقیدتمندی اور بعض لیڈروں کی مصلحت پروری نے علما کی جماعت کے لوگوں کو بلا لحاظ اہلیت بہت آگے بڑھا دیا تھا حکیم صاحب نے جذبات اور عقل کے درمیان اپنا توازن قایم رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مسلم لیگ کی مخالفت کی وجہ سے مجوزہ تنظیم کے خیال سے

دست برداری نہ کی گئی ہوتی تو حکیم صاحب تو یہاں تک تیار تھے کہ بعض صاحب فہم علما کو ساتھ لیکر اس تجویز کا مقابلہ کریں۔

آزاد تعلیم

شروع دسمبر میں جامعہ ملیہ کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اُس موقعہ پر حکیم صاحب نے قوم کی آزاد تعلیم کے متعلق اپنے خطبہ صدارت میں بہت بصیرت افروز خیالات ظاہر کئے۔ اس خطبہ صدارت کے آخری الفاظ جس سچے درد اور وجدان قلب سے مملو تھے اُس کو خواہ ہندستان کے مسلمان بھول جائیں لیکن وہ لوگ کبھی نہیں بھول سکتے جو آج اجمل خاں کی اس عزیز ترین وراثت کے محافظ اور امین ہیں۔ فارغ التحصیل طلبا کو مخاطب کرکے اُنھوں نے فرمایا تھا کہ

"وہ سمجھ لیں کہ وہ دنیا میں ایک خادم اور داعی کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں اور کسی گروہ یا فرقہ کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ نوع انسان کی خدمت کے لئے کیونکہ وہ اُس تعلیم کے حامل ہیں جو دنیا سے نسل و نسب کے امتیازات مٹانے اور انسان کے "سر دامن" کو "گرد وطن" سے پاک کرنے کے لئے آئی تھی۔ وہ اپنے کو حقیر اور بے یار و مددگار نہ سمجھیں کیونکہ ...... وہ اُس پیغام کے ایلچی ہیں جو دنیا کے دکھیوں کا حقیقی درماں ہے۔

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہم سب کی آنکھیں تم پر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں مایوس نہ کرنا۔"

آزاد تعلیم کا یہ نقش جو جامعہ کے ابتدائی زمانہ میں حکیم صاحب نے اُس کے طلبا اور اساتذہ کی زندگی کے ہر گوشہ پر قایم کیا ہر روز زیادہ روشن ہوتا گیا اور یہ حکیم صاحب ہی کی دعاؤں کا اثر ہے کہ آج جامعہ ملیہ ملک کی آزاد تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ ہے جس نے ملک کے لئے بہت سے سرفروش اور ایثار پسند کارکن پیدا کئے۔

کانگریس کی صدارت

جامعہ کے جلسۂ تقسیم اسناد سے فارغ ہو کر اُنہوں نے احمد آباد جانے کی تیاریاں شروع کیں جہاں خلافت کانفرنس میں انہیں صدارت کے فرائض انجام دینے تھے۔ کانگریس کے صدر اُس سال سی۔ آر۔ داس منتخب ہوئے تھے لیکن اُن کو حکومت نے کانگریس کے اجلاس سے پہلے ہی اسیر فرنگ بنا لیا تھا اس لئے جب کانگریس کی صدارت کا سوال پیدا ہوا تو مہاتما گاندھی اور ارباب کار کی نظر حکیم صاحب پر پڑی اور کانگریس کی صدارت بھی اُن ہی کی سپرد کی گئی۔ ملک و قوم کی یہ سب سے بڑی عزت اُن کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی جب ہر قومی کارکن کا امروز اُس کے فردا سے بےخبر تھا اور حکیم صاحب بھی ہر گھنٹہ اور ہر لمحہ سرکار کی دعوت کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ احمد آباد جا رہے تھے تو اُن کو یقین نہ تھا کہ وہ وہاں تک پہنچ سکیں گے۔ اسی لئے وہ پہلے سے طے کر چکے تھے کہ اگر وہ گرفتار ہو جائیں تو اُن کی جگہ کون لیگا۔ کئی مہینے پہلے سے اُنہوں نے زمین پر سونے کی عادت ڈال لی تھی تاکہ جیل میں پتھر کا فرش اُن کے لئے نئی چیز نہ ہو۔

کانگریس کے خطبہ صدارت میں اُنہوں نے اپنے اس خیال

کو بار بار دہرایا کہ جیل کے زائرین کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے اور یہ کہ قومی تحریک کی کامیابی کے لئے جیل خانوں میں جانا فال نیک ہے انہوں نے اس موقعہ پر ملک کی "اعتدال پسند" جماعت کو بھی دعوت دی کہ وہ قومی خدمت کے میدان میں نکل آئے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اُن کا "پیام" یہ تھا کہ

"ہمارا ملک اس وقت درد وکرب کی حالت میں پیچ وتاب کھا رہا ہے مگر یہ پیشین گوئی کرنے کے لئے کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں کہ یہ اُس نوجوان ہند کی پیدائش کے وقت کا درد ہے — جو ہمارے قدیم ملک کی شاندار روایات کو اُجاگر کر دیگا اور اقوام عالم میں اپنا بلند مقام حاصل کرے گا۔"

حکیم صاحب کی قسمت میں نہ تھا کہ اُن کی زندگی میں اس پیشین گوئی کی ناقابل انکار صداقت ثابت ہوتی۔

حکیم صاحب کی صدارت میں کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی کی تجویز منظور کی اور علاقہ بردولی میں عدم ادائگی ٹیکس کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ لیڈر روز بروز میدان سے ہٹ کر جیل خانوں میں جارہے تھے اور تقریباً ۳۵ ہزار کارکن بند ہو چکے تھے اس لئے ہنگامی اور مفاجاتی امکانات کا لحاظ کر کے کانگریس نے اپنے پورے اختیارات تنہا مہاتما گاندھی کی سپرد کر دئے۔ کانگریس کے اس اجلاس کا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ پہلی دفعہ مولانا حسرت موہانی نے ہندستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کانگریس اور خلافت کانفرنس کے سامنے

پیش کیا اور یہ کوشش کی کہ کانگریس کے مقاصد میں سوراج کے بجائے مکمل آزادی کا مطالبہ داخل کر لیا جائے۔ لیکن کانگریس کی کثرت رائے اُن کے خلاف تھی۔ گو کہ اُس وقت یہ تجویز منظور نہ ہو سکی لیکن اس میں شک نہیں کہ حسرت موہانی کی یہ آواز لوگوں کے دلوں تک پہنچی اور بہت جلد ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے اس مطمحِ نظر کو اپنا جھنڈا بنا لیا۔

اسی اجلاس میں ایک ہنگامہ یہ پیش آیا کہ جماعت علما کے بعض لیڈروں نے عدم تشدد کی شرط پر مہاتما گاندھی سے اختلاف کیا اور اعتراض یہ کیا کہ عدم تشدد کے حلف کی اس شرط کو تو وہ پورا کر سکتے ہیں کہ تشدد سے پرہیز کرنے کا وعدہ کر لیں لیکن "خیال اور ارادہ" میں غیر تشدد پسند ہونے کا وعدہ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے تھے کہ "خیال" میں تشدد سے پرہیز کرنا اُن کے بس کی بات نہیں ہے پس وہ ایسا حلف کیسے اٹھا لیں۔ یہ بہت "باریک" اعتراض ایک معمہ بن گیا اور مہاتما جی اور حکیم صاحب کے لئے اچھا خاصا دردِ سر ہو گیا۔ بڑی دشواری اور بہت طویل گفت و شنید کے بعد کسی طرح علما کو رضا مند کیا گیا۔ کچھ تو حکیم صاحب کے مشوروں نے اور کچھ مہاتما جی کی صلح جوئی نے بالآخر اختلاف کے اس سیلاب کا زور کم کیا۔ خود جماعت علما کے ایک محترم فرد نے اس موقعہ پر ایک معنی خیز بات کہی جو اچھا خاصا لطیفہ بن گئی۔ اُنھوں نے اس ہنگامہ کو دیکھ کر ایک سوال کے جواب میں کہا۔ "ارے بھائی! کیا پوچھتے ہو، علی برادران نے یہ ہاتھی پالے تھے۔ وہ دونوں تو جیل خانہ میں جا بیٹھے اور ہاتھی اب مست ہو کر فیل خانہ سے نکل پڑے

ہیں اب انہیں روکے کون، جدھر جاتے ہیں ایک ٹکر مار دیتے ہیں! چند سال بعد ہی مگر خود علی برادران کو لکھنؤ میں کھانی پڑی اور وہ بھی ایسی کہ پیر کے احترام کے ساتھ مریدوں کی ہیبت کو بھی صدمہ پہنچا! یہ تفصیل آگے بیان ہو گی۔

خلافت کانفرنس خلافت کانفرنس کے خطبہ صدارت میں حکیم صاحب نے مسلمانوں کو آنے والے امتحانوں کے لئے تیار کیا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ

"اس سے بھی زیادہ سخت وقت ہمارے سامنے آنے والا ہے۔ جس قدر بھی سختی ہو ہمیں اسی قدر زیادہ استقلال کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس جنگ کا نتیجہ یقیناً ملک کی فتح ہے۔ گرفتاریوں نے حکومت کو عاجز کر دیا ہے جیلوں میں جگہ باقی نہیں۔ مگر ہمارا فرض ہے کہ ہمارے قدم جیل کی طرف تیزی سے بڑھیں اور گورنمنٹ کو آئندہ کے لئے سبق مل جائے کہ اب ہندستان اس کے ناجائز احکام نہ مانے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گورنمنٹ آخر وقت تک سختی کرتی رہے گی۔ لیکن ہمیں استقلال اور پامردی دکھانا چاہیے ...... جو لوگ علی برادران اور دوسرے بزرگوں کی طرح خدمت کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اُن کا یہ عمل ہمارے اور ہمارے کاموں کے لئے فال نیک ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ سی۔ آر۔ داس ابوالکلام صاحب آزاد اور لالہ لاجپت رائے جی جیل بھیجدئے گئے۔ اس سے زیادہ

خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ جیل جا کر بہتر طریقہ سے
ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی فرماتے
تھے کہ موتی لال نہرو کو سب سے آخر میں جیل جانا چاہیئے
لیکن اس جرم میں کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے انہیں
بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے بیٹے جواہر لال نہرو بھی گرفتار
ہو گئے۔ اُن کی گرفتاری کا بھی وہی اثر ہوا جس کی توقع کی
جاتی تھی اور جو شخص اس وقت آپ کے سامنے گفتگو کر رہا
ہے وہ بھی عنقریب اسی راستہ پر چلنے والا ہے۔

ترکوں کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی وہ ۵۰ لاکھ روپیہ انگورہ فنڈ کے لئے جلد سے جلد مہیا کر دیں۔ مالابار کے موپلوں کے مصائب کا بھی انہوں نے ذکر کیا اور فرمایا کہ

"میں گورنمنٹ کے وہ مظالم بتاؤں جو مالابار میں ہمارے
بھائیوں پر ہو رہے ہیں..... تو معلوم ہوگا کہ پنجاب کے
مظالم سے بھی زیادہ یہ مظالم ہیں۔ ہندو، مسلمان اور سکھ ہر
قوم اس واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہر ہندستانی
کو اُن سے ہمدردی کرنا چاہیئے۔ جن موپلہ بھائیوں نے ہندوؤں
کو زبردستی مسلمان بنایا اُن سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں
اور ہم اُن پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ موپلاؤں کے یتیم بچوں کی پرورش کے لئے حکیم صاحب خود اپنی جیب سے زندگی بھر مالی امداد دیتے رہے اور وہ ان بچوں کی تکلیفوں سے اس درجہ متاثر تھے کہ ہمیشہ

مالابار کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔

خلافت کانفرنس میں حسرت موہانی کی تجویز آزادی پر بہت سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ سبجکٹس کمیٹی میں یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی لیکن حکیم صاحب نہیں چاہتے تھے کہ جو تجویز کانگریس نے نہیں منظور کی وہ خلافت کانفرنس میں منظور کرلی جائے۔ ایسا کرنے سے وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس اور خلافت کی صفوں میں اختلاف پیدا ہو جائیگا چنانچہ خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں جب یہ تجویز آئی تو انہوں نے صدارت کے اختیارات استعمال کرکے اس کے پیش ہونے کی اجازت نہیں دی اُن کے اس طرزعمل پر ملک کے بہت سے گوشوں میں اور خصوصاً مسلمانوں کے انتہا پسند حلقوں میں بہت اعتراضات کئے گئے۔ چنانچہ جب وہ احمدآباد سے واپس آئے تو انہوں نے اسلامی اخبارات کو اپنے خلاف اعتراضات سے بھرا ہوا پایا۔ ہر طرف یہ سوال کیا جارہا تھا کہ کیا اجمل خاں اعتدال پسندوں میں شامل ہو گئے؟ کیا اُن کی انتہا پسندی اعتدال سے بدل گئی؟ خلافت کانفرنس میں اس تجویز کی ناکامی کے ذمہ دار وہی قرار دئے گئے اور عرصہ تک اخباروں میں یہ بحث جاری رہی۔

سمجھوتہ کی ایک اور ناکام کوشش

جنوری ۱۹۲۲ء میں تمام ہندستان میں کریمنل لا ایمنڈمنٹ ایکٹ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ دہلی میں پرنس آف ویلز کی آمد کے خلاف بھی ہڑتال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حکیم صاحب سوامی شردھانند اور ڈاکٹر انصاری کانگریس والنٹیرس کی بھرتی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ۲۵ ہزار والنٹیر عدم تشدد کا حلف لیکر

بھرتی ہو چکے تھے اور اپنے کو گرفتار کرانے کے لئے پچاس پچاس اور سو سو کی ٹولیوں میں جا رہے تھے۔ ساتھ ہی اعتدال پسندوں کی طرف سے سمجھوتہ کی کوشش بھی جاری تھی۔ اس کوشش میں پیش پیش پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر جناح تھے۔ آخر جنوری ۲۲ء میں ایک صلح کانفرنس سر سنکرن نائر کی صدارت میں بمقام بمبئی منعقد ہوئی۔ لیکن مہاتما گاندھی نے جو شرائط صلح پیش کیں اُن کو سر سنکرن نائر نے اس قدر ناپسند کیا کہ وہ خفا ہو کر کانفرنس سے اُٹھ گئے اور اُس طرح یہ کوشش بھی ختم ہو گئی۔ اس زمانہ میں اعتدال پسندوں کی طرف سے صلح کی جو کوششیں ہوا کرتی تھیں اُن میں یہ پہلو بھی ملحوظ ہوا کرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تنہا انتہا پسندوں کی جد و جہد کامیاب ہو جائے اور اعتدال پسندوں کی قیادت بالکل ہی ختم ہو جائے۔ بہرحال سر سنکرن نائر کی کوشش کے ختم ہونے کے بعد حکیم صاحب دہلی میں انگورہ فنڈ کی فراہمی کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مصطفیٰ کمال یونانیوں کو شکست دیکر ترکی میں ایک آزاد جمہوریہ کی بنیاد قایم کر چکے تھے اور ہندستان کے مسلمانوں کی تمامتر ہمدردیاں اُن کی طرف منتقل ہو گئی تھیں۔ حکیم صاحب کے ذاتی اثرات اور دوسرے لیڈروں کی جد و جہد نے انگورہ فنڈ کی تحریک کو بہت کامیاب کیا۔ اُس زمانہ میں جب کانگریس کی تحریک کو ایک سخت دھکا لگنے والا تھا حکیم صاحب کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف تو کانگریس کی تحریک ترک موالات، اُس کے ساتھ ہی خلافت کی تحریک اور پھر تحفظ اماکن مقدسہ کا مسئلہ، اور پھر جامعہ ملیہ انگورہ فنڈ، موپلاؤں کی امداد، طبیہ کالج، پھر مطب کی مصروفیت،

غرض یہ کہ ہر کام اپنی جگہ پر جاری تھا اور کوئی کام بھی اُن کی توجہ سے محروم نہ تھا۔ حکیم صاحب کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ متعدد کام بہ یک وقت کرتے تھے اور ہر ایک پر پوری توجہ صرف کر سکتے تھے۔

چورا چوری

فروری کا مہینہ تھا جب کانگریس کی تحریک دفعتاً روکی گئی اور یہ واقعہ حکیم صاحب کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ اُس زمانہ کا مختصر پس منظر ڈاکٹر انصاری کی یادداشت ہے جس میں مرحوم نے لکھا تھا کہ

ابتدائے فروری ۲۲ء میں مہاتما گاندھی باردولی میں عدم ادائگی ٹیکس کی تحریک شروع کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور اس مہم کے آغاز کی تاریخ مقرر ہونے ہی والی تھی۔ مسٹر جناح صلح کی آخری کوشش میں ناکام ہو کر باردولی سے واپس جا چکے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ ابھی وہاں مہاتما جی کے پاس مقیم تھے۔ مہاتما جی اپنی عادت کے مطابق ویسرائے کو اعلانِ جنگ کا خط چند روز قبل روانہ کر چکے تھے کہ یک بیک چورا چوری ضلع گورکھپور میں پبلک اور پولس کے درمیان تصادم ہوا اور پبلک کی جانب سے تشدد کی خبر مہاتما گاندھی کو ملی۔ اس کے علاوہ فیروز پور جھرکہ کے قریب میواتیوں میں تشدد کے واقعات کی اور بریلی اور دوسرے مقامات سے بھی اسی قسم کی خبریں پہنچیں۔ مہاتما جی پر ان واقعات کا بہت

گہرا اثر ہوا۔ دوسری طرف پنڈت مدن موہن مالویہ
بھی اپنا اثر اُن پر ڈال رہے تھے اور باوجودیکہ مسٹر
معظم علی اور شعیب قریشی جو بارڈولی میں مہاتماجی کے
پاس موجود تھے اس اثر کو زائل کرنے کی مسلسل کوشش
کرتے رہے اور اُنہوں نے مہاتماجی کو مشورہ دیا کہ
حکیم صاحب سے جو صدر کانگریس تھے اور مجھ سے بحیثیت
جنرل سکرٹری کانگریس بذریعہ تار مشورہ کر لیا جائے لیکن
مہاتماجی نے عدم ادائگی ٹیکس اور سول نافرمانی کی
تحریک کو یک قلم بند کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۸ر فروری ۲۲ء
کو مہاتماجی کا تار دلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے پاس
اُن کی رائے طلب کرنے کے لئے آیا جس کے جواب میں
تار بھیجا گیا کہ بارڈولی کی تحریک عدم ادائگی ٹیکس کے
متعلق کانگریس نے آپ کو پورا اختیار دیا ہے اور وہاں
کے حالات آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اگر آپ اُس
کو بند کرنا ضروری سمجھیں تو اُس کے آپ مطلقاً مجاز ہیں
لیکن ملک کو سول نافرمانی اور پکٹنگ بند کرنے سے
سخت صدمہ پہنچے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تار حکومت
نے اُن تک نہیں پہنچنے دیا اس لئے کہ ۱۰ر فروری کو
ایک تار وصول ہوا جس کے ذریعہ سے عدم ادائگی
ٹیکس سول نافرمانی اور پکٹنگ کے مطلقاً بند کرنے اور
تعمیری پروگرام بارڈولی کے رزولیوشن ورکنگ کمیٹی

میں پاس ہونے کی خبر پہنچی۔ اس کا اثر عام تحریک پر اور خصوصاً دہلی میں پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ پر فوری اور مہلک ہوا۔

آخر فروری ۲۲ء میں جب مہاتما گاندھی کے پاس ہر سمت سے باردولی رزولیوشن کے خلاف احتجاج کی خبریں پہنچیں تو اُن کو اس بات کا صحیح احساس ہوا کہ اس رزولیوشن کا اثر تحریک پر بہت خراب ہوا ہے۔ تب مہاتما جی نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ دلی میں مقرر کی اور ایک رزولیوشن پاس کیا گیا جس میں انفرادی سول نافرمانی کی اجازت دی گئی۔ اور اس طرح سابق غلطی کی تلافی کی کوشش کی گئی۔ لیکن تحریک روز بروز کمزور ہوتی گئی یہاں تک کہ وسط مارچ ۲۲ء میں وہ بالکل بیٹھ گئی۔

حکیم صاحب کو اس زمانہ میں مہاتما جی سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ اُنہوں نے ایک ایسے عظیم الشان اور اہم مسئلہ میں کافی مشورہ کرنے سے پہلے ایک ایسا فیصلہ کیا جس کے اثرات تحریک کے لئے مہلک ثابت ہوئے۔ لیکن مجلس عاملہ کے فیصلہ کو حکیم صاحب نے ناچار قبول کیا اور بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لئے فوراً ملک کے نام اپنا ایک پیام بحیثیت صدر کانگریس شائع کرایا جس میں اُنہوں نے دبے الفاظ میں التوائے تحریک کے مضر اثرات کی طرف اشارہ کیا اور مایوسی کی چڑھتی ہوئی تاریکی کو رفع کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ اُنہوں نے اپنے پیام میں لکھا کہ

میں افسوس کر رہا ہوں کہ ہندستان کے بہت سے حصوں میں مجلس عاملہ کی تجاویز التوائے قانون شکنی وغیرہ سے جو بعض افسوسناک واقعات پر مبنی تھیں غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اور جذبات مایوسی روز افزوں ہیں ...... جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں مجلس عاملہ کا یہ فیصلہ خونریزی کو دور کرنے اور نظام کانگریس کی کمزوریوں کو رفع کرنے کی غرض سے صادر ہوا ہے .... آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس دہلی میں ۲۴ ماہ حال کو کیا جا رہا ہے تاکہ پبلک کے نمایندے مجلس عاملہ کی تجاویز پر بحث کر سکیں اور اپنی تجاویز پیش کر سکیں ....

چنانچہ ۲۴ فروری کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ شریف منزل میں منعقد ہوا اور یہ ایک یادگار جلسہ تھا جس میں تمام وہ ممتاز لیڈر شریک تھے جو اُس وقت جیل خانہ کے باہر تھے۔ التوائے تحریک کی جلسہ میں سخت مخالفت کی گئی لیکن مہاتما جی کی شخصیت اور اُن کے دلائل نے سب کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور تحریک التوا کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی منظور کر لیا۔ اس طرح ہندستان میں قومی تحریک کا پہلا دور عین اُس وقت ختم ہوا جب کہ منزل مقصود بہت قریب معلوم ہوتی تھی۔ تحریک کے نوجوان کارکنوں کا احساس عام طور پر یہ تھا کہ

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

شریف منزل میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کا منظر بہت حسرتناک

تھا۔ بہت سے نوجوان کارکن جن کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے زار و قطار رو رہے تھے اور اہل دہلی تو بہت ہی ناخوش تھے اس لئے کہ اُنہوں نے پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی شاندار تیاریاں کی تھیں۔ سینکڑوں شرکا اور تماشائی جلسہ کے بعد شریف منزل سے نہایت افسردہ اور آزردہ خاطر باہر آئے۔

اب پستی اور آپس کی پھوٹ اور حکومت کی فرقہ پرور پالیسی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ملک بھر فرقہ داری جھگڑوں کی آگ میں کود گیا۔ اس مایوسی کے بعد حکیم صاحب کی زندگی کے بقیہ ۵ سال روز بروز اُن کے لئے تلخ تر ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی یادداشت میں بعد کے افسوسناک واقعات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ :۔

"حکومت نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر مہاتما جی کو زیر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند ۱۸ مارچ کو ۶ سال کے لئے قید کرکے یرودہ جیل میں بھیج دیا۔ مہاتما جی نے اپنی قید سے پہلے اپنی گرفتاری اور سزا کے خلاف شورش نہ کرنے کی اس قدر تاکید کی تھی کہ اُن کی اسیری کے بعد ملک میں ایک سناٹا اور خاموشی کا عالم پیدا ہوگیا۔ اس حالت میں ایک طرف تو تحریک میں جو کچھ جان باقی تھی وہ بھی نکل گئی اور دوسری طرف تحریک کے مخالفین کے اوپر جو اثر ہوا وہ مہاتما جی کی توقع کے بالکل خلاف تھا لائیڈ جارج گورنر بمبئی نے اپنی تقریر میں بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ "مہاتما جی کی گرفتاری کے بعد ایک کتا بھی نہ

بھونکا" اور یہ امر واقعہ ہے کہ اُن کی گرفتاری کے بعد ملک پر موت کی سی خاموشی چھا گئی اور باوجود اُن لیڈروں کی کوشش کے جو جیل کے باہر رہ گئے تھے کانگریس پروگرام کے ساتھ اور خصوصاً سول نافرمانی کی تحریک کے ساتھ عوام کو کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ کانگریسی حلقوں میں اب کانگریس کے آئندہ پروگرام کے متعلق بحث اور مباحثہ شروع ہو گیا۔

شروع مارچ میں طبیہ کانفرنس کا سالانہ جلسہ حیدرآباد دکن میں ہونے والا تھا لیکن حکیم صاحب کچھ اس درجہ افسردہ اور قومی حالات سے مایوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے حیدرآباد کے سفر کا ارادہ بھی فسخ کر دیا اور چند روز کے لئے رام پور چلے گئے۔ مہاتما جی کی گرفتاری کے متعلق بھی انہوں نے بحیثیت صدر کانگریس اپنا جو پیام شائع کرایا اس میں عوام کو ضبط و تحمل اور صبر و سکون کی تلقین کرتے ہوئے ..... صرف تعمیری پروگرام پر زور دیا۔

مہاتما گاندھی نے کانگریس کے مختار کل کی حیثیت سے گرفتاری کے بعد اپنے تمام اقتدارات حکیم صاحب کی طرف منتقل کر دئے اور بلاشک یہ ایک بہت بڑا قومی اعزاز تھا جو حکیم صاحب کو ایک بہت ہی نازک زمانہ میں حاصل ہوا۔ سابرمتی جیل سے مہاتما جی نے انہیں جو خط لکھا اس میں شاندار الفاظ کے ساتھ اُن پر اپنے پورے اعتماد کا اظہار کیا اور انہوں نے بھی اس خط کے جواب میں لکھا کہ

"میں آپ کی دعاؤں اور خواہشوں میں شریک ہوں

اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ باوجودیکہ میری خراب
صحت مجھے اپنے ملک کی بہت زیادہ خدمت کرنے کا
موقعہ نہ دیگی تاہم میری انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ جب
تک مسٹر سی۔ آر۔ داس جیل سے واپس آئیں میں اپنے
فرائض کو تمام وکمال انجام دیتا رہوں۔

اُس مقدس کام میں جو آپ نے اور ملک نے حق و
انصاف کا نام لیکر شروع کیا ہے خدا ہم سب کی مدد کرے۔"

انتہائی مایوسی کے بعد بھی کانگریس سے حکیم صاحب کی وفاداریاں بدستور قایم تھیں، لیکن اُن کے الفاظ میں کوئی جذبہ نہ تھا اور انہیں معلوم تھا کہ اس مایوسی نے اُن کی کمزور صحت پر بہت بڑی ضرب لگائی ہے۔

کانگریس میں انتشار

وسط جون میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ بمقام لکھنؤ منعقد ہوا۔ اور پنڈت موتی لال نہرو اور وٹھل بھائی پٹیل کی تحریک پر یہ تجویز منظور ہوئی کہ سول نافرمانی کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی تمام ملک کا دورہ کرے اور معلوم کرے کہ ہندستان اب سول نافرمانی یا کسی اور پروگرام کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ اس کمیٹی کے صدر حکیم صاحب اور سکریٹری ڈاکٹر انصاری مقرر ہوئے۔ خلافت کمیٹی نے بھی ایک اسی قسم کی کمیٹی مقرر کی اور ان دونوں کمیٹیوں نے جولائی اگست اور ستمبر میں تمام ہندستان کا دورہ کیا اور اکتوبر میں اپنی رپورٹ شائع کی جس سے یہ ظاہر ہوا کہ کمیٹی کے تین ممبر کونسل کے داخلے کے موافق اور تین ممبر تعمیری پروگرام اور سول نافرمانی کی تیاری کے حق میں تھے۔ اس اختلاف نے کانگریس کی

صفوں میں مزید انتشار پیدا کیا اور کانگریس دو جماعتوں میں منقسم ہو گی۔ ایک "نو چینجر" کہلائی اور دوسری سوا راجی۔ کمیٹی نے ملک بھر سے شہادتیں حاصل کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ

"ملک سول نافرمانی کے لئے تیار نہیں ہے۔ لیکن اگر کہیں ایسی صورت ہو کہ سول نافرمانی ضروری سمجھی جائے تو صوبہ کی کانگریس کمیٹی کو اُس کے جاری کرنے کا اختیار دیا جائے" مگر ملک میں عام طور پر سول نافرمانی کی تحریک جاری نہیں کی جاسکتی۔

یہ فیصلہ متفقہ تھا لیکن اس سوال پر کہ کانگریس کو کونسلوں میں جاکر جدو جہد کرنی چاہیئے یا نہیں سخت اختلاف رائے ظاہر ہوا۔ حکیم صاحب پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل نے سفارش کی کہ تارکین موالات کو کونسل کے انتخابات میں کھڑا ہونا چاہیئے اور کونسل میں جاکر حکومت کی کارروائیوں میں حارج ہونا چاہیئے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری، مسٹر راجگوپال اچاری اور مسٹر کستوری رنگا ایر نے یہ رائے دی کہ کانگریس کونسلوں کے بائیکاٹ کا جو فیصلہ کر چکی ہے اُس پر اُسے قایم رہنا چاہیئے۔ یہ اختلاف رائے اس قدر شدید ہو گیا کہ کانگریس کمیٹی ۶ روز کے بحث و مباحثہ کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور باالآخر یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ گیا کے اجلاس کانگریس میں کیا جائے۔

خلافت کمیٹی کا فیصلہ متفقہ تھا اور وہ یہ تھا کہ کونسلوں میں شرکت نہ کی جائے۔ تاہم مرکزی خلافت کمیٹی نے بھی اپنے فیصلہ کو خلافت

کانفرنس کے فیصلہ پر منحصر رکھا۔ جمعیۃ علما نے اعلان کر دیا کہ داخلہ کونسل کے خلاف اُس کے شرعی فتوے کی نوعیت نہیں بدلی جا سکتی اور اُسی فتوے پر ملک کو عمل کرنا چاہیے۔ جمعیۃ کے لئے سوال فتوے کے اقتدار کا تھا۔ لیکن دو تین سال بعد وہی فتوے جو بدلا نہ جا سکتا تھا بدل دیا گیا۔ ۲۲ء میں فتوے کے نفاذ پر جو اصرار تھا اُس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ علما کی قوت و استقامت کا مظاہرہ ایسی حالت میں ضروری ہے جبکہ کانگریس اور خلافت کے داعی علما کے فتوے کے اتباع اور اُن کی فرماں برداری میں "کمزوری" دکھا رہے تھے!

اب یہ صورت پیدا ہوئی کہ ایک طرف تو "نوچینجروں" نے مہاتما گاندھی کا نام لیکر (جو اُس وقت جیل میں تھے) اور ایک طرف علمائے شریعت کا نام لیکر کانگریس کو مجبور کر دیا کہ وہ داخلہ کونسل کے رزولیوشن کو کثرت رائے سے نامنظور کر دے۔ اس طرح کانگریس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور سوراج پارٹی نے کانگریس سے بے تعلق ہو کر کونسلوں میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

فرقہ واری فتنہ کی زد میں نوچینجروں اور سواراجیوں کے علاوہ اب ایک زیادہ خطرناک اختلافی جماعت ہندو مہاسبھا کی گود میں پرورش پا کر میدان میں آ گئی اور اُس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے فرقہ واری تعصبات کے فتنہ نے سر اُٹھایا۔ اس فتنہ نے نوچینجروں اور سواراجیوں کی جد و جہد پر پانی پھیر دیا۔ حکیم صاحب بھی جو بلاشبہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی اور حامی تھے ان ہندو جُہلا کی بدگمانیوں کا ہدف بنائے گئے۔

دہلی میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں لکھا گیا کہ "ہندو بچوں کو مسلمان بنانے والی جماعت کے سرپر حکیم اجمل خاں کا ہاتھ ہے"۔ پھر ایک دوسرے اشتہار میں یہ بہتان باندھا گیا کہ "شہید ہال" کی تعمیر کے لئے جو روپیہ جمع کیا گیا تھا اُس کا ایک بڑا حصہ حکیم صاحب نے ترکوں کی امداد کے لئے انگورہ بھیج دیا ہے۔ اس الزام کی تردید خود سوامی شردھانند نے کی اور بتایا کہ وہ سرمایہ خود ان ہی کے پاس محفوظ ہے۔

زیادہ تر یہ بدگوئی "ہندو سماج" کے نام سے ہو رہی تھی جو غالباً ایک فرضی نام تھا۔ لیکن یہ وہ دھواں تھا جو آگ کے بھڑکنے سے پہلے نکلا کرتا ہے۔ اس دھوئیں کے پیچھے خود حکومت کی فتنہ انگیز حکمت عملی اپنا کام کر رہی تھی۔ اگر اُس زمانہ میں پنجاب کے سکھوں کی جنگ حکومت سے نہ چھڑ گئی ہوتی تو شاید یہ آگ اُسی وقت بھڑک اُٹھتی۔ لیکن حکومت کو سکھوں نے مصروف کر رکھا تھا اور ملک کے عوام بھی سکھوں کی اُس شاندار ستیہ گرہ کو دیکھنے میں اتنے مصروف تھے کہ فرقہ واری فتنہ کی آگ چند روز تک دبی رہی۔ اکالیوں کی تحریک اگست میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچی اور گرو کے باغ کی بے مثال قربانیوں نے گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سر پر کامیابی کا تاج رکھدیا۔ حکیم صاحب اس تحریک سے بہت دلچسپی لے رہے تھے اور جب گرو کے باغ میں اکالیوں کا مورچہ قائم ہوا تو وہ خود ستمبر میں وہاں تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر اُنہوں نے اپنا ایک بیان شائع کر دیا جس میں اُنہوں نے اکالیوں کی جانبازیوں کی داد دیتے ہوئے تمام ملک کو امرتسر کے ان واقعات پر متوجہ کیا۔

ملتان لیکن جب گرو کے باغ میں سکھوں کی قربانیوں کا یہ ایک نیا باب تاریخ ہند کے لئے لکھا جا رہا تھا تو ملتان میں ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک فتنہ بیدار کیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی یادداشت میں ملتان کے حالات کی طرف مختصر اشارے کئے ہیں :-

ملتان میں مثل ہندستان کے اور شہروں کے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کشیدہ تھے۔ اُس کے اسباب کچھ مقامی افسران کی پالیسی کچھ ذاتی اختلافات اور کچھ ملک کے عام ہندو مسلمانوں کے اختلافات تھے جن کو مقامی فرقہ پرست لیڈروں نے مذہبی رنگ دیدیا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے اختلاف کی آگ ایک چنگاری سے شروع ہوئی اور کچھ دنوں تک آہستہ آہستہ سلگتی رہی یہاں تک کہ ایک خاص موقع پر تیز ہوا نے اُس کو ایک شعلہ کی طرح بھڑکا دیا۔ جو واقعہ ہندو مسلم فساد کا باعث ہوا وہ ایک بہت معمولی واقعہ تھا جو تقریباً ہر سال ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلوسوں کے موقعہ پر اکثر شہروں میں پیش آتا رہتا ہے لیکن چونکہ اُس کے لئے مناسب فضا نہیں ہوتی اس لئے دب جایا کرتا ہے۔ ملتان میں تعزیہ کے جلوس پر پتھر پھینکے گئے اور یہ واقعہ اشتعال کا کافی سبب بن گیا۔ ہندوؤں کی دوکانیں لوٹی گئیں اور جلا دی گئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے

کہ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ لیکن تحقیقات سے نہ صرف یہ غلط ثابت ہوا بلکہ اس کے برعکس متعدد شہادتیں ایسی ملیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے اس موقعہ پر بہت سی ہندو عورتوں کو بچایا اور پناہ دی۔ البتہ چند ہندو عورتوں کے زیورات بدمعاشوں نے جھگڑے کے وقت لوٹ لیئے۔ مسلمانوں کی طرف سے کلام شریف کی بے حرمتی اور مسجدوں پر حملے کی کافی شہادتیں مہیا نہ ہوسکیں۔ یہ واقعات گو اپنی جگہ پر نہایت افسوسناک تھے لیکن اگر اخباروں اور دوسرے ذرایع سے پروپیگنڈا نہ کیا جاتا تو یہ فسادات محدود ہوکر رہ جاتے اور تھوڑے دنوں کے بعد اس کا اثر زائل ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس شرچشمہ سے پنجاب کے مختلف شہر پر اثر لیئے گئے یہاں تک کہ یہ سمیّت رفتہ رفتہ تمام ملک میں پھیل گئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب صدر کانگریس اور پنڈت مدن موہن مالویہ وسط ستمبر ۲۲ء میں ملتان کے حالات کی تحقیقات اور صلح کرانے کی غرض سے ملتان گئے۔ پنڈت مالویہ نے اس عرصہ میں لاہور واپس ہو کر ایک بہت گرم تقریر کی اور ہندوؤں پر مظالم اور اُن کی بے بسی کے حالات بیان کر کے تحریک سنگھٹن کی بنیاد ڈالی۔ اور ہندوؤں کو اپنے تحفظ کے لئے ورزش جسمانی کرنے اور مضبوط ہو جانے کی تلقین کی۔ آخر ستمبر میں جب دوبارہ حکیم اجمل خاں صاحب معہ پنڈت مالویہ

مسٹر پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی
ملتان گئے تو وہاں انہوں نے فضا بالکل بدلی ہوئی پائی
ہندو بیحد مشتعل تھے اور مسلمانوں سے بطور تاوان ایک
بڑی رقم طلب کر رہے تھے اور مسلمانوں کے سربرآوردہ
اشخاص جن میں مخدوموں کے خاندان کے لوگ بھی تھے
افسران حکومت کے بالکل زیر اثر تھے اور صلح کے لئے
آمادہ نہ تھے۔ باوجود حکیم صاحب کی کوشش کے کوئی نتیجہ
نہ نکلا۔ مقامی مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر اور ہندوؤں کے
لئے خلافت کمیٹی کی جانب سے ریلیف فنڈ میں ایک معقول
رقم مسلمانوں کی ہمدردی کے اظہار کے طور پر دیکر حکیم صاحب
معہ دیگر اصحاب کے واپس آ گئے۔

غالباً ملتان کے ہندو مسلم اتحاد کے متعلق یہ پہلی ناکامی تھی جس کا منہ حکیم صاحب نے دیکھا اس ناکامی کی تلخی اُن الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے جو ستمبر میں پنجاب پراونشل کانفرنس کے موقعہ پر انہوں نے فرمائے تھے:

تم میں سے ہر شخص کہتا ہے کہ ہم سوراج کے لئے تیار ہیں حالانکہ تم آپس میں لڑ رہے ہو۔ میں تمام مسلمانوں سے جو یہاں موجود ہیں صاف طور پر کہتا ہوں کہ اگر تم سوراج کے سوال کو چھوڑے دیتے ہو تو تم خلافت کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے اور سوراج بغیر ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اتنے اہم مقاصد اپنے سامنے رکھ کر بھی کیا تم ایک دوسرے سے لڑ سکتے ہو؟ یہ جھگڑا اور لڑائی

ایک ایسا یقینی زہر ہے کہ اگر تم اُس کے اثرات کو روکنے
کی کوشش نہ کرو گے تو یقین جانو کہ وہ زہر تمام ملک میں
اثر کر جائے گا۔ اور اس کے معنے صرف یہ ہونگے کہ
تم ہمیشہ کے لئے غلام بنے رہو گے۔ اگر نا اتفاقی کی یہ ہوا
تمام ملک میں پھیل جائے گی تو پنجاب اُس کا ذمہ دار ہوگا۔

اسی کے ساتھ اُنھوں نے اپنا ایک بیان اخبارات کو بھی دیا جس میں
اُنھوں نے فرمایا کہ :۔

کیا پنجاب کے ہندو اور مسلمان ذمہ دار اصحاب
اس بات سے خوش ہونگے کہ ملک کی موجودہ متحدہ طاقت
کو سخت ترین صدمہ پہنچے اور سوا راج اور خلافت کے
اہم ترین مسائل باہمی نا اتفاقی کی دست برد کے حوالہ
کر دئے جائیں ؟

میں پنجاب کے بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر
اُنھوں نے اپنے صوبہ کی موجودہ حالت کو جلد درست
نہ کیا تو تمام ہندستان پر اُس کا ایسا نقصان دہ اثر پڑے گا
جس کی تلافی برسوں میں نہ ہو سکے گی اور ہمارے مخالفوں
کو کھلے طور پر اس بات کا موقعہ ملے گا کہ وہ ہماری حماقتوں
پر خندہ زنی کریں۔

آج سے ۲۴ سال پہلے ہندستان کے اس حشر کو حکیم صاحب دیکھ
رہے تھے اور ہندستان کے بیوقوف فرقہ پرستوں کو تنبیہ کر رہے تھے
کہ وہ جس شاخ پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹ رہے ہیں اور جس کنوئیں سے

پانی پینا چاہتے ہیں اُسی میں زہر ملا رہے ہیں۔

اسی موقعہ پر اُنہوں نے پنجاب کی صحافت کو بھی مخاطب کیا جو فرقہ واری اشتعال کے اُبھارنے میں سب سے بڑی گناہگار تھی اور ہمیشہ رہی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ

> مجھے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ پنجاب کے پریس نے جس طرزِ عمل کو قابلِ اعتراض اور ملک کے مقاصد کے منافی سمجھ کر ترک کر دیا تھا آج پھر وہی طرزِ عمل اختیار کیا جا رہا ہے...... پنجاب کا پریس جو ہندستان کے سب صوبوں کے مقابلہ میں طاقتور پریس ہے ملک کی موجودہ نازک حالت کو بھول نہ جائے اور دونوں قوموں کے حقیقی اور بڑے فوائد کے لئے جس اتحاد کی ضرورت ہے اُس اتحاد کی حفاظت اور مضبوطی کے لئے اپنے فرض اور اپنی ذمہ داری کو برابر پیشِ نظر رکھے۔

پنجاب کی فرقہ پرست صحافت جس قدر اندھی اور بہری اُس وقت ہو گئی تھی اتنی ہی ہمیشہ رہی اور ہندستان کی تقسیم کے وقت تک نہ اُس نے قوم پرستی اور عقل کی بات سنی اور نہ زندگی کے ٹھوس حقائق کو دیکھا۔ ادنیٰ قسم کے فرقہ واری جذبات ہمیشہ اُس کے رہنما رہے ۲۲ء میں جو کچھ حکیم صاحب پنجاب کے متعلق فرماتے رہے اُس کی ایک بدتر اور زیادہ دلدوز تصویر ۴۰ء کے بعد سے نظر آئی جب ہندستان کی تقسیم اور دو قومی نظریہ کا تلخ ثمر صحافتی فرقہ پرستی کے زہریلے درخت میں پیدا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب اُس وقت پنجاب

سکے اس مفسدہ میں اُس مفسدہ کی ابتدائی پرچھائیاں صاف دیکھ رہے تھے جو ۱۹۴۷ء میں سارے ہندستان پر مسلط ہو گیا۔

ترک قوم پرستوں کی فتح

جب حکیم صاحب اہل پنجاب کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہے تھے تو وطن پرست مسلمانوں کے لئے ایک بڑی خوشی کا پیام انقرہ سے آنے والا تھا۔ اگست میں مصطفےٰ کمال نے دریائے سکاریا پر یونانیوں کو شکست فاش دیکر سمرنا، تھریس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں کی یہ شکست فی الاصل انگریزوں کے ترک دشمن تدبر کی شکست تھی۔ قدرتاً اس خبر سے ہندستان کے مسلمانوں میں ایک غلغلہ شادمانی بلند ہوا دو سال کے عرصہ میں ہندستان کے مسلمان ۵۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ ترکی احرار کو بھیج چکے تھے اور خلافت کی تحریک میں ہزارہا مسلمان جیل خانوں میں جا چکے تھے۔ ۱۱ اکتوبر کو اتحادیوں سے مدانیہ کی عارضی صلح ہو گئی اور یکم نومبر کو مصطفےٰ کمال کی جماعت آل عثمان کی وراثت پر قابض ہو گئی۔ عام طور پر ہندو مسلمانوں نے اکثر مقامات پر مل جل کر اس فتح کی خوشی منائی۔ دہلی میں بھی یہ تقریب مشترک طور پر منائی گئی یہ حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، پروفیسر اندر، شیو نراین وکیل مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید لالہ پیارے لال، لالہ دیش بندھو، آصف علی وغیرہ کے نام سے جشن فتح کا جو اعلان شائع ہوا اُس میں ہندو مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ جس طرح اُنہوں نے تحریک خلافت میں متحد ہو کر انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا اب ترکوں کی فتح پر سب مل جل کر جشن منائیں۔

ترکوں کی اس کامیابی اور ہندستان کے جشن صلح میں اُس وقت ایک اندیشہ ناک پہلو بھی کسی قدر نمایاں ہوتا جارہا تھا اور وہ یہ تھا کہ بہت سے مسلمان جو تحریک سوا راج کے جوش و خروش میں تحریک خلافت کی وجہ سے شریک ہوئے تھے اب ترکی اور خلافت کے مسئلہ کو بخیر و خوبی طے ہوتے دیکھ کر سوا راج کی بنیادی تحریک سے کسی قدر بے پروا ہونے لگے۔ ان کم نظر لوگوں کو سرکاری حلقوں میں یہ سمجھایا گیا کہ اُن کا اصلی مقصد تو حاصل ہوگیا اب ہندوؤں کی تحریک میں زیادہ حصہ لینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔ اُن کی نظر میں وسعت ہوتی تو وہ سمجھتے کہ کوئی اسلامی اور ایشیائی ملک کبھی بھی محفوظ نہ تھا جب تک کہ ہندستان کی غلامی باقی تھی۔ اس نکتہ کو اُن کے بعض لیڈروں نے نہ سمجھا اور حکومت نے بھی ترکی میں اپنی شکست سے ہندستان میں یہ فائدہ اُٹھانا چاہا کہ مسلمانوں کو تحریک سوا راج سے جدا کرلے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض مسلمانوں کا حب وطن اُن کے اسلامی جذبات کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوا۔ ترکی کے مستقبل کے متعلق ان لوگوں کے خدشات جس قدر کم ہوتے گئے اُسی قدر وہ آزادی وطن کی تحریک سے بے پروا ہوتے گئے۔ لیکن ابھی ان کے لئے بھی اپنی اس حماقت کو محسوس کرنے کا وقت آنے والا تھا۔

یکم اکتوبر کو انقرہ کی جمعیۃ ملیہ نے مملکت عثمانیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور فوراً سلطان عبدالمجید خاں کو معزول کردیا۔ لیکن ابھی چند روز اُن کو "خلیفہ اسلام" کی حیثیت سے استنبول میں مقیم رہنے

کی اجازت دی گئی۔ ترکی کی جمہوریہ میں سلطان کا کوئی وجود باقی نہ رہا۔ ان تغیرات نے ہندستان کے مسلمانوں کو پھر بےچین کردیا اور اسلامی اخوت کا جو مبالغہ ان کے لیڈروں کے مزاج میں پیدا ہوگیا تھا اس نے انہیں پریشان کرنا شروع کیا۔ ترکوں کی فتح سے تو وہ خوش تھے لیکن سلطان و خلیفہ کی حالت کا تغیر اُن پر گراں تھا — ابھی تک جمہوریت کے معنے وہ سمجھے ہی نہ تھے اور جاگیرداری نظام اُن کے دلوں اور دماغوں پر چھایا ہوا تھا — دہلی میں خلافت کمیٹی نے مصطفےٰ کمال کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی اور مبارکبادی کے تاروں کے بعد ہی احتجاج کے تار بھی مصطفےٰ کمال کے نام بھیجے جانے لگے۔ اس "بیوقوفوں کی جنت" سے بعد کے واقعات نے انہیں بہت بیوقوف بنا کر نکالا۔

سواراج پارٹی

قدرتاً ہندو لیڈر مسلمانوں کی اس مذہبی بحث سے بیگانہ تھے اور آخر دسمبر میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سواراجیوں کی کوئی جماعت ابھی کانگریس کے اندر قائم نہ ہوئی تھی لیکن کانگریس کے باہر کونسلوں میں داخل ہونے کا پروپیگنڈہ زور شور کے ساتھ جاری تھا۔ حکیم صاحب جو اس عام سیاسی جمود کی حالت میں یہ چاہتے تھے کہ عملی سرگرمیاں کم نہ ہوں اور عوام سیاسی میدان سے مایوس ہوکر بیٹھ نہ جائیں اور فرقہ واری فتنہ میں اور زیادہ مبتلا نہ ہوجائیں پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کی اس رائے سے متفق تھے کہ ایک دفعہ قوم پرستوں کو کونسلوں کے اندر جاکر اس سرکاری

قلعہ کو توڑنا چاہیے۔ چنانچہ دسمبر میں جب وہ اجمیر تشریف لے گئے تو وہاں ایک عام جلسہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اسی بات پر زور دیا کہ کانگریس کے لیڈروں کو کونسلوں میں جانا چاہیے۔

جب آخر دسمبر ۲۲ء میں مسٹر سی آر داس کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ جلسہ بمقام گیا منعقد ہوا تو بقول ڈاکٹر انصاری۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے خصوصاً مسلمانوں کو کونسل میں داخلہ پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی اور اُن کی بے مثال شخصیت کی وجہ سے جمعیۃ علما اور نیز خلافت کمیٹی میں باوجود عام مسلمانوں کی مخالفت کے ایک گروہ اُن کا ہم خیال پیدا ہوگیا۔ لیکن اس گروہ کا وزن اتنا زیادہ نہ تھا کہ وہ اس مسئلہ کو متاثر کرسکتا۔ چنانچہ کانگریس، جمعیۃ علما اور خلافت کمیٹی میں کونسل کے داخلہ کا رزولیوشن نامنظور ہوا۔ مسٹر سی آر داس کانگریس کی صدارت سے گیا ہی میں مستعفی ہونا چاہتے تھے لیکن اُن کو کلکتہ اسپیشل کانگریس اور ناگپور کانگریس کی نظیر دیکر ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ اِن دونوں اجلاسوں میں بھی کانگریس کے صدر کی پالیسی کے خلاف کانگریس نے نان کوآپریشن کے رزولیوشن پاس کیے تھے۔ گو کہ مسٹر سی آر داس نے کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ تو نہ دیا لیکن گیا میں حکیم اجمل خاں اور پنڈت

موتی لال نہرو کی اعانت سے سوراج پارٹی کی بنیاد ڈالدی۔

اجلاس کانگریس کے بعد سوراج پارٹی نے کانگریس کے پروگرام سے اپنے اختلاف کا اعلان کر دیا۔ اس اشتہار پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ۱۱۵ اراکین کے دستخط تھے اور حکیم صاحب نے بھی دستخط کئے تھے۔ اب صاف طور پر کانگریس کے اندر دو فریق ہو گئے اور چونکہ کانگریس کی اکثریت ابھی تک ترک موالات کے پروگرام پر جمی ہوئی تھی اس لئے بالآخر مسٹر سی آر داس نے صدارت سے استعفٰی دیکر اپنے کو آزاد کر لیا۔ مسلمانوں کی نظریں اس وقت لوزین کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں جہاں ترکی نمایندے عصمت پاشا اور لارڈ کرزن کے درمیان شرائط صلح پر کشمکش ہو رہی تھی۔ سوائے چند مسلمان لیڈروں کے جن میں سے ایک حکیم صاحب تھے عام طور پر کانگریس سے مسلمانوں کی دلچسپیاں بہت کم ہو گئی تھیں۔ اور اب ہندو مسلم فرقہ پرستی کے فتنہ میں زیادہ جان آتی جاتی تھی۔

شدھی اسی صورت حال کا ایک شاخسانہ شدھی کی تحریک تھی۔ آخر دسمبر میں سوامی شردھانند اپنی قید کی مدت کو پورا کرنے سے پہلے رہا کر دیئے گئے اور دہلی آئے۔ دہلی آتے ہی اُنھوں نے شدھی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جنوری سنہ ۲۳ میں اُنھوں نے پہلے دہلی میں ایک جلسہ شوریٰ منعقد کیا اور اس کے بعد فوراً ہی ایک مستقل جماعت بھارت شدھی کے نام سے قایم کر دی اور ہندوؤں سے دس لاکھ روپیہ چندہ کی اپیل کی۔ فروری میں اُنھوں

نے ملکانہ راجپوتوں کی شدھی کا کام شروع کر دیا۔ فروری ۲۳ء
سے جولائی ۲۳ء تک اس تحریک کا بڑا زور رہا۔ آگرہ، متھرا، علی گڑھ
مین پوری، اٹاوہ، فرخ آباد اور گوڑگانوں میں شدھی کا میدان
جنگ آراستہ ہوا۔ سوامی جی اور اُن کے رضاکاروں نے دورے
کیے، مختلف شہروں میں جلسے ہونے لگے اور اخباروں نے اس
آگ کو ہوا دی۔ اس تحریک کا لازمی اثر تو یہی ہونا تھا کہ فرقہ پرستی
کے باروت خانہ میں آگ لگ گئی۔

سوامی جی نے اپنے بیانات میں حکیم صاحب کے نام کو بھی
اس طرح آلودہ کیا کہ گویا خود حکیم صاحب ہی نے شدھی اور ہندو
سنگھٹن کی تحریک جاری کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ سوامی جی کا یہ
بیان جس قدر مضحکہ انگیز ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر بعض حلقوں میں بدنیت
مسلمانوں نے حکیم صاحب کے خلاف اس بدگوئی کو پھیلانا شروع
کیا۔ گو کہ حکیم صاحب اپنی عادت کے مطابق خاموش رہے
لیکن بعض اسلامی اخباروں نے اس بہتان کا جواب دینا شروع
کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سوامی جی کا یہ بیان کہ "۲۱ء میں جب
ہندو مہا سبھا دہلی میں منعقد ہوئی تو حکیم اجمل خاں نے صلاح دی تھی
کہ مسلمان علما کی طرح ہندوؤں کا بھی سنگھٹن ہونا چاہیے" کس قدر
بے سر و پا ہے۔ لیکن اس واقعے سے کہ ایک ایسا بہتان حکیم صاحب
کے سر پر بھی رکھا جا سکتا تھا اُس زمانہ کے فرقہ واری تعصبات
کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔

۲۳ء کے ابتدائی مہینوں میں حکیم صاحب زیادہ تر جامعہ

اور طبیہ کالج کے کاموں میں مصروف رہے۔ ۶ر فروری کو جامعہ کا دوسرا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں اور ۲۵ر فروری کو طبیہ کالج کا سالانہ جلسہ بمقام دہلی منعقد ہوا جس کے صدر نواب صاحب رام پور تھے ان دونوں جلسوں کے انتظامات میں حکیم صاحب بہت مصروف رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم تفرقہ کے متعلق اُس مایوسی کی حالت میں جو اُن کے قلب پر طاری ہوتی جاتی تھی اُنہوں نے اپنی تسکین کے لئے طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ کے تعمیری کاموں میں اپنے دل کو بہلانا چاہا۔ اسی موقعہ پر طبیہ کانفرنس کا بھی جلسہ ہوا جس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے۔ انتخاب صدر کی تحریک کرتے ہوئے حکیم صاحب نے جن الفاظ میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا وہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ تھے کہ اُن سے طب مغربی کے متعلق حکیم صاحب کی وسعتِ قلب ظاہر ہوتی تھی۔ خود یہ واقعہ کہ طب یونانی کی کانفرنس کا صدر اُنہوں نے طب مغربی کے ایک ماہر فن کو بنایا اُن اطبا اور ڈاکٹروں کے لئے سبق آموز ہے جو ایک دوسرے کے فن کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی پبلک اور پرائیویٹ اور فنی زندگی کے دھارے ایک دوسرے سے اس قدر قریب بہتے رہے کہ حکیم صاحب جس انداز میں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا کرتے تھے اسی طرح ڈاکٹر انصاری حکیم صاحب کے ساتھ اپنی محبت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

تبلیغ | جس زمانہ میں حکیم صاحب اس طرف مصروف تھے عوامی

زندگی کے میدان میں شدھی اور سنگھٹن کے مقابلہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بھارت شدھی سبھا کے قایم ہونے کے بعد ہندوؤں میں مذہبی تعصبات اور جذبات بھڑک اٹھے تھے اور اس کے جواب میں مختلف گوشوں سے ان تحریکات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت منظم کرنے کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ آخر فروری ۲۳ء میں جمعیۃ علمائے ہند نے ایک شعبہ تبلیغ قایم کیا اور مارچ ۲۳ء میں ملکانہ راجپوتوں کی آبادی میں ارتداد کے خلاف تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ مگر جولائی میں جمعیۃ کا یہ شعبہ بند کر دیا گیا۔ لیکن ان چند ہی مہینوں میں دونوں طرف کے اخباروں میں شدھی اور تبلیغ کے اتنے گھوڑے دوڑے کہ ہندو اور مسلمانوں کی شہری آبادیوں میں آگ لگ گئی۔ ادھر تو پنڈت مدن موہن مالویہ نے ستمبر ۲۲ء میں ملتان کے واقعات سے متاثر ہو کر ہندو سنگھٹن کی بنیاد رکھی اور ادھر ہندو مہا سبھا نے اس تحریک کو اپنا لیا۔ مالوی جی، ڈاکٹر مونجے اور لالہ لاجپت رائے نے ملک میں دورے کئے اور ہر مقام پر زور وشور سے اس تحریک کی اشاعت کی گئی۔ بڑے بڑے جلسے ہوئے، بڑی پرجوش تقریریں ہوئیں اور ہندو مردوں اور عورتوں کو جسمانی ورزش سکھانے کے لئے کلب اور اکھاڑے قایم کئے گئے۔ مہابیر دل اور سیوک گارڈ منظم کئے گئے۔ اسی کے ساتھ شدھی کی تحریک نے بھی ہندو نوجوان میں پہلے مدافعتی اور پھر انتقامی جذبات پیدا کئے۔ الغرض اپریل ۲۳ء سے تمام ملک میں فرقہ واری فسادات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۲ر مارچ کو پاٹودی ہاؤس میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حکیم صاحب سے لڑنے والے ہندو مسلمانوں کی مجرمانہ ذہنیت پر سختی کے ساتھ تبصرہ کیا۔ اس کے جواب میں ہندو اخبارات نے حکیم صاحب پر سخت تعریض کی اور بہت سے بے بنیاد الزامات اُن پر لگائے حتیٰ کہ یہ بھی کہا گیا کہ حکیم صاحب، سوامی شردھانند کے مقابلہ پر تبلیغ کا کام کرنے پر آمادہ ہیں۔ حکیم صاحب حقیقتاً اب فرقہ پرست مسلمانوں اور ہندوؤں کی تنگ دلی سے بہت بیزار ہو چکے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اِن معاملات میں اُن کا لہجہ خلاف عادت سخت ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں جب اُن پر ہندو اخبارات میں حملے کئے جا رہے تھے وہ اپنی صحت سے مجبور ہو کر چند روز کے لئے نینی تال کے قریب گھوڑا کھال میں مقیم رہے تھے وہاں بیٹھے ہوئے وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف شدھی اور تبلیغ کی جنگ ایک طرف سوراجیوں اور نو چینجروں کی کشمکش اور ایک طرف خلافت کمیٹی میں سخت ترین اختلافات کا ہجوم یہ سب کچھ وہ دیکھ رہے تھے اور اپنے کو بالکل معذور اور لاچار پاتے تھے۔ عیدالضحیٰ کے موقعہ پر اُنہوں نے جو پیام مسلمانوں کے نام بھیجا وہ اُن کے دردِ دل کا آئینہ دار تھا۔ اُنہوں نے یہ پیام ان الفاظ سے شروع کیا۔

کچھ عرصے سے میں نہایت رنج و غم کے ساتھ ہندو مسلمانوں میں قابلِ افسوس غلط فہمیوں کے ارتقا کا مطالعہ کر رہا ہوں جس نے اس بدقسمت ملک کے ہندو مسلمانوں کے

بڑے حلقوں میں موجودہ کشیدگی کی شکل اختیار کی ہے .... یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ آج کل جذبات نے پرسکون فہم و فراست پر غلبہ پالیا ہے .... میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے ہم مذہب بھائیوں کے نام ایک اپیل شائع کروں۔ ان شدید جذبات سے اندازہ لگاتے ہوئے جو ایک خاص قسم کے تسلسل سے پیدا ہو گئے ہیں یہ اندیشہ بیجا نہیں کہ شاید آئندہ عید الضحیٰ کو ہندوؤں سے کشیدگی کے مظاہرہ کا موقعہ بنایا جائے اور قربانی گاؤ کی قابل تعریف بتدریج کمی کو روک دیا جائے .... بجائے غصہ کے کسی ناسزا جذبہ کو قربانی کی پرمعنی رسم کی حقیقت اور فائدہ میں باعث تخریب بنانے کے ہمیں اس موقعہ کو نفس کی صفائی اور مذہبی رواداری کے اعلیٰ ترین نمونہ کے اظہار کا موقعہ بنانا چاہیئے ....

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان واقعات کو عارضی اور گذر جانے والی گھٹا کی طرح سمجھتا ہوں جس نے کچھ عرصہ کے لئے ہماری امیدوں کے آفتاب کی شعاعوں کو ڈھانک لیا ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے مستقبل اور قومی مفاد کی حفاظت اور ملکی تمناؤں کے برآنے کا دارومدار ہندو مسلم اتحاد ہی پر ہے .... میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ملک کے مذہب

کی تاریخ کے اس اہم موقعہ کا لحاظ رکھیں اور اُن اُمور کو نظرانداز کرتے ہوئے جن سے اُن کے دلوں کو تکلیف پہنچی ہے قربانی گاؤ کو ترک کرنے کے متعلق اپنے رویہ کو جاری رکھیں۔

اُنہوں نے اپنے اس پیام کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:۔

بالآخر میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا میرے مسلمان بھائیوں کو گذر جانے والے جذبات پر غالب آنے اور قربانی کی مقدس رسم کو احتیاط کے ساتھ ناسزا مقاصد اور غصہ سے پاک رکھنے کی توفیق دے اور میری یہ اپیل جسے میں خدا شاہد ہے کہ اپنے مذہب اور قوم کے بہترین مفاد پر مبنی سمجھتا ہوں جس نیت سے شائع کی گئی ہے وہی اثر پیدا کرے اور کسی غلط فہمی کا باعث نہ ہو۔ اگر میں اپنی خرابی صحت سے عارضی گوشہ نشینی پر مجبور نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین غلط فہمی رفع کرنے کے لئے صرف کرتا اس لئے کہ ان ہی کے تعاون پر ہمارے مستقبل مفاد اور ہندستان کی نجات کا دار و مدار ہے۔

عام انتشار

یہ محض حکیم صاحب کی آواز کا اثر تھا کہ دہلی میں اُن حالات کے باوجود جو پیدا ہو گئے تھے قصابوں اور مسلمانوں نے قربانی کے متعلق حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل کیا تاہم دوسرے مقامات پر ایسا نہ ہو سکا اور خود دہلی کے مسلمانوں نے

بھی اپنے غصہ سے مغلوب ہو کر حکیم صاحب کے مشورہ پر پوری طرح عمل نہ کیا۔ ملتان کے زخم ہرے تھے اور اُن پر مختلف گوشوں میں نمک پاشی بھی ہو رہی تھی۔ احمد آباد کے قریب ودہان میں، امرتسر میں، نواب شاہ سندھ میں، مراد آباد میں، اجمیر میں، میرٹھ میں، پانی پت میں، سہارنپور میں، آگرہ میں، بدایوں، پیلی بھیت اور ناگپور میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ہاتھ سے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے اتنے زخم کھائے تھے کہ اب ہندستان کا جسد قومی ان زخموں سے چور چور تھا۔ ایسی حالت میں زندگی کے تمام دوسرے مسائل نظر انداز اور تمام قومی تحریکیں مردہ ہو گئی تھیں۔ پھر بھی لیڈروں کی طرف سے اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوششیں جاری تھیں۔ الہ آباد۔ لاہور۔ کلکتہ اور دہلی میں ہر جگہ ناکام مشورے گرم و سرد بحثیں اور بہت سے مناظرے ہوئے لیکن کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا نہ ہو سکا۔ ستمبر میں کانگریس کا اجلاس خاص بصدارت مولانا ابو الکلام آزاد دہلی میں منعقد ہوا اس موقعہ پر ہندو مسلمانوں کے درمیان مصالحت کرانے کی پھر ایک سخت کوشش کی گئی اور بظاہر صلح کی ایک صورت پیدا بھی ہو گئی۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر کو دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں علاوہ حکیم صاحب صدر کانگریس، سیٹھ جمنا لال بزاز، مسٹر یعقوب حسن، بی اماں (علی برادران کی والدہ) بیگم محمد علی، ڈاکٹر کچلو، مسز نائیڈو اور مسز گاندھی بھی شریک تھیں۔ حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں حاضرین کو یہ خوشخبری سنائی کہ ہندو مسلم نزاع ختم ہو گیا اور سوامی شردہانند اور مولانا شبیر احمد کی کوشش سے اتحاد کے عہد و پیمان ہو گئے۔ نیز تفصیلات

کو طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی۔ حکیم صاحب نے یہ بھی تحریک کی کہ اس کمیٹی کے صدر سوامی شردھانند بنائے جائیں لیکن اُس وقت جذبات اس قدر تلخ تھے کہ مسلمانوں نے اس تجویز کو بہت ناپسند کیا۔ بہرحال اُس موقعہ پر اُن تمام لیڈروں کو جنہوں نے گفتگوئے مصالحت میں حصہ لیا تھا ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ لیکن جو کمیٹی تفصیلات طے کرنے کے لئے بنائی گئی تھی اُس کا وجود چند ہی روز میں ختم ہو گیا اور حکیم صاحب مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری کی تمام جد و جہد پر پانی پھر گیا۔

کانگریس کے اس اجلاس خاص میں کونسل کے داخلہ کا سوال آخرکار سوراجیوں کے حسب منشا طے ہو گیا اور کونسلوں کے بائیکاٹ کی مدنان کو اپریشن کے پروگرام سے خارج کر دی گئی لیکن نان کو اپریشن کا پروگرام اب صرف کاغذ ہی پر باقی تھا۔ اب حکومت سے ترک موالات کے بجائے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ترک موالات کرنے میں مشغول تھے اور ملک کی جو طاقتیں فرقہ واری فتنہ کو روک سکتی تھیں وہ خود ہی غصہ انتقام اور تعصب کے ادنیٰ جذبات میں مبتلا تھیں۔

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے!

کانگریس کی وہ جماعتیں بھی جنہوں نے فرقہ واری فتنہ سے اپنا دامن پاک رکھا تھا نو چینجروں اور سوراجیوں کے جھگڑے میں مصروف تھیں۔ خلافت کمیٹی میں پنجاب کے اراکین کی مخالفت نے سخت افتراق پیدا کر دیا تھا اور دوسری اندرونی خرابیاں بھی پیدا ہو چکی

تھیں۔ آخر ۲۲ء میں خلافت کمیٹی کے اندرونی انتظامات پر سخت اعتراضات ہونے لگے تھے اور ۲۳ء میں یہ راز فاش ہوگیا کہ کمیٹی کا بہت سا سرمایہ ضائع ہوگیا ہے۔ حکیم صاحب نے ان حالات کے تحت خلافت کمیٹی سے اپنا ربط بہت کم کر لیا تھا۔

آخر اگست میں اسیران کراچی رہا ہوئے۔ ۲۹ر اگست کو مولانا محمد علی بغیر اطلاع کے یکایک حکیم صاحب کے مکان پر پہنچے مگر صرف چند گھنٹے قیام کر کے اپنی لڑکی کی علالت کے باعث روانہ ہوگئے چند گھنٹوں میں انہوں نے حکیم صاحب سے فرقہ واری فتنہ کے متعلق گفتگو کی اور حکیم صاحب نے یہ سمجھا کہ اب انہیں اپنی کوششوں میں مولانا محمد علی سے بہت مدد ملے گی۔ لیکن فضا بہت بگڑ چکی تھی۔ اور مولانا محمد علی کی جد وجہد کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ اُن کے جیل خانہ سے باہر آنے سے پہلے ہی لوزان میں اتحادیوں سے ترکوں کی صلح کا اعلان ہو چکا تھا۔ اب یہ طے کیا گیا کہ ترکوں کی اس کامیابی پر تمام ملک میں جشن منایا جائے۔ حکیم صاحب نے ایک مشترکہ جشن کے لئے اپیل شائع کی۔ لیکن مخالف ہوا بہت تیز چل رہی تھی اس لئے بہت کم مقامات پر خصوصاً شمالی ہندستان میں اس جشن کی تقریب میں ہندو مسلمان یکجا ہو سکے۔

اسی زمانہ میں حکیم صاحب آنکھوں میں پانی آجانے کی وجہ سے بڑی حد تک بصارت سے محروم ہو چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی اس معذوری کو بہت کم لوگوں پر ظاہر ہونے دیتے تھے۔ اُن کا کام باوجود اس معذوری کے برابر جاری رہتا تھا اس حالت میں جب چار قدم

چلنا بھی اُن کے لئے دشوار تھا وہ کانگریس کے اجلاس خاص میں ہروقت شریک رہے، اتحاد اور صلح کی گفتگو میں شریک رہے ہی سہارنپور کے فساد کی تحقیقات کرنے تشریف لے گئے فلسطین سے ایک وفد چندہ جمع کرنے کے لئے اُسی زمانہ میں آیا تو اُس کی مہمانداری میں مصروف رہے۔ غرضکہ بہت کم لوگوں یہ معلوم تھا کہ وہ اپنی بصارت کی وجہ اس درجہ معذور ہو چکے ہیں۔ کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد اور صلح کی کوششوں میں مایوس ہو کر وہ چند روز کے لئے قرول باغ کے ایک مکان میں خانہ نشین ہو گئے جہاں اُن کی ایک آنکھ پر اپریشن ہوا۔ لیکن اس اپریشن نے انہیں اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ دسمبر میں کانگریس کے اجلاس کی شرکت کے لئے کوکناڈا نہ جا سکے۔ اس اجلاس کے صدر مولانا محمد علی تھے۔ وہ خود بہت سخت تو چلینجر تھے اور کسی طرح کونسلوں کے بائیکاٹ کو نان کواپریشن کے پروگرام سے خارج کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن بالآخر یہ تصفیہ ہو گیا کہ دونوں فریق اپنا اپنا کام جاری رکھیں اور ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے معاملہ میں کانگریس کوئی موثر اقدام نہ کر سکی۔ حکیم صاحب نے اس موقعہ پر اپنے بستر علالت سے جو پیام صدر کانگریس کو بھیجا وہ یہ تھا کہ

> مجھے امید ہے کہ آپ اور دیگر حضرات کامیابی کے ساتھ ان اہم مسائل کو طے کر لیں گے یعنی کوئی جماعت کونسلوں کے مسئلہ کو شروع نہ کرے تعمیری لائحہ عمل کے لئے متحدہ کوشش کی جائے، ہندو مسلمانوں کے اتحاد

کی تکمیل کے لئے مؤثر ذرائع اختیار کئے جائیں میثاق ملی و وطنی کا معاہدہ کیا جائے۔ اکالیوں کی تحریک کی امداد کے وسائل پر غور کیا جائے۔ کانگریس کے نظام کی از سر نو تعمیر کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔ اگر کوکناڈا میں یہ باتیں طے کر لی گئیں تو اجلاس کامیاب ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات بھی طے نہ ہوسکی اور یہ اجلاس بالکل ناکامیاب رہا۔

۱۹۲۴ء بد سے بدتر ۲۳ء حکیم صاحب کے لئے مایوسیوں، ناکامیوں اور روحانی اذیتوں کا زمانہ تھا۔ مگر ۲۴ء میں تو قومی حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

وہ شروع جنوری میں زیادہ تر رام پور میں مقیم رہے۔ وہیں اُن کو یرودا جیل میں مہاتما گاندھی کی علالت کی خبر ملی۔ ۱۲ جنوری کو جس دن مہاتما گاندھی پر عمل جراحی ہوا کلکتہ میں ایک بنگالی نے پولس کمشنر کے دھوکہ میں ایک دوسرے انگریز کو پستول سے مار ڈالا۔ اس واقعہ نے حکومت اور غیر سرکاری انگریزوں میں سخت اشتعال پیدا کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ حالات کا قدرتی نتیجہ تھا۔ جب حکومت کے استبداد اور سازشوں نے قومی تحریک کو دبا لیا تو انتہا پسند عناصر سطح کے نیچے چلے گئے۔ اس واقعہ سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ حکومت جو اب کانگریس کی کمزوری سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی ہر طرف

دار و گیر اور تشدد پر آمادہ ہو گی۔

مذہبی وابستگی کا غلط نظریہ

آخر جنوری میں حکیم صاحب مہاتما جی کی مزاج پرسی کے لئے پونا تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس آکر وہ رام پور ہی میں تھے جب مہاتما جی کی رہائی کی اطلاع ملی۔ وسط فروری میں وہ دہلی تشریف لے آئے۔ اسی زمانہ میں ہلال احمر عثمانی کا ایک وفد دہلی آیا اور ۲۷ فروری کو گاندھی نگر میں حکیم صاحب نے ایک جلسہ عام میں اراکین وفد کو اہل دہلی سے روشناس کرایا۔ ترکی سے بہت سے وفود وقتاً فوقتاً ہندستان آتے رہے اور ہمیشہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر واپس گئے۔ جنگ طرابلس سے ۲۴ء تک ہندستان کے مسلمانوں کا رگ و ریشہ ترکوں کی ہمدردی سے لبریز تھا اور بلا مبالغہ ہندستانی مسلمانوں کی جیبوں سے کڑوڑہا روپیہ ملت عثمانی کے لئے بھیجا جا چکا تھا۔ اس لحاظ سے یہ ہمدردی بیجا نہ تھی کہ ترک قومی آزادی کے لئے دول یورپ اور خصوصاً انگلستان کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن غلطی یہ ہوئی کہ مسلمان لیڈروں نے اپنی قوم کی ہمدردیوں کو خالص مذہب کے رنگ میں ــــ جو مبالغہ آمیز تھا ــــ ترکوں کے منصب خلافت سے وابستہ کر دیا۔ وہ مذہبی رنگ میں ترکی کے مسائل کو دیکھتے تھے حالانکہ خود ترکی میں مذہب اور مذہبیت کا قدیم تخیل بہت کمزور ہو چکا تھا۔ ترک اب مذہب کی بنیاد پر عثمانی قومیت کو قایم رکھنا نہ چاہتے تھے۔ وہ خوب دیکھ چکے تھے کہ مذہبی طبقہ کے اقتدار نے کس طرح دولت عثمانیہ کی بنیادیں کمزور کی تھیں۔ وہ اب یورپ کا مقابلہ

اُسی کے ہتیاروں سے کرنا چاہتے تھے اور مذہب کے بہت سے فرسودہ
مفروضات کے بجائے اب اُن کے سامنے بہت بڑے معاشی
اور سیاسی مسائل تھے جن کا تصور غلام ہندستان کی دسترس سے
بہت دور تھا۔ ترکوں کا یہ آخری وفد اُس زمانہ میں ہندستان آیا
جب وہ منصب خلافت کو ختم کر دینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ گاندھی
نگر کے جلسہ میں حکیم صاحب نے جو تقریر کی تھی وہ بہت ہی مختصر اور
خشک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ترکی حکومت کے طرز عمل سے
مطمئن نہ تھے۔ دوسرے دن جب شریف منزل میں وفد آیا تو اُنہوں
نے انقلاب ترکی کے مسئلہ پر اراکین وفد سے مفصل گفتگو کی۔ اس
گفتگو کے دوران میں وفد نے حاضرین کو یقین دلایا کہ حکومت کی
اعلیٰ اغراض کی بنا پر سلطان کو معزول کر کے جمہوریہ قایم کی گئی ہے
لیکن منصب خلافت بدستور قایم رہے گا اور ممالک اسلامی کے
درمیان اس نقطہ اتحاد کو مٹایا نہ جائے گا۔ لیکن حکیم صاحب کے
دل میں یہ گمان تھا کہ ایسا ہوگا اور وہ اس خیال سے پریشان تھے
کہ منصب خلافت کے زوال کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی
وہ ساری تحریک مسمار ہو جائے گی جو خلافت کے مسئلہ کو ایک مذہبی
مسئلہ قرار دیکر تعمیر کی گئی ہے۔ حکیم صاحب کی طرح اور بھی کچھ لوگ
مسلمانوں میں ایسے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ہندستانی مسلمانوں کی تحریک
کی یہ بنیاد غلط قایم ہوئی اور اس لئے منہدم ہو کر رہے گی۔ بہرحال
اراکین وفد کے اعزاز میں دعوتیں اور ضیافتیں جاری ہی تھیں
کہ ۳ مارچ کو عین اُس وقت جب ایلزیم ہوٹل کی ایک پارٹی میں

تمام لیڈر جمع تھے یہ اطلاع دفعتاً وصول ہوئی کہ مجلس ملی نے خلیفہ کو معزول اور ملک بدر اور منصب خلافت کو ہمیشہ کے لئے منسوخ کرنے کا فیصلہ کر دیا اور فوراً ہی "خلیفۃ المسلمین" اپنے محل سے خارج کر کے سرحد پار پہنچا دئے گئے۔ ایک عجیب کیفیت تھی جو اس خبر نے اس جلسہ میں پیدا کی۔ اراکین وفد حیران تھے کہ کیا کہیں اور اُن کے میزبان اپنے غم و غصہ کو چھپا نہ سکتے تھے۔

اس طرح ۳ مارچ ۲۴ء کو ایک سب سے بڑی اسلامی تحریک کا خاتمہ ہوا اور ہندستان میں خلافت کمیٹی اور اسلامی سیاسیات کا سب سے بڑا ستون گر گیا جس کے گرنے کے بعد تحریک خلافت کا تمام شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس طرح علی برادران کی خلافت کمیٹی کے در و بست نے ۳ مارچ کو ایلزیم ہوٹل میں ایک ہلاک ضرب برداشت کی۔ اس کے بعد یہ تحریک کچھ دنوں تک نیم مردہ حالت میں زندہ تو رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کے غبارہ کی ہوا نکل چکی تھی۔ ہندستان کے ارباب حکومت کو موقعہ ملا کہ وہ تحریک خلافت کے حامیوں پر "مدعی سست و گواہ چست" کا فقرہ کسیں اور کہیں کہ اب بتاؤ! تم جس خلافت کے لئے لڑ رہے تھے وہ اب کہاں ہے اور جن ترکوں پر تم جان دے رہے تھے اُن ہی نے تمہاری ساری تحریک کی جان نکال لی۔ اس میں شک نہیں کہ مصطفےٰ کمال کے اس اقدام نے خلافت کمیٹی کے مقدمہ کو ہرا دیا۔

۱۱ مارچ کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر ترکی وفد کے اراکین بھی موجود تھے۔ وہاں اُنہوں نے اپنی

تقریر میں اُس عام بیچینی اور بد دلی کو رفع کرنے کی کوشش کی جو انقرہ کے فیصلہ نے پیدا کردی تھی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے بعد تحریک خلافت سے حکیم صاحب بھی تقریبًا بالکل بے تعلق ہوگئے۔ اب وہ صرف ہندو مسلم اتحاد اور سوراج پارٹی کے کاموں میں حصہ لیتے تھے وہ بھی اتنا ہی جتنا کہ صحت کی خرابی کی حالت میں ممکن ہوسکتا تھا۔

ڈاکٹر انصاری نے اپنی یادداشت میں اس زمانہ کا حال اس طرح لکھا ہے کہ:۔

مارچ ۲۴ء میں ترکوں نے منصب خلافت کا خاتمہ کردیا۔ سلطان عبدالمجید جو اس سے پہلے سلطنت سے معزول کردیے گئے تھے لیکن بحیثیت خلیفۃ المسلمین استنبول میں اپنے سابق منصب اور تنخواہ کے ساتھ قصر یلدیز میں مقیم تھے وہاں سے یک بیک خارج اور ملک بدر کردئے گئے اور نہایت بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں پہلے اٹلی میں آکر کچھ دنوں رہے اور اُس کے بعد نیس میں سکونت پذیر ہوئے۔ ہندستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی اس حرکت کو نہایت ناپسند کیا۔ اور وہ وفد جو مرکزی خلافت کمیٹی کی طرف سے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو ایک مرصع تلوار ہندستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیش کرنے جانے والا تھا روک دیا گیا۔ اور ایک بہت بڑا تار مسلمانوں کی طرف سے احتجاج

کا بھیجا گیا............علاوہ مسئلہ خلافت کی بربادی
کے ہندستانی مسلمان اپنے ہمسایوں اور دنیا کے
سامنے بہت خفیف نظر آتے تھے اور اسی مثل کی
مصداق تھے کہ یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ۔

حکیم صاحب کے مخلص دوست سید نثار احمد مرحوم نے اپنے روزنامچہ میں لکھا تھا کہ جس زمانہ میں حکیم صاحب ان واقعات کے بعد ایبٹ آباد میں مقیم تھے تو انہوں نے فرمایا کہ

کوئی قوم ہو کوئی مذہب ہو جس میں تنگ دلی ہے
وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے بہت زیادہ
دنیا میں اپنی روشنی پھیلائی۔ فراخدلی کے ساتھ اسلام
انصاف کا حامی ہے۔ انصاف و عدل کے سامنے
دوست دشمن ایک ہیں۔ مگر افسوس کہ آج مسلمانوں
نے اس سبق کو فراموش کر دیا ہے اور اس کجروی
نے ان کے قدم جادۂ مستقیم سے ہٹا دئے ہیں۔ ترک
بہت خطرناک تجربے کر رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ کامیاب
ہوئے تو کم از کم اپنی قومی زندگی تو سنبھال لیں گے۔

درحقیقت نوجوان ترکوں کے متعلق حکیم صاحب کا خیال ہمیشہ یہی تھا کہ اپنے ملک کی ضروریات اور قومی مصالح کے اعتبار سے وہ خود ہی اپنے مسائل کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو عملی ہمدردی کے سوا ان کے داخلی معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے۔ اس وقت جبکہ تنسیخ خلافت کی وجہ سے

ہندستان میں ذمہ دار مسلمان لیڈر مصطفیٰ کمال اور "جماعت خلق" کو مذہب کا مخالف بتا رہے تھے اور ہزاروں طریقوں سے حکومت انقرہ کو بدنام کیا جا رہا تھا حکیم صاحب بالکل خاموش تھے اور ترکوں کے خلاف ایک حرف بھی کہنا پسند نہ کرتے تھے۔

۲۷ جون کو جب دہلی میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا تو انہوں نے اس خیال کی مخالفت کی کہ حکومت انقرہ کے طرز عمل پر نکتہ چینی کی جائے بلکہ اراکین کمیٹی کو یہ مشورہ دیا کہ اگر وہ انقرہ سے اب بھی کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں تو ایک وفد لیکر چلے جائیں۔ چنانچہ یہ تجویز منظور ہو گئی اور خود حکیم صاحب مجوزہ وفد کے صدر بنائے گئے لیکن حکومت انقرہ نے اُس وقت اس وفد کا ترکی آنا پسند نہ کیا اور حکومت ہند کے ذریعہ سے یہ پیام بھیجا کہ

> انگورہ گورنمنٹ کو ایک دوستانہ وفد کے آنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر یہ وفد انگورہ گورنمنٹ سے ساتھ یا ترکی میں کسی اور جماعت کے ساتھ خلافت کے متعلق بحث کرنا چاہتا ہو تو اُس کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ وہ آنے کی زحمت گوارا نہ کرے کیونکہ حکومت انگورہ بیرونی لوگوں کے ساتھ اپنے داخلی معاملات پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔

اس طرح مسئلہ خلافت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ لیکن اس مسئلہ کے مذہبی مبالغہ نے ہندستان کے حالات کو خراب کرنے میں جو حصہ لیا وہ بہت دیرپا ثابت ہوا۔

اپریل میں جب شفا پانے کے بعد مہاتما گاندھی بمبئی کے قریب جوہو میں لب سمندر مقیم تھے تو کئی ہفتوں تک وہاں سوراجیوں اور نوچینجروں میں گفتگو ہوتی رہی اور یہ کوشش کی گئی کہ مہاتما جی دونوں کے لئے کوئی متفقہ پروگرام تیار کردیں لیکن وہ خود کونسلوں میں شرکت کے خلاف تھے اور اس کو جائز قرار دینے پر آمادہ نہ تھے۔ مسٹر داس، پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم صاحب نے سوراجیوں کے نقطۂ نظر پر بہت کچھ بحث کی لیکن مہاتما جی کو رضامند نہ کرسکے اور جوہو کے مشورے فریقین کو کسی بہتر نتیجہ پر نہ پہنچا سکے۔ جوہو سے آنے کے بعد کچھ تو خلافت کے انہدام اور فرقہ واری فتنہ سے بد دل ہوکر اور کچھ اپنی گرتی ہوئی صحت سے مجبور ہوکر حکیم صاحب ایبٹ آباد چلے گئے جہاں کئی ماہ اُن کا قیام رہا۔

اندھے جذبات کے حملے

آخر جون میں جب حکیم صاحب چند روز کے لئے خلافت کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کرنے کی غرض سے دہلی آئے تو اُنھوں نے ایک دفعہ پھر صحافت کو مخاطب کرکے اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں اُنھوں نے صحافت اور ملک کے دوسرے کارکنوں سے اپیل کی تھی کہ بازاری افواہوں پر اعتبار نہ کریں اور اپنی شکایتوں کو مصالحتی بورڈ کے سامنے پیش کیا کریں۔ لیکن تمام ملک میں اور خصوصاً دہلی میں اب فضا اس قدر مسموم ہوچکی تھی کہ بجائے اس کے کہ اُن کے بیان کا کوئی اثر ہوتا اندھے جذبات نے خود حکیم صاحب پر حملے شروع کردیئے۔ اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ مسلمانوں

میں اجمل خاں جیسا شخص اور ہندوؤں میں مہاتما گاندھی جیسے آدمی جذباتی الزامات کی تلواروں کے زخم کھا رہے تھے۔ مہاتما جی صرف اس لئے ہندو فرقہ پرستوں کے ہدف بنائے گئے کہ اُنہوں نے اپنی رہائی کے بعد ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق ایک بیان شائع کیا تھا اور اُس میں بعض ہندوؤں کی زیادتیوں کی طرف بھی اشارے کئے گئے تھے۔ اب دونوں فرقے انصاف کی کوئی ایسی بات جو اُن کے خلاف ہو سننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ ایک ہندو نے مہاتما جی کو پیغام بھیجا کہ "گاندھی سے کہہ دو کہ وہ ملتان میں مسلمانوں کے مظالم کا ذمہ دار ہے"۔ اُس وقت مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا میں لکھا تھا کہ

> مجھے بہت سے خطوط وصول ہوئے ہیں جن میں سے بعض مشہور احباب کے خطوط بھی ہیں جن میں لکھا گیا ہے کہ میں موپلوں کے بیان کردہ مظالم کا بھی ذمہ دار ہوں نہ صرف اُن کا بلکہ فی الحقیقت تحریک خلافت کے زمانہ سے جتنے فسادات ہوئے ہیں اور جن میں ہندوؤں کو نقصان پہنچا ہے یا بیان کیا جاتا ہے کہ پہنچا ہے اُن سب کا میں ذمہ دار ہوں۔ اُن کی دلیل کا خلاصہ قریب قریب یہ ہے کہ "تم نے ہندوؤں سے کہا کہ مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کے شریک ہو جاؤ اور اس تحریک کو اپنی نگرانی میں لیکر اتنی اہمیت دیدی جیسی کہ اُسے کبھی حاصل نہ ہو سکتی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو متحد اور بیدار کر دیا۔

اُس نے مولویوں کو ایسا وقار دیدیا جیسا کہ انہیں پہلے
کبھی حاصل نہ تھا اور اب جبکہ تحریک خلافت ختم ہوگئی ہندوؤں
کے خلاف مسلمانوں نے ایک قسم کے جہاد کا اعلان
کر دیا ہے" میں نے ان الزامات کا مطلب پڑھنے کے
قابل زبان میں ادا کر دیا ہے ورنہ بعض خطوط میں تو
ایسی گالیاں ہیں جو چھاپنے کے قابل نہیں ہیں"۔

اُسی زمانہ میں ایک آریہ سماجی کی تصنیف "رنگیلا رسول" کے خلاف مہاتماجی نے آواز بلند کی اور اُس کو قابل اعتراض قرار دیا۔ اُن کی اس تحریر کے خلاف ہندو اخبارات میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ مثلاً اخبار پرتاپ نے لکھا کہ:۔

"مہاتماجی کے قلم نے ہندو مسلم اتحاد کے میدان میں
کیا رنگ دکھلایا۔ جس معشوق کے انتظار میں ہندوؤں نے
بیسیوں راتیں حرام کیں اُس نے وہ تیر لگایا کہ یاد رہیگا"۔

حکیم صاحب بھی مہاتماجی کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ ۲۴ء کی تاریخ پھر ۴۷ء میں دہرائی گئی جب پنجاب اور دہلی کی خوفناک خونریزی کے زمانہ میں مہاتماجی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور مرن برت رکھ کر ہندوؤں سے مسلمانوں کی حفاظت کا عہد لیا۔ اُن کی اس آخری کوشش نے پھر ایک دفعہ ہندو فرقہ پرستوں کے کلیجوں میں آگ لگا دی حتیٰ کہ ایک ہندو ہی کے ہاتھ سے اُنہوں نے شہادت کا جام پی لیا۔

دہلی کی فضا اُس وقت حد درجہ زہریلی ہو رہی تھی۔ شروع جولائی

میں وہاں ایک فساد ہوا۔ پھر دوسرا شدید فساد عید الضحیٰ کے موقعہ پر ہوا۔ حکیم صاحب نے اس فساد کے متعلق ایک بیان شائع کیا اور دونوں فرقوں سے اپیل کی کہ وہ عقل سے کام لیں۔ لیکن اس بیان پر ایک طرف تو ہندو اخباروں نے سخت نکتہ چینی کی اور لکھا کہ یہ سب بناوٹی باتیں ہیں وہ حکیم صاحب گائے کا جلوس نکالنے میں مسلمانوں کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں اور جو مظالم ہندو عورتوں اور بچوں پر کئے گئے اُن کی مذمت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اب وہ مظالم چھپائے نہیں جا سکتے۔" اور دوسری طرف مسلمان اخبارات نے حکیم صاحب پر یہ الزام رکھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ دشتی و محبت ظاہر کر رہے ہیں۔ اخبار الامان نے لکھا کہ

> حکیم صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے جو
> ہدیہ مصالحت ہندوؤں کو پیش کیا تھا وہ اُن ہندو
> اخبارات کو قبول نہیں ہے جس پر ہمیں افسوس کہ بلا تشبیہ
> یہ شعر یاد آتا ہے کہ
>
> قشقہ بھی کیا ترک مسلمانی کی
> چین جبیں بھی نہ گئی یار کی پیشانی کی!

ان حالات سے مایوس ہو کر مہاتما جی تو کچھ عرصہ کے لئے دریائے سابرمتی کے کنارے گوشہ نشیں ہو گئے اور حکیم صاحب کھوئی ہوئی صحت جسمانی اور گئے ہوئے سکون روحانی کی تلاش میں مصروف رہے۔ ایبٹ آباد میں جو زمانہ گذرا وہ اس طرح گذرا کہ گویا کہ حکیم صاحب کوشش کر رہے تھے کہ انہیں سیاسی مسائل یاد

ہی نہ آئیں چند مخلص دوست اُن کے ساتھ تھے اور اُن کا وقت زیادہ تر غیر سیاسی یا فنی کاموں میں گزرتا تھا اُن کے ایک خاص دوست سید نثار حسین صاحب محکمہ نہر کے ریٹائرڈ ڈپٹی اُن کے ساتھ تھے اور حکیم صاحب کے لئے دلبستگی کا ایک ذریعہ تھے۔ "ڈپٹی صاحب" ایک روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ اُس میں اُنہوں نے ایبٹ آباد کے ان ایام کے دلچسپ حالات اپنے ہی مخصوص انداز میں لکھے ہیں۔ اس روزنامچہ کو غور سے پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایبٹ آباد کی زندگی میں حکیم صاحب وہ حکیم صاحب ہی نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی روحانی کلفت ہے جسے بہلانا چاہتے ہیں۔ درحقیقت اس زمانہ میں اُن کا دل بہت مجروح تھا اور اپنی تکلیف کو زبان پر لانے کی انہیں عادت نہ تھی۔

آخر جولائی میں حکیم صاحب ایبٹ آباد سے کچھ عرصہ کے لئے کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس ہوتے وقت ایک دن احمد آباد میں تھا تماجی کے پاس ٹھہر کر دہلی واپس آئے وہ اپنی صحت کی خاطر ابھی کچھ عرصہ کشمیر میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن ملک میں ہندو مسلمانوں کے جھگڑے بہت خوفناک صورت اختیار کر چکے تھے اور دہلی تو اس قسم کی خونریزیوں کا گویا مرکز بن گیا تھا۔

۲۱ دن کا برت

حکیم صاحب کو خاص طور پر دہلی کے حالات نے بہت افسردہ کیا جو اُن کا محبوب وطن تھا۔ چنانچہ وہ کشمیر سے اسی لئے دہلی آئے کہ کم از کم وہاں تو ہندو

مسلمانوں کی کشمکش کو رفع کریں۔

۲۴ء میں صورت حال اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اب ملک کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ تھا جہاں یہ فتنہ برپا نہ ہو۔ اگر چند شہروں کے نام لئے جائیں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات ہو رہے تھے تو ملک کی صحیح حالت کا اندازہ کرنے کے لئے اُن کی تعداد کو بہ آسانی پچاس اور سو سے ضرب دی جا سکتی تھی۔ صوبجات متحدہ میں رڑکی، آگرہ، ہاپڑ، جونپور، میرٹھ، مراد آباد پیلی بھیت، شاہجہانپور، ہردوئی، کالپی، الہ آباد، اور پنجاب میں جھنگ، گجرات، لاہور، کوہاٹ اور ہندستان کے دوسرے صوبوں میں دہلی، ناگپور، بھاگلپور، گلبرگہ، جبلپور، کلکتہ، مدراس، غرض کہ کوئی گوشہ ایسا باقی نہ تھا جہاں ہندو اور مسلمان صلح پسند ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ ہر جگہ سینکڑوں اور ہزاروں مقتول و مجروح ہو چکے تھے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ء کے مہینوں میں کوئی ایک ہفتہ ایسا نہیں گذرا جب کسی نہ کسی جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے گلے نہ کاٹے ہوں۔ بالآخر ۱۴ ستمبر کو مہاتما گاندھی اپنی گوشہ نشینی کو ترک کرکے پھر ایک دفعہ اس فتنہ کو دبانے کی کوشش کرنے کے لئے دہلی آئے۔ ۹ اور ۱۰ تاریخ کو کوہاٹ میں فساد ہو چکا تھا۔ خود دہلی کے مسلمانوں کو مہاتما جی سے یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ اُنہوں نے ینگ انڈیا میں بعض واقعات کا الزام مسلمانوں پر لگایا تھا۔ کوہاٹ کے فساد کی خبروں نے مہاتما جی کو بہت بےچین کیا اور آخرکار اُنہوں نے دہلی آکر ۲۱ دن کا برت

شروع کر دیا۔ ۱۸ ستمبر کو یہ برت شروع ہوا۔ اس سے پہلے حکیم صاحب مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری اور بہت سے دوسرے احباب نے انتہائی کوشش کی کہ مہاتما جی اپنے ارادہ سے باز آجائیں لیکن وہ کسی کی بات کو نہ مانے حکیم صاحب مہاتما جی کے اس فیصلے سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ خود بھی فاقہ کرنے کا ارادہ کرنے لگے، احباب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مختلف طریقوں سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی، اس وقت ان کی صحت کی حالت اس قدر خراب اور نازک ہو چکی تھی کہ اگر احباب کی کوشش کارگر نہ ہوتی تو شاید ۲۴ء ہی ان کی زندگی کا آخری سال ہوتا۔

مہاتما جی نے بالآخر اپنے برت کے ۲۱ دن پورے کر دیئے۔ اس فاقہ کے دوران میں ملک کے تمام لیڈر دہلی میں جمع ہو گئے تھے اور برت کے بعد فوراً ہی ایک بہت بڑی صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ انتہائی خیال کے تمام فرقہ پرست لیڈر بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ حکیم صاحب نے اس زمانہ میں اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ رات اور دن کا بھی کوئی فرق اُن کے لئے باقی نہ رہا تھا حالانکہ اُس زمانہ میں وہ خود بہت علیل تھے۔ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ

> میں ہندوؤں اور مسلمانوں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ان تمام جھگڑوں سے آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوا۔ میں شکر گذار ہونگا اگر آپ کوئی فائدہ بتا سکیں۔

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ نے ان جھگڑوں
سے اپنے اخلاق اور اپنی قوت کو سخت نقصان پہنچایا
ہے۔ جب کسی ہندو یا مسلمان دوست سے گفتگو کرنے کا
اس بارے میں موقعہ ملا ہے تو مجھے صرف ایک جواب
ملا ہے وہ یہ کہ کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ سب سے پہلی
چیز ہمارے سامنے سوراج حاصل کرنا ہے۔ مگر ہم اب
پہلے سے زیادہ پست اور ذلیل ہو گئے ہیں۔ ...... سارا
ایشیا آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے
ایشیا کی آزادی کے لئے کیا کیا آپ بہت بلند ہو چلے تھے
لیکن وہ بلندی اب بہت پستی میں آگئی ہے اور اس پستی
پر ہم سب کو شرم آنی چاہیئے .... اب میں مسلمانوں
سے خطاب کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے فرائض اس بارے
میں ہندوؤں سے بھی زیادہ ہیں۔ انہیں نہ صرف ہندستان
کو آزاد کرانا ہے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی
آزاد کرانا ہے۔ مسلمانوں کو آزادی ہند کے لئے ہندوؤں
سے بھی آگے بڑھنا چاہیئے۔ میں صاف صاف اپنے اس
عقیدہ کا اظہار کرتا ہوں کہ ہندستان کی مکمل آزادی
کے بغیر نہ مصر آزاد ہے نہ ترکی آزاد ہے اور نہ جزیرہ
العرب آزاد ہے۔ ہندستان کی موجودہ حالت اسلام کی کیا
خدمت کر رہی ہے؟ آپ نے اسلام اور ہندو دھرم
کو ایک طرف رکھدیا ہے اور آپ شیطانی قوت کے

تابع ہو گئے ہیں۔ اسلام نے ہر ایک پر فرض کیا ہے
کہ وہ نہ صرف خود آزاد ہو بلکہ اپنی ہمسایہ قوم کو آزاد
ہونے میں مدد دے۔ یاد رکھئے کہ جھگڑے کی یہ باتیں
مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ بہت کم ایسی چیزیں
ہیں جن کا تعلق مذہب سے ہے۔ ہندو بھی بتائیں کہ مذہب
سے ان جھگڑوں کا کیا تعلق ہے؟ اور مسلمان بتائیں
کہ فساد سے اسلام کا کیا علاقہ ہے؟

۲ اکتوبر تک یہ کانفرنس جاری رہی اور آخر کار ایک پنچایت بنائی گئی اور دونوں قوموں کے لیڈروں میں باہم بہت سے قول و قرار ہوئے لیکن آخر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اوّل تو دونئے جذبات نے طبائع پر پورا قابو پا لیا تھا، دوسرے یہ کہ پس پردہ ایک تیسری طاقت اپنا کام کر رہی تھی اور یہی وہ شیطانی طاقت تھی جس کی طرف حکیم صاحب نے اوپر کے الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اپنی یادداشت میں ان حالات اور واقعات کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں۔

جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہندو مسلم فسادات
ملک کے بہت وسیع حصہ میں یکے بعد دیگرے وقوع
میں آئے اور عام طور پر یہ فسادات مسجدوں کے
سامنے باجہ بجانے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ صوبہ
سرحد، پنجاب صوبجات متحدہ دلّی، بنگال صوبہ متوسط
اور حیدرآباد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم

سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ مقدمات میں روپیہ صرف ہوا اور فریقین سے جیل خانے بھرے گئے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے ستمبر ۲۴ء میں ۲۱ روز کا برت رکھا۔ اُن کی اس قربانی کا اثر ملک میں یہ ہوا کہ دلّی میں ایک صلح کانفرنس ہوئی جس میں ملک کے تمام ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی لیڈر شریک ہوئے۔ اس میں یورپین غیر سرکاری طبقہ کے نمایندے مسٹر ارتھر مور اور کلکتہ کے بڑے پادری میٹرو پالیٹن بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس میں جیسا کہ عام طور پر کھلی کانفرنسوں میں ہوا کرتا ہے بہت اعلیٰ خیالات کی تقریریں ہر طرف سے کی گئیں۔ لیکن کام کی باتیں کمیٹیوں میں اور چار کی دعوتوں میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہوا کرتی تھیں، کبھی ہندو لیڈر سخت ہو جاتے تھے تو حکیم صاحب اُن کو سمجھا بجھا کر جادۂ اعتدال پر لاتے تھے اور کبھی مسلمان لیڈر روٹھ جاتے تھے تو اُن کو سمجھا بجھا کر قایل معقول کرتے تھے۔ ایک ہفتہ عشرہ کی کوشش میں چند اہم اور مختلف فیہ مسائل طے کئے گئے جو رزولیوشن کی صورت میں صلح کانفرنس میں منظور ہوئے۔ مگر یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن پر نہ ہندوؤں نے عمل کیا اور نہ مسلمانوں نے۔ مہاتما گاندھی اس صلح کانفرنس کے بعد مولانا شوکت علی کے ساتھ کوہاٹ گئے اور وہاں

ان دونوں نے وہاں کے فسادات کے متعلق تحقیقات
کی - کیا عجیب اُس زمانہ کا حال تھا کہ مہاتما گاندھی اور
شوکت علی بھی کوہاٹ کے واقعات کو ایک عینک سے
نہ دیکھ سکے - اور ان دونوں کی رپورٹ مختلف تھی - اسی
افسوسناک زمانہ میں جبکہ مہاتما گاندھی اور شوکت علی کی
جیسی شخصیتیں بھی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں
تو عوام الناس سے کیا توقع کی جا سکتی تھی - اس پر آشوب
زمانہ میں تمام ہندستان کے سربرآوردہ اشخاص میں
صرف گنتی کے چند ہی ایسے آدمی تھے جو فرقہ وارانہ جذبات
سے پاک و صاف رہے - حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام
آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر
سی آر داس وغیرہ چند ایسے لیڈر تھے جنہوں نے اپنے
دامن پر فرقہ واریت کا دھبہ نہ آنے دیا - ایسے حالات
میں یہ بھی کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ مہاتما گاندھی ملک
کے حالات سے بیحد مایوس ہو گئے -

حقیقت یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر انصاری وہ عجیب ہی زمانہ تھا کہ مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی بھی ہندو مسلم تفرقہ کے سوال پر اپنے درمیان ایک نقطہ اتحاد پیدا نہ کر سکے - کوہاٹ کے مسئلہ نے ان دونوں کے درمیان محبت کی ریشمی زنجیر کو اس قدر کھینچا کہ اس کے تار ٹوٹنے لگے اور بعد کے جھٹکوں نے تو آخر اس رشتہ کو بالکل ہی منقطع کر دیا - اُس کی تفصیل آیندہ صفحات میں بیان ہو گی - چند روز پہلے ایک زمانہ

وہ بھی تھا کہ عیدالضحیٰ کے موقعہ پر مولانا محمد علی نے مہاتما جی کو ایک گائے بطور تحفہ بھیجی تھی اور اُس کے جواب میں مہاتما جی نے لکھا تھا کہ

> پیارے بھائی! تم مجھے بھائی سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ جب گائے آئی تو میرا پلنگ کسی قدر اُٹھا دیا گیا تھا اس لئے میں اُس کو بخوبی دیکھ سکا۔ وہ محبت کیسی ہوگی جس نے تمہیں اس تحفہ کے پیش کرنے پر آمادہ کیا؟ خدا کرے کہ جو محبت میرے اور تم دونوں بھائیوں کے درمیان قایم ہے وہی رشتہ الفت نہایت مضبوطی سے دونوں مذہبوں، مادر وطن اور انسانیت کی بہتری کی خاطر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی قایم ہو جائے۔
> بیشک خدا بڑا ہے اور وہ عجائبات ظاہر کرسکتا ہے۔

لیکن مہاتما کو اُس وقت خبر نہ تھی اور نہ محمد علی کو کہ محبت اور یکرنگی کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو ان دونوں کے درمیان ہوا اور یہ کہ چند روز بعد دنیا ایسے مناظر دیکھنے والی تھی جنہوں نے ہندستان کے ہر محب وطن کو خون کے آنسو رلائے۔ کیسے خوش نصیب تھے اجمل خاں اور انصاری اور سی ار داس اور موتی لال نہرو جو اس بُرے وقت سے پہلے ہی دنیا چھوڑ چکے تھے۔

حجاز کی سازشوں کا حشر

اس زمانہ میں جب ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں پر لاٹھیاں چلانے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا سر پھوڑنے سے فرصت ہی نہ ملتی تھی عالم اسلامی میں ایک نیا فتنہ رونما ہو رہا تھا۔

ترکی خلیفہ کے معزول ہو جانے کے بعد جب حجاز کے غاصب حسین نے انگریزوں کے زیر اثر اپنی خلافت کا اعلان کرایا تو اُس کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ دنیائے اسلام نے اُس کے اعلان پر ذرا بھی توجہ نہ کی۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اس نئے خلیفہ کا خیر مقدم کرتی خود جزیرہ العرب کے ایک گوشے سے نکل کر ابن سعود نے حسین کو بیدخل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ستمبر میں سعودیوں نے حسین پر حملہ کر دیا اور شروع اکتوبر میں حسین حکومت حجاز سے دست بردار ہو کر بھاگ نکلا۔ ایک ہی ہفتہ کے بعد سعودی لشکر مکہ پر قابض ہو گیا۔ حجاز کے اس انقلاب نے ہندستان کے مسلمانوں کو بہت فکر مند کر دیا اور جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا حسین اور ابن سعود کے نام پر ہندی مسلمانوں میں فرقہ بندی شروع ہو گئی گویا کہ ہندستان کی فرقہ وارانہ کشمکش اور کانگریس کا اندرونی افتراق بربادی کا کافی سرمایہ نہ تھا۔ اب مسلمانوں میں احناف، اہل سنت اور وہابیوں کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ حکیم صاحب اس اختلاف کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کو اس نئے قضیہ نے اور بھی زیادہ افسردہ خاطر کر دیا۔ کچھ عرصہ تک اپنی سخت علالت کے باعث وہ دہلی سے باہر رہے۔ البتہ نومبر میں مفاہمت کانفرنس میں شرکت کرنے بمبئی تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی دہلی کی طرح صلح پسندی کی کوششیں ناکام رہیں۔ آخر نومبر میں وہ بمبئی سے تشریف لائے اور شروع دسمبر میں پنجاب پراونشل کانفرنس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ ۹ر دسمبر کو اُنھوں نے جلیانوالہ باغ میں ہندو مسلم فرقہ بندی

پر تقریر فرمائی۔ وہاں اُنھوں نے اہل پنجاب کو مخاطب کرکے صاف کہا کہ

آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ نا اتفاقی کا بیج آپ کے صوبہ میں زیادہ نشوونما پاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی صوبہ سے اور صوبوں میں نا اتفاقی جاتی ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں بلکہ یہ ایک امر واقعہ ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے اس بدنما داغ کو مٹائیں اور آیندہ سے عہد کرلیں کہ اگر کوئی جھوٹا لیڈر آپ کے سامنے کوئی بات کہے گا تو آپ اُسے نہ مانیں گے۔

یہاں پر بھی فساد ہوئے ہیں اُن لوگوں کو پتہ ہے کہ انہیں اس سے سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب ہندو مسلمان ایک دوسرے کی غلطی کو معاف کریں اور مہاتماجی کی نصیحت پر عمل کریں۔

اسی زمانہ میں خلافت کمیٹی معاملات حجاز کے متعلق بہت سے ترددات میں گرفتار تھی اور حجاز کے انقلاب سے علی برادران بہت ہی بیزار تھے۔ خلافت کمیٹی نے بالآخر یہ طے کیا کہ حجاز کے حالات کو دیکھنے کے لئے ایک وفد بھیجا جائے جس کے صدر مولانا سلیمان ندوی قرار پائے۔ اس وفد کے سلسلہ میں ۱۹ دسمبر کو دہلی کی جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے حکیم صاحب نے حجاز کے حالات پر اظہار افسوس کیا اور فرمایا کہ

آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ سلطان ابن سعود نے
مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا اور اس ظالم خاندان (خاندان
شریف حسین) کو وہاں سے نکال دیا۔ لیکن مجھے حیرت
ہوتی ہے کہ ان نجدیوں کے خلاف جو توحید کے پوری
طور پر قائل ہیں اور جو احادیث پر سب سے زیادہ عامل
ہیں کفر کے فتوے صادر کئے جا رہے ہیں اور اس طرح
اسلام میں تفرقہ اندازی کی جا رہی ہے۔ ان باتوں
سے سوائے اس کے اور کوئی بات معلوم نہیں ہوتی
کہ مسلمانوں کی بدبختی کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں
کی سلطنتیں فنا ہوتی جا رہی ہیں وہ ادبار کی حالت میں
گرفتار ہیں مگر اُن کے آپس کے تفرقے فنا نہیں ہوتے۔
نجدیوں کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اُس
میں بعض علما بھی ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔ مولوی
صاحبان مجھے معاف کریں لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں
کہ جو لوگ اس قسم کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں وہ یا تو ناعاقبت
اندیش ہیں یا اُن کی پشت پر کوئی اور ہاتھ ہے۔

یہ وہی "مولوی صاحبان" تھے جو خلافت کی تحریک میں بعض قوم پرست
اور مخلص علمار کا دامن پکڑ کر نمایاں ہوتے تھے لیکن اب وہ خود
ان مسلمان لیڈروں کے حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے جنہوں نے
اُن کے لئے نمود و نمائش کا میدان پیدا کیا تھا جیسا کہ آگے بیان
کیا جائے گا وہابیوں اور احناف کے اس شرمناک بحث میں جو

سارے ملک میں پھیل گئی تھی ان پیشہ ور مولویوں کی حقیقت خود اُن لوگوں پر بھی واضح ہو گی جنہوں نے عقیدت اور نیازمندی کے ہزار ہا بوسے اُن کے ہاتھوں پر دئے تھے۔ افسوس صرف اس کا ہے کہ اس جماعت کے بعض مخلص اور قابل احترام افراد بھی جذبات کے اس سیلاب میں بہ گئے۔

دسمبر ۲۴ء میں بلگام میں کانگریس کا سالانہ جلسہ ہوا جس کے صدر مہاتما گاندھی تھے۔ مہاتما جی کو اُس وقت تک ملک کے حالات سے بہت زیادہ مایوسی ہو چکی تھی۔ چنانچہ بلگام میں خود اُن کے ایما سے نان کوآپریشن کی تحریک بند کر دی گئی اور کلکتہ کے سمجھوتہ کی بنا پر کانگریس سوراجیوں کے سپرد کر دی گئی۔ اس کے بعد مہاتما جی سیاسیات سے بالکل علیحدہ ہو کر سابرمتی آشرم میں بیٹھ گئے اور اُنہوں نے سوائے اسپنرس ایسوسی ایشن کے باقی تمام کاموں سے منہ پھیر لیا۔

اس طرح ۲۴ء میں قومی میدان سے دو بڑے رہنماؤں نے کنارہ کشی اختیار کی یعنی مہاتما جی اور حکیم صاحب دونوں نے ایک ہی قسم کی مایوسی اور ناکامی سے تنگ آکر اپنے لئے ایک گوشہ تنہائی تلاش کیا۔ مہاتما جی کے مسلمان ساتھیوں میں پانچ نام بہت نمایاں تھے۔ اجمل خاں، شوکت علی، محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور ڈاکٹر انصاری۔ یہ سب ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی جد و جہد میں شرط اوّل قرار دیتے تھے۔ اسی فرقہ واری فتنہ سے تنگ آکر حکیم صاحب میدان سے ہٹے اور اسی فتنہ سے تنگ آکر مہاتما گاندھی نے کانگریس

سے قطع تعلق کیا۔

علی برادران اب اسلامی مسائل کے اُلجھنوں میں پھنس گئے تھے اور اُن کے جوش و خروش کا رخ اب ابن سعود اور مصطفےٰ کمال کے خلاف تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیائے اسلام کے وہی دو اکابر جنہوں نے ایک حد تک اپنے ملکوں کے آزادی کو یورپین سامراج سے محفوظ رکھا سب سے زیادہ علی برادران کی جماعت کے غم و غصہ کا نشانہ بنے۔ اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ علی برادران نے سیاست کے ہر مسئلہ کو مذہبی مسئلہ بنانے پر اصرار کیا۔ مزاج کی اس افتاد نے بالآخر مولانا شوکت علی کو تو آخر زمانہ میں مسٹر جناح کے دامن سے وابستہ کر دیا۔ اس طرح "باپو" سے جنہیں وہ اپنی جیب میں رکھ لیا کرتے تھے اُن کا تعلق ختم ہو گیا۔

۲۷ء کے آخری مہینہ کے آخری دن کا یہ "موسم" تھا جب اجمل خاں کی زندگی کا نصف النہار ختم ہوا اور آفتاب ڈھلنے لگا!

دورِ آخر

ایک پرچھائیں

سنہ ۲۴ کا آخری مہینہ دہلی کے قرب و جوار میں سیلاب زدہ لوگوں کی خدمت میں صرف ہوا اس کام سے فرصت ملی تو حکیم صاحب پھر اُس پرچھائیں کے پیچھے دوڑنے لگے جو اُن کی زندگی کا سہارا تھی۔ جہاں بھی وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی ذرا سی حرکت دیکھ لیتے تھے بے اختیار اُسی سمت میں چل پڑتے تھے لیکن سنہ ۲۵ کے آغاز میں ہندستان کی متحدہ قومیت کا جسد بیجان اب مسیح الملک کی مسیحائی کا بھی اہل باقی نہ رہا تھا۔ ویسٹرن ہوسٹل میں پھر لیڈروں کے کچھ مشورے ہورہے تھے۔ مگر وہ بھی جو ادیوں کا آخری داتوں تھا۔ ملک کے انتشار کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف تو خود کانگریس کے اندر سوا راجیوں اور تارکین موالات کی کشمکش باقی تھی اور دوسری طرف کونسلوں میں سوا راجیوں اور حکومت کے درمیان رسہ کشی ہورہی تھی۔ ایک طرف پنجاب میں اکالیوں کی تحریک کمزور ہوچلی تھی اور بنگال میں انقلابی شورش نے عدم تشدد کے اصول کا خاتمہ کردیا تھا۔ کوئی جماعت کسی شیرازہ میں منسلک نہ تھی۔ مہاتما جی گئو سبھا میں جاکر تقریر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "مسلمانوں کے متعلق میرا یہ خیال تھا کہ اگر میں نے مسئلہ خلافت کے حل ہونے میں امداد کی تو وہ گائے کی حفاظت کریں گے" اور دعا کرتے تھے کہ خدا مسلمانوں کی دماغی حالت میں تغیر پیدا کرے۔ اسی کے ساتھ اپنی بےبسی اور بیچارگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے کہ "اگر لوگوں پر میرا اثر قایم رہتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔"

پھر ایک موقعہ پر قربانی گاؤ کا ذکر کرتے ہوئے حسرت کے ساتھ فرماتے کہ "میں حیران ہوں کہ میں کیا کروں۔ میرا نہ تو ہندوؤں پہ اثر ہے اور نہ مسلمانوں پر"۔ جب مہاتما گاندھی جیسا انسان اس طرح اپنی شکست اور ناکامی کا اقرار کرے تو پھر قیاس کر لیجیے کہ ۲۵ء میں ملک کی کیا حالت ہو گی۔

وسط فروری میں خلافت کمیٹی کا وفد حجاز سے واپس آیا۔ وہ ۲۳ فروری کو دہلی آیا اور اسی دن جامع مسجد میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں حکیم صاحب بھی شریک تھے۔ جلسے سے پہلے اور جلسے کے بعد کئی دن تک مشورے ہوتے رہے۔ یہ وفد حجاز میں اس قدر ناکام رہا کہ جدہ سے آگے بڑھ ہی نہ سکا اور وہیں شریف حسین کے بیٹے علی نے جو اس وقت تک جدہ پر قابض تھا اس کا راستہ روک دیا۔ خلافت کمیٹی کا وفد اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ سلطان ابن سعود کو حجاز میں جمہوریہ قایم کرنے پر آمادہ کرے مگر اسے حرف مدعا بھی زبان پر لانے کا موقعہ نہ ملا ایسے وفد کا جانا ہی سراسر غلط تھا۔ سیاست کو ان مذہبی تصورات کا ماتحت کرنے کی کوشش جو ہندستانی علما اور مسلمان عوام کے تھے حقایق شناسی پہ مبنی نہ تھی اور خلافت کمیٹی نے ابھی تک ترکی کے متعلق اپنی ناکامی سے کوئی بصیرت افروز سبق حاصل نہ کیا تھا۔ حکیم صاحب کا نقطہ نظر کچھ مختلف تھا۔ وہ مناسب سمجھتے تھے کہ سلطان ابن سعود کی حمایت کی جائے۔ وہ حجاز میں جمہوریہ کے قیام کی کوشش کو بھی بے محل سمجھتے تھے البتہ یہ ضرور ان کا خیال تھا کہ حجاز کے دستوری مسائل ایک اسلامی موتمر

میں طے کئے جائیں۔ خلافت کمیٹی جمہوریہ کا جو خواب دیکھ رہی تھی اس کی بنیاد دراصل بعض ہندی علما کا وہ اختلاف عقائد تھا جس کی وجہ سے یہ علما حجاز پر ابن سعود کے تسلط کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن یہ بیچارے علما دنیا کی اُس وسعت میں حالات کا جائزہ لینے کے قابل نہ تھے جس وسعت میں حکیم صاحب کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ حکیم صاحب کے تصورات عمل کی حدود سے آگے نہیں دوڑا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اب خلافت کمیٹی کی ان جولانیوں سے بیزار تھے۔ خلافت کمیٹی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا اور اب اس کے بنیادی مقصد کے فوت ہو جانے کے بعد فروعی مسائل میدان میں لائے جا رہے تھے تاکہ مسلمانوں کا مذہبی جوش و خروش باقی رکھا جائے۔ تحریک خلافت کا اب ضمنی مسائل کو میدان میں لانا ایسا تھا جیسے مرے ہوئے گھوڑے کو چابک مارنا۔ تحریک کی ساکھ زیادہ تر تو مصطفیٰ کمال کے فیصلہ سے اور کچھ خلافت کمیٹی کی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی اس لئے اب اس میدان میں جو مسائل کھڑے کئے جاتے تھے وہ گر جاتے تھے۔ یہی حشر مسئلہ امارت سعودیہ کا بھی ہوا۔ حکیم صاحب حالات کی حقیقت کو صاف طور پر دیکھ رہے تھے اور اسی لئے اُنہوں نے اس مسئلہ پر نہ تو کچھ فرمایا اور نہ اُس میں حصہ لیا۔

طبیہ کالج اب وہ پھر طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ کے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے لگے۔ ۲۵ فروری کو ہز ہائنس نواب صاحب رام پور طبیہ کالج میں تشریف لائے اور کالج کے ٹرسٹیوں نے

اُن کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ نواب صاحب ہندستان کے والیانِ ریاست میں طبی تحریک کے سب سے بڑے حامی تھے اور اس میں شک نہیں کہ اس تحریک پر اُن کے بڑے احسانات تھے۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے اپنے سپاسنامہ میں یہ امید ظاہر کی کہ ہزہائنس کی سرپرستی میں اس کالج کا نصب العین بہت جلد پورا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ نصب العین حکیم صاحب اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد غفلتوں اور بے پروائیوں اور خودغرضیوں کا شکار ہو گیا اور اب تو ۴۷ء کے فرقہ واری ہنگامہ نے حکیم صاحب کے بنائے ہوئے اُن نقوش کو بھی فنا کر دیا۔

جدید علمی تحقیقات

کالج اور طبی تحریک کا نصب العین جو حکیم صاحب کے دل میں تھا بہت بلند تھا اور وہ یہ تھا کہ جدید سائنٹفک تحقیقاتوں کے ذریعہ سے اس فن کو زمانہ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے کالج کا ایک جداگانہ شعبہ قایم کیا تھا۔ اسی سال طبیہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے حکیم صاحب نے اس مسئلہ کی وضاحت کی اور فرمایا کہ

> اس امر کی نہایت شدید ضرورت ہے کہ زمانہ موجودہ میں جو ترقی ہو رہی ہے اُس کے پہلو بہ پہلو ہم اپنی طب کو ترقی دیں۔ ایک زمانہ گذر گیا دنیا کے علوم کہیں سے کہیں پہنچ گئے لیکن ہم نے ذرہ برابر ترقی نہیں کی ترقی کرنا تو درکنار ہم اُلٹے رو بہ تنزل ہیں۔

اپنی طب کے نقائص کی طرف صراحتاً اشارے کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ نصاب تعلیم ایسا بنایا جائے جس میں جدید تحقیقاتیں شریک کی جائیں، جدید دواؤں کا اضافہ کیا جائے اور نئے نئے امراض کے معالجات تلاش کئے جائیں۔ فنی اصلاحات کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ طب کی تحریک قومی تحریکوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اس لئے اب طبیہ کالج اور طبیہ کانفرنس کے ہر جلسہ میں ملک کے ہندو اور مسلمان لیڈر ضرور مدعو کے جاتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے بعد ۲۵ء کے جلسہ کی کرسی صدارت پر پنڈت موتی لال نہرو لائے گئے۔ علاوہ بریں حکیم صاحب انگریزی طب کے دوش بدوش اپنی طب کو چلانا چاہتے تھے اس لئے ڈاکٹر انصاری اور دوسرے ممتاز ڈاکٹروں کی تائید بھی اُنہوں نے اس کام میں حاصل کرلی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ طبیہ کالج اور طبیہ یونیورسٹی ہندستان کی سوراجی تنظیم کا ایک نمایاں ادارہ بن جائے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ملک کی آزادی کا آفتاب طلوع ہوتے ہی اُن کے اس محبوب ادارے کی شام ہو جائے گی۔

ہندو مسلم نزاع کا ایک اور ثمر تلخ

خلافت کمیٹی کے وفد نے حجاز سے واپس آکر جو رپورٹ دی اُس کے بعد خلافتی لیڈروں کے اجتماع میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ آیندہ ترک موالات کے اصول کار کو کس حد تک قایم رکھا جا سکتا ہے۔ اس بحث کا پس منظر فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کی یہ خواہش تھی کہ اب ہندوؤں کی تحریکات سے جدا ہو کر کام کرنا چاہئے۔ ان

لیڈروں کے زیر اثر جمعیتہ علما ایک سب کمیٹی اس غرض سے مقرر کر چکی تھی کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ جب ہندوؤں سے ترک موالات ضروری ہوگئی ہے تو پھر انگریزی حکومت سے ترک موالات کو جاری رکھنا صحیح پالیسی نہیں ہے۔ حکیم صاحب اس صورت حال کو بغور دیکھ رہے تھے اور اُن کے درد مند دل میں باوجود مایوسیوں کے متحدہ قومی جدوجہد کی ایک چنگاری ابھی تک روشن تھی۔ وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ ہندستان کی آزادی کا وہ تخیل یوں برباد ہو جائے باوجودیکہ وہ خلافت کمیٹی کے کاموں سے الگ الگ رہنے لگے تھے لیکن اس دفعہ اس کے جلسہ میں گئے اور وہاں اُنہوں نے اُس بھٹکتے ہوئے تخیل اور انتشار اور افتراق کو روکا اور پھر ایک دفعہ یہ فیصلہ کرا لیا کہ

> چونکہ حکومت کی پالیسی میں ہندستان جزیرۃ العرب اور دیگر ممالک اسلامیہ کے متعلق کوئی تغیر نہیں ہوا ہے لہٰذا یہ جلسہ اعلان کرتا ہے کہ ترک موالات آج بھی ویسی ہی ضروری ہے جیسی کہ پہلے تھی۔

لیکن کانگریس کی تحریک سے جدا ہونے کا خیال اکثر خلافتی لیڈروں اور جمعیتہ کے بعض ارکین کے دل میں جم چکا تھا اور رنگ محفل دگر گوں تھا اور وہ خوب جانتے تھے ۔ ایک ہی سال بعد جب وہ سفر یورپ سے واپس آئے تو اُنہوں نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کی جو شکستہ دیواریں وہ کھڑی چھوڑ گئے تھے وہ بھی زمین کی برابر ہوگئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جمعیتہ علما نے بالآخر اعلان کر ہی دیا کہ حکومت کے خلاف ترک موالات کا فتوے منسوخ ہونا چاہئے۔

کوہاٹ اور راولپنڈی

دہلی کی صلح کانفرنس کے چند روز بعد مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی کوہاٹ کے حالات کی تحقیقات کرنے گئے پہلے وہ دونوں راولپنڈی گئے وہاں حالت یہ تھی کہ مسلمان صرف مولانا شوکت علی کے پاس شہادت دینے آئے اور ہندو تنہا مہاتما جی کے پاس گئے۔ کچھ ایسی ہی صورت کوہاٹ میں پیش آئی۔ جب یہ دونوں اس دورے سے واپس آئے تو دونوں کی رپورٹ نامکمل تھی۔ اسی لئے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری نے مہاتما جی اور مولانا شوکت علی کو یہ مشورہ دیا کہ ایسی نامکمل رپورٹ کا شائع کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن مہاتما جی نے احمد آباد پہنچتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ اپنا بیان شائع کریں گے۔ جب وہ بیان شائع ہوا تو اس کا جواب مولانا شوکت علی کی طرف سے شائع ہوا۔ اگر حکیم صاحب کے مشورے پر عمل کیا جاتا تو شاید کچھ عرصہ تک علی برادران اور مہاتما جی کے اس افتراق کی افسوسناک حقیقت ظاہر نہ ہوتی اور ملک کے خراب حالات اور زیادہ خراب نہ ہوتے۔ لیکن بہرحال اس منزل پر علی برادران مہاتما جی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا میں اس اختلاف کی جو تفصیل بیان کی تھی اس کا لہجہ حسب معمول سنجیدہ اور معتدل تھا اور کوئی بات اس میں ایسی نہ تھی جو اشتعال کا باعث ہوتی۔ انہوں نے اپنے اور مولانا شوکت علی کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

ہم میں مادی اختلافات ہیں اور واقعات سے ہم

مختلف نتائج پر پہنچے ہیں گواہوں کی شہادتوں کو سچا
ماننے یا نہ ماننے کے متعلق ہم میں اختلاف رہا۔ ہم نے
جس وقت اسے محسوس کیا کہ ہماری رایوں میں اختلاف
ہے تو ہم نے ہم آہنگی سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کی۔ ہم
نے اپنے اختلافات کو حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری
کے روبرو پیش کیا کہ وہ ہمیں ہدایت کریں۔ خوش قسمتی
سے پنڈت موتی لال نہرو بھی اس وقت موجود تھے بحث
و مباحثہ کے بعد بھی ہم متحد الخیال نہ ہو سکے۔ یہ مباحث دہلی
میں ہوئے۔ اس کے بعد ہم چند گھنٹوں تک ایک ساتھ
اس لئے سفر کرتے رہے کہ شاید اتفاق رائے کا کوئی
پہلو نکل آئے۔ اس سے صرف اتنا ہوا کہ کچھ معمولی ترمیم
کر دی گئی۔ ہم نے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری کی اس
تجویز پر غور کیا کہ ان بیانات کو شائع نہ کیا جائے مگر ہم
اور کم از کم میں تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ پبلک کو اس کا بھی علم
ہو جانا چاہئے کہ وہ جو یہ جانتی رہی ہے کہ مجھ میں اور
علی برادرس میں ہمیشہ پبلک معاملات میں ہم آہنگی رہتی
ہے تو اب ہم میں بھی اختلاف ہو جایا کرتا ہے لیکن اس
سے نہ تو باہمی محبت میں فرق آتا ہے اور نہ ایک کو
دوسرے کے خلاف خواہ مخواہ کوئی بدگمانی ہوتی ہے
اس اختلاف رائے کے متعلق ہمارے اعتراف سے
پبلک کو یہ سبق لینا چاہئے کہ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی

جاننا چاہیے کہ ہم نے یا مولانا صاحب نے کوئی دقیقہ
متحد الخیال ہونے کی کوشش میں فرو گذاشت نہیں
کیا۔ لیکن ہم خیالات کو چھپانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ہم
نے اصلی مسودات میں لفظی ترمیمیں بھی کی ہیں لیکن اپنی
قایم کردہ رائے سے کہیں بھی نہیں ہٹے۔ صرف کہیں
کہیں جملوں کی طرز ادا بدل دی ہے تاکہ کسی کا دل
نہ دکھے اس کے علاوہ اصل مسودہ میں کوئی اور تبدیلی
نہیں ہوئی۔

لیکن یہ خوشگوار لہجہ بھی حقیقت کو خوشگوار نہ کر سکا اور پبلک نے اُس وقت کے حالات میں کوئی سبق اس اختلاف کی اشاعت سے حاصل نہ کیا سوائے اس کے کہ علی برادران اور مہاتما جی کے اختلاف نے فرقہ واری فتنہ کو کچھ اور تقویت پہنچائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس قومی تحریک میں جو ہندو مسلم اتحاد کی بنا پر شروع ہوئی تھی راستے کے دو موڑ آئے جنھوں نے عوامی احساسات کا رخ بھی غلط کر دیا۔ پہلا موڑ چورا چوری کے حادثہ کے بعد تحریک کے عین شباب کی حالت میں اُس کے التوا کا فیصلہ تھا اور دوسرا موڑ کوہاٹ کے متعلق علی برادران اور مہاتما جی کے اختلاف کی تشہیر جس نے اُس فرقہ واری اتحاد کی آخری نمود کا بھی خاتمہ کر دیا اس تشہیر سے اور اس کے لازمی نتائج سے حکیم صاحب بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ گو کہ زبان سے وہ شکایت نہ کرتے تھے لیکن اُن کے خاص خاص احباب کو معلوم تھا کہ وہ بہت غمگین اور افسردہ خاطر ہیں۔ اُن کے تصورات کی پوری

عمارت اب منہدم ہو گئی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ مہاتما جی کے طرزِ عمل کو اس موقعہ پر اُن کی تائید بالکل حاصل نہ تھی بلکہ اُن کے دل کو اس واقعہ سے ایک ایسی ٹھیس لگی تھی جس کا اثر زندگی کے آخر وقت تک باقی رہا۔ وہ بظاہر جس قدر سنجیدہ اور متحمل تھے اُسی قدر بہ باطن حساس اور اپنے دُکھ کو محسوس کرنے والے تھے۔ جو چیزیں اُن کی ظاہری حالت میں کوئی تغیر پیدا نہ کرتی تھیں وہی دراصل اُن کے دردمند دل پر داغ بن کر بیٹھ جاتی تھیں۔ یہ ایک علٰحدہ بحث ہے کہ کس حد تک مہاتما جی کا طرزِ عمل حکیم صاحب کی اس افسردگی کا باعث ہوا یا کس حد تک وہ خود مہاتما جی کے نقطہ نظر کو سمجھ نہ سکے۔ تاہم اُن کے سیرت نگار کا تو یہ فرض ہے کہ اُن کے قلب کی تکلیفوں سے وہ جہاں تک واقف ہو اُنہیں ان صفحات پر پیش کر دے۔

ان واقعات کے بعد بھی حکیم صاحب سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے لیکن اُن کے دل کا کوئی تار ٹوٹ چکا تھا اور اُن کی صحت بہت گر چکی تھی۔ وسطِ جنوری میں جب وہ مراد آباد گئے ہوئے تھے تو وہاں قولنج کا ایک سخت دورہ پڑا۔ علاوہ قلب کے پورانے مرض کے جو ابتدائی عمر میں پیدا ہوا تھا اب انہیں معدہ اور آنتوں کے مرض نے گھیر لیا تھا۔ غذا برائے نام رہ گئی تھی اور کمزوری روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ آخرکار اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ چند روز کے لئے یورپ جائیں اور وہاں طبی ماہرین سے اپنے مرض کے متعلق مشورہ کریں اس سفر کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ چند روز کے لئے ملک کی تاریک فضا سے دور رہ کر تھوڑا سا سکونِ قلب چاہتے تھے۔

سفر یورپ

مجروح دل، آزردہ مزاج، تباہ حال صحت، اور پاؤ سیلون کا یہ پشتارہ بطور زاد راہ لیکر ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو دیار غیر کی جانب روانہ ہوئے۔ اُن کی قربانیوں کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ تمام عمر دولت سے کھیلتے رہے بہت کچھ دولت کمائی اور خدمت خلق میں خرچ کی، اُن کا ہاتھ کبھی خالی نہ رہا لیکن اس نوبت پر جب وہ اپنی صحت کی خاطر یورپ جانا چاہتے تھے تو وہ اپنے سفر خرچ کا بھی کوئی انتظام نہ کر سکے تاآنکہ انہیں اپنی جائیداد کا ایک جزو فروخت کرنا پڑا۔ اُن کے لئے بہت آسان تھا کہ والیان ریاست میں سے کوئی رئیس اُن کی خدمت میں سفر خرچ کے لئے دس بیس ہزار روپیہ پیش کر دیتا مگر اُن کی غیر تمند طبیعت کبھی اس نیچی سطح پر نہ آ سکی۔

جس دن وہ دہلی سے روانہ ہوئے تو اُن کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ رخصت ہوتے وقت اسٹیشن پر بھی وہ مریضوں کے لئے نسخے لکھ رہے تھے۔ مارسیلز پہنچ کر اُنہوں نے جو پہلا خط مہاتما گاندھی کو بھیجا اُس میں بھی ہندو مسلم اتحاد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُن کے مختصر الفاظ اُن کے جذبات کا صحیح عکس تھے۔

> مجھے افسوس ہے کہ روانگی سے قبل آپ سے نہ
> مل نہ سکا۔ انشاء اللہ واپسی پر ملاقات کی مسرت حاصل
> کرونگا۔ مجھے بہت ہی شرم آتی ہے کہ جس وقت مجھ سے
> کوئی ہندستان کے حالات کے متعلق سوال کرتا ہے۔
> تو میں اس کے سوا اور کہہ ہی کیا سکتا ہوں
> کہ حالت تباہ ہے۔ ہندستان کی دو بڑی مگر بد قسمت

قومیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ کاش کہ وہ لوگ جو خلیج کو
وسیع کر رہے ہیں ہندستان کی حالت پر رحم کریں اور
اپنا رخ صحیح راستے کی طرف کر کے بیجان کانگریس میں
جان ڈالیں۔

خوش قسمتی سے خود حکیم صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت اُن کے کاغذات میں دستیاب ہوئی جس سے اس آخری سفر یورپ کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی یادداشت کے ضروری خلاصہ کا ایک جز دوان اوراق میں پیش کیا جاتا ہے۔

روزنامچہ اس روزنامچہ کی تمہید میں حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ:

"میں اس سے پہلے ۱۹۰۴ء میں ہندستان سے باہر عراق کی سیاحت کی غرض سے گیا تھا اور کچھ یادداشت سفر بھی لکھی تھی لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں اُسے مکمل نہ کر سکا۔ اور اس وجہ سے سفر عراق کے جو نتائج میرے دماغ میں تھے انہیں اوراق تک لانے کی نوبت نہ آئی۔

دوسرا سفر میں نے ۱۱ء میں کیا۔ اس سفر میں انگلینڈ فرانس، جرمنی، آسٹریا اور ترکی کی سیاحت کی۔ لیکن یہ سیاحت اُسی قسم کی تھی جیسی کہ آج کل امریکن مسافر کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے دوران سفر میں کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی۔ اس لئے یہ سفر بھی نتائج کے اعتبار سے عقیم رہا۔

اب ۲۵ء میں میں پھر ہندستان سے باہر جا رہا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حالات سفر برابر لکھتا رہونگا۔

یہ تیسرا سفر دماغ و اعصاب کو جن کی حالت برسوں کی متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابل رحم ہو گئی تھی آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا اُسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا۔ میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک روز مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام لینے کے خیال سے

سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارا ہمسفر رہوں گا۔ اُن کی اس
برادرانہ محبت اور ہمدردی نے مجھے اس سفر پر آمادہ
کر دیا۔

جس جہاز سے حکیم صاحب روانہ ہوئے اُسی جہاز پر ہندستان کے وایسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ریڈنگ بھی انگلستان جا رہے تھے۔ اس واقعہ نے حکیم صاحب کے بعض دوستوں کے دل میں یہ امید پیدا کی تھی کہ غالباً ۱۰ دن کی اس ہم سفری میں حکیم صاحب اور لارڈ ریڈنگ کے درمیان سیاسی معاملات کے متعلق غیر سرکاری طور پر کچھ گفتگو ہو سکے گی۔ پھر مارسیلز پر بھی بعض ہندستانی احباب نے یہ دیکھ کر کہ لارڈ ریڈنگ اور حکیم صاحب جہاز کے عرشہ پر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہیں یہ قیاس کیا تھا کہ اغلباً ان دونوں کے درمیان ہندستان کے مسائل پر کچھ نہ کچھ گفتگو ضرور ہوئی ہو گی۔ لیکن پہلے ہی سوال پر معلوم ہو گیا کہ گفتگو تو کیا کبھی دو چار رسمی باتیں بھی نہ ہوئیں اور جہاز کی پندرہ روز کی ہمسفری میں بھی۔

وا ں وہ غرورِ عزّ و نازیاں یہ حجاب پاس وضع

کی صورت قایم رہی!

اس پندرہ دن کے بحری سفر میں حکیم صاحب کی نظر انگریزوں کی طرف نہ تھی بلکہ خود اپنے وطن کی کمزوریوں پر پڑ رہی تھی۔ اپنی یادداشت میں فرماتے ہیں کہ

عام طور پر ہندستان میں کہا جاتا ہے کہ انگریز عمدہ دل
جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو اُن کی وہ انسانی کمزوریاں

جو ہندستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بات ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھنا چاہیئے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود ہندستانیوں کی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ اور وطن سے باہر نکل کر جہازی زندگی کا کیا اثر اُن پر ہوتا ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کپیروایزم" ایک مسلّم اور مانی ہوئی طاقت ہے۔ اور اُس کا ایک چھوٹا سا مظہر جہاز کی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز اپنے اقتدار کی فضا سے دُور ہو جانے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف غلام اقوام کے افراد بھی ذلت اور نکبت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتاً آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہندستانی بھائیوں کی جہازی زندگی میں جو کمزوری مجھے معلوم ہوتی ہے اور جو سفر کے آخری لمحوں تک ان میں سے اکثروں کی دمساز رہتی ہے وہ اُن کی کورانہ تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہاز کی زندگی سے کرتے ہیں۔ اُن کی رفتار گفتار اور کردار میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال نہ کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندستان کی غلامی کے اثرات میں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اُس قوم سے دور رہنا چاہیئے جو کسی آیندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو، اپنی روایات اپنی

شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے کی غرض سے
محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی
کرنا چاہتی ہے۔ یہ تقلید گو کہ ہندستان کے ہر ایک
فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز
کی بعض ہندستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب
کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں جس کی وجہ صرف
ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی سے اپنی تعلیم و تربیت کے
خود مالک نہیں ہیں اور جس راستے پر ہم اپنی قومی
تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں نہیں لا سکتے۔ یہ سب
چیزیں ہندستانیوں کو اس وقت میسر ہو سکتی ہیں جبکہ وہ
اپنے ملک کے انتظام کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں
اور اس کے ساتھ ہی ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے
تعلیم و تربیت کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں
جب گورنمنٹ نے ہماری ضرورتوں کی متاجری اپنے
ہاتھ میں لے رکھی ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اپنے
ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی بمشکل انجام دے سکتے ہیں"

ان چند تمہیدی اوراق میں، جو حکیم صاحب کے سفرنامہ کا پہلا باب ہے اُن کے اُن احساسات کا صحیح عکس سامنے آتا ہے جن کے ساتھ وہ ہندستان سے روانہ ہوئے تھے۔

علاوہ ہندستانی سیاست کے اسلامی ممالک کی سیاسیات سے بھی جو گہرا تعلق حکیم صاحب کو تھا، جو وسیع معلومات وہ رکھتے تھے اور

جس عزت و احترام کے ساتھ اُن ممالک میں اُن کا نام لیا جاتا تھا اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ یاد داشت کے ان اوراق میں جا بجا اسلامی ممالک میں حکیم صاحب کی قدر و منزلت کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اس سفر میں پہلا ہی اسلامی ملک مصر تھا جہاں چند گھنٹے اُن کا جہاز ٹھہرا تھا۔ اپنے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ہم سہ پہر کو چار بجے پورٹ سعید پہنچے المقطم اور دیگر مصری اخباروں میں ہمارے اس طرف سے گذرنے کی خبر شائع ہو چکی تھی چنانچہ شیخ ابوالعزائم صدر لجنۃ التحضیریہ العلیا لمجلس الخلافہ اور چند اور مصری اور ہندی بھائی پورٹ سعید پہنچ گئے۔ جو بھائی ہمیں لینے جہاز پر آئے وہ حسب ذیل تھے:۔

(۱) عبدالحمید سعید بک۔ ایک ترکی مصری خاندان کے رکن اور مصر کے قومی کارکن۔

(۲) سید حسینی مارونی دمشقی۔

(۳) سید محمود سلامہ

(۴) سید محمود قاضی، سید احمد قاضی۔

(۵) کامل بک عثمان۔

پورٹ سعید پر متعدد مصری زعما انتظار کر رہے تھے۔ لیکن وقت کم ہونے کی وجہ سے حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری ساحل پر نہ جا سکے اور وہی تمام اصحاب جہاز پر آ گئے۔ روزنامچہ میں حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ

ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مصر میں بھی خلافت

سے متعلق دو گروہ تھے۔ ایک گروہ جس میں علمائے ازہر
بھی شامل تھے خلافت کی خدمت شاہ مصر کو سپرد کرنا چاہتا
ہے اور دوسرا گروہ اس سے اختلاف رکھتا ہے۔

یہ اس زمانہ کی برطانوی سازشوں کا ایک شاخسانہ تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ ان کے زیر اثر کسی ملک میں پھر خلافت کا ایک مرکز بن جائے جس کے نام سے وہ اسلامی ممالک کے لوگوں کو دھوکہ دے سکیں لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی اس لئے کہ سلطان ابن سعود نے مصر کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر اس وقت کسی طرح بھی مصر میں خلافت قایم ہو جاتی تو شاید ہندستان کے مسلمانوں کو (جو مذہبی اصطلاحوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے) زیادہ آسانی سے بہکانے کا موقع مل جاتا۔ لیکن برطانوی تدبیر کو ہر سمت میں ناکامی ہوئی اور اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال نے ان مذہبی اصطلاحوں کے بادبانوں سے ساری ہوا نکال دی تھی۔

۲۳ اپریل کو حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری پیرس پہنچے۔ یہاں حکیم صاحب ایک ماہ تک اپنے علاج کے سلسلہ میں ٹھہرے رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی مشغولیت بھی بہت کافی پیدا ہو گئی۔ نماز عید حکیم صاحب نے افغانی سفارت خانہ میں ادا کی۔ اس موقعہ پر ہندستانیوں اور افغانیوں کا ایک اچھا مجمع تھا۔ سامنے کے فوٹو میں۔ ہندستانی انقلابی مولوی برکت اللہ مرحوم بھی شامل ہیں جو ان دنوں پیرس میں پناہ گزین تھے اور حکیم صاحب سے گہرے روابط رکھتے تھے۔

علاوہ ضیافتوں اور جلسوں، پارٹیوں اور ملاقاتوں کے جن کا سلسلہ

ختم بھی نہ ہوتا تھا۔ ....

.......۲۴ر اپریل سے ۲۳ر مئی ۲۵ء تک پورا ایک مہینہ اس طرح پیرس میں گذرا کہ کوئی لمحہ مصروفیت سے خالی نہ تھا حکیم صاحب جہاں جاتے تھے اپنا ذوق علمی اور جذبۂ اسلامی ساتھ لیجاتے تھے۔ پیرس میں بھی اُن کو سب سے زیادہ جدید مسجد اور کتب خانوں کے دیکھنے کا شوق تھا۔ اپنی صحت کی خاطر دن میں ایک دو گھنٹہ چہل قدمی کرنے یا دو تین مرتبہ ڈاکٹر سے ملنے کے علاوہ اُنہوں نے کچھ نہ کیا۔ بقیہ وقت یا کتب خانوں میں صرف ہوا یا اپنے ہموطنوں اور اسلامی ممالک کے ممتاز باشندوں سے ملنے میں گذرا۔

عروس البلاد کی بین الاقوامی حیثیت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی مسافر اُس خطہ میں اقطاع و اطراف کے باشندوں کو دیکھتا ہے، امریکہ اور ممالک یورپ کے علاوہ، شام، نجد، عراق، فلسطین، مصر، ٹرکی، ٹیونس، الجزائر حجاز، مراکش، جاپان، ہندستان چین غرض کوئی ایشیائی ملک ایسا نہیں جس کے باشندے خواہ بسلسلۂ تجارت یا سیاسی اغراض لیکر پیرس نہ آتے ہوں وہ شہر کالے، گورے بھورے، سانولے، اور زرد انسانوں کا ایک عجائب خانہ ہے جس کے بازاروں میں دنیا کی ہر زبان بولی جاتی ہے۔ اسلامی دنیا کی ایک ایسی شخصیت جیسی کہ حکیم صاحب مرحوم کی تھی وہاں قدم رکھتے ہی تعلقات اور ملاقاتوں کا ایک وسیع میدان پاسکتی ہے اور نا ممکن تھا کہ حکیم صاحب پیرس جاتے اور وہاں کی عمومی زندگی اُن کی آمد سے بیخبر رہتی۔ حکومت ہندستان کے معتوبین کے علاوہ جیسے کہ حسن شاہد



پیرس میں عید

(دائیں طرف سے بائیں طرف) سردار عزیز خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نواب امیر الدین احمد خاں (لوھارو)، جنرل نادر خاں (نواب صاحب لوھارو اور ولی عہد افغانستان کے پیچھے)، ولی عہد افغانستان، حکیم اجمل خاں، موسیو فیلکس وائی، مولوی برکت اللہ، سر لیاقت علی

سہروردی اور خدا غریق رحمت کرے مولانا برکت اللہ مرحوم مسز کاما
مسز رائے تھے جو حکیم صاحب کی آمد کی خبر سن کر پیرس آ گئے تھے افغانستان
کے جنرل نادر خاں (اعلیٰ حضرت ہز مجسٹی شاہ نادر خاں) سردار عزیز خاں
صاحب یا ٹرکی و مصر کے اہل الرائے مثلاً ٹرکی سفیر، ڈاکٹر نہاد رشاد
اسمٰعیل پاشا، شریف پاشا، مصطفیٰ رستم بک، احمد عونی بک، ڈاکٹر
بہجت وہبی، عاکف کمال بک۔ ضیا رشید بک۔ یہ سب وہ لوگ تھے
جن کی صحبتوں میں پیرس کا ایک مہینہ گذرا اور خدا ہی جانے کہ ان
صحبتوں اور خلوتوں میں عالم اسلامی کے متعلق کیا کیا کہا گیا اور کیا کیا
سنا گیا۔ روسی کمیونسٹ ایک طرف اور مصر کے قوم پرست اور سرکاری
جاسوس دوسری جانب، غرضکہ کوئی رنگ اور کوئی سیاسی قبیلہ ایسا نہ
تھا جو پیرس کی ان صحبتوں میں حکیم صاحب سے روشناس نہ ہوا ہو۔ مولوی
صدرالدین صاحب برلن سے تشریف لائے تھے کہ ہندوستان کے اس
محترم مسافر سے دو باتیں کر لیں، ہندی طلبا، جرمنی، اور پیرس اور لنڈن
سے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، فرانسیسی احباب جن
میں زیادہ تر اہل علم تھے حکیم صاحب کے لئے ایک خاص کشش رکھتے
تھے اور پھر اسی پر ملاقاتوں کا خاتمہ نہ تھا، ہز ہائنس مہاراجہ بڑودہ اور
ہز ہائنس یوراج میسور کی صحبتیں بھی حکیم صاحب کے وقت کا ایک حصہ لیتی
تھیں۔ اور یہ ان کا فطری کمال تھا کہ ہر صحبت میں ان کی شخصیت اپنا نقش
قایم رکھتی تھی اور ہر محفل میں وہ اپنی نظر اس بلند تخیل سے ہٹنے نہ دیتے
تھے جو ان کی زندگی کا رہنما تھا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کی تفصیل
یا مل نہیں سکتی، یا ملتی ہے مگر کہی نہیں جا سکتی۔ کیا کہا جائے کہ کیا ہوتا تھا

جب روسی کمیونسٹ حکیم صاحب سے آکر ملتے تھے اور گھنٹوں اپنے سیاسی اصولوں پر اُن سے گفتگو کرتے تھے اور اُن کی طرف سے اپنے اصولوں پر اصرار اور ان کی طرف سے اُن اصولوں سے اختلاف ہوتا تھا، کیا کہا جائے کہ کس کس طرح حکیم صاحب کی مقتدر ہستی کو اہل غرض اپنے کام میں لانا چاہتے تھے اور کس طرح مایوس لیکن اُس شخصیت کے وزن کے معترف ہو کر واپس جاتے تھے، یہ داستانیں اپنے لئے ایک علیحدہ میدان چاہتی ہیں۔ ملاقاتوں میں حکیم صاحب کی اخلاقی قوت کا اظہار اُسی وقت ہوتا تھا جب وہ غیر مانوس عناصر سے متصادم ہوتے تھے اور پیشانی پر بغیر ایک شکن ڈالے ہوئے اور بغیر قدم رکے ہوئے اپنے راستہ پر گذر جاتے تھے لیکن کسی حال میں جو کچھ مدنظر ہوتا تھا اُس سے قطع نظر پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

سیاسی ملاقاتیں خاص طور پر انگریزی "خفیہ" کا مرکز نظر رہتی تھیں انگریزی سرکار کے یہ کارندے ہر وقت ارد گرد لگے رہتے تھے ان کی کارگزاری کا ایک واقعہ بہت دلچسپ اور قابل ذکر ہے! ایک خاتون جو روس سے خفیہ طور پر ملنے آئی تھیں پیرس میں پوشیدہ ٹھہری ہوئی تھیں اور جب حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری اُن سے ملنے گئے تو اس طرح گئے کہ رات کے ایک بجے چور دروازے سے نکلے اور پیدل اُن کے جائے قیام تک پہنچے، بند کمرے میں گفتگو ہوئی۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں وہ مقام اتنا محفوظ تھا کہ یہ تو گمان ممکن ہی نہ تھا کہ یہاں بھی سرکار کے کارندے حاضر ہوں گے۔ لیکن ایک سال بعد جب راقم الحروف نئی دہلی میں ایک دوست کے یہاں شب کے

کھانے پر مدعو تھا اور وہاں محکمہ خفیہ کے ایک اعلیٰ افسر بھی مدعو تھے تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہند سرکار کے محکمہ خفیہ میں اُس گفتگو کی پوری اور تفصیلی رپورٹ موجود ہے!

پورانے انگریز دوستوں سے ملنے کو بھی حکیم صاحب کا جی چاہتا تھا۔ سیاست کے ہنگاموں میں بھی محبت و مراسم کی وضع داری کا دامن کبھی اُن کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، پیرس پہنچتے ہی ڈاکٹر انصاری صاحب عازم انگلستان ہوئے اور اُنھوں نے چاہا کہ حکیم صاحب بھی دو چار دن کے لئے لندن جائیں لیکن وہ حکومت کی فضا سے دور رہنا چاہتے تھے اور کسی طرح اُن کے دل نے گوارا نہ کیا کہ دو چار دن کے لئے بھی انگلستان جاکر اپنی آزادی کو صدمہ پہنچائیں ایک دن فرمانے لگے کہ "یہ تو سچ ہے کہ میں پادری ٹامس سے ملنا چاہتا ہوں، لارڈ ہارڈنگ بھی بلا رہے ہیں اکثر ہندستانی دوست احباب بھی پیرس تک نہ آسکیں گے وہ سب بھی لندن میں مل جاتے لیکن وہاں جاکر وہ جو اپنی غلامی کا تماشہ دیکھنا اور دکھانا پڑے گا وہ مجھ پر نہایت گراں ہے"! یہ انداز تمکین و استغنا خاص اجمل خانی تھا اور یہ اُن کی زندگی کے اُس ابتدائی عہد میں بھی نمایاں رہا جب وہ "وفاداران سرکار" کی صف میں شمار کئے جاتے تھے۔

بہرحال علاج و معالجہ جو پیرس آنے کا اصلی سبب کہا جاتا تھا وہ تو صرف ایک ضمنی چیز ہوکر رہ گیا اور یہ تیس دن اس طرح گذرے کہ دیکھنے والا دہلی اور پیرس کی مصروفیتوں میں کچھ زیادہ فرق نہ پاتا تھا۔

تدبیرِ صحت جو کچھ ہوئی وہ بس اتنی کہ ڈاکٹر نہادرشاد کے ذریعہ سے ایک بہت بڑے ماہرِ امراضِ امعا سے رجوع کیا گیا اور ان کی ہدایتوں کے بموجب دوا اور پرہیز کا سلسلہ کبھی جاری رہا اور کبھی ٹوٹ گیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مرض کے اسباب دماغی اور روحانی تھے جسمانی شدائد کی جڑ قلب و دماغ کی بےچینی تھی، وہ صدمے تھے جو ہندستان کی بےعقل اور ناشکرگذار قوم کے ہاتھوں اٹھائے گئے تھے، وہ زخم تھے جو اُن کے دردمند دل نے اپنے ملک کی اخلاقی پستی کی بدولت کھائے تھے، اُن کا علاج بھی کیا تھا؟ اس باب میں خود انہیں اس قدر استغنا تھا کہ سارے سفر کے روزنامچہ میں صرف ایک یا دو جگہ اور وہ بھی شاید صرف آدھی سطر میں اپنی صحت کا ذکر فرمایا ہے!

پیرس میں حکیم صاحب کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ کتاب خانوں کی سیر تھی۔

بےمحل نہ ہوگا اگر طبی ماہرین کی ملاقاتوں اور خود اپنے علاج کے سلسلے میں حکیم صاحب کا ایک طبی لطیفہ بھی اس موقعہ پر بیان کر دیا جائے، راقم الحروف اُن کے ہمراہ تھا جب وہ پہلے دن ڈاکٹر کے پاس تشریف لے گئے۔ اپنے پیشہ میں اس ڈاکٹر کا مقام جس قدر بلند تھا اتنا ہی اُس کا مزاج خشک تھا۔ صرف مشورے کی فیس ۲۵ گنی لیتا تھا مگر مریض کے معائنہ میں بلاشبہ بہت وقت اور توجہ صرف کرتا تھا۔ حکیم صاحب کا معائنہ کرتے ہوئے اُسے یہ بات ناگوار گذری کہ حکیم صاحب خود کسی قدر زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مرض کے اسباب بیان فرماتے

تھے۔ چنانچہ اُس نے ڈاکٹر رشاد سے جو ہمارے ساتھ گئے تھے اور ترجمان کے فرائض انجام دے رہے تھے کہا کہ مریض سے کہو کہ جتنی باتیں دریافت کروں اتنا ہی جواب دیں۔ اُس وقت ڈاکٹر رشاد نے اُسے بتایا کہ مریض خود ایک طریقہ طب کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ یہ سن کر اُس نے طب یونانی کے متعلق بہت سے استفسارات کئے اور بہت ہی حقارت کے ساتھ کہا کہ جس طب میں تشخیص کا سب سے بڑا ذریعہ محض نبض ہو وہ کیا طب ہوسکتی ہے۔ اِس پر گفتگو ہونے لگی تو اُس نے حکیم صاحب سے کہا کہ اگر آپ کو اپنی تشخیص پر اتنا ہی اعتماد ہے تو ذرا میرے ایک مریض کو دیکھئے اور بتائیے کہ اُسے کیا مرض ہے۔ چنانچہ دوسرے روز ایک مریضہ حکیم صاحب کے ہوٹل پر لائی گئی جس کو ایک سال سے یہ شکایت تھی کہ اُس کی ٹانگیں سکڑ گئی تھیں اور پیٹ میں درد ہوا کرتا تھا۔ ایکس رے اور دوسرے ذرایع تشخیص بھی ناکام ہوچکے تھے اور کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مرض کیا ہے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ حکیم صاحب مریضہ کو دیکھ کر کسی قدر متردد ہوئے اور فرمانے لگے کہ اُس کے لئے کوئی مناسب دوا اُن کے پاس نہیں۔ تشخیص مرض کے لئے انہوں نے زیادہ تر مریضہ کی بود و باش، معاشرت اور مشاغل کے متعلق سوالات کئے۔ مثلاً یہ کہ وہ کیا کھیل کھیلا کرتی تھی، کیا ورزش کیا کرتی تھی۔ معلوم ہوا کہ مریضہ ٹینس بہت کھیلا کرتی تھی اور گھوڑے پر سوار رہا کرتی تھی۔ قصہ مختصر حکیم صاحب نے اپنی صندوقچی سے ایک دوا نکال کر اُسے دی جو چند رتی سے زیادہ نہ تھی اور اُسے بتایا کہ اُس میں سے صرف ½ رتی مکھن میں ملا کر کھائے۔ وہ بھی ایک

تماشہ تھا کہ وہ فرانسیسی عورت کاغذ کی اُس ذراسی پڑیا کو ہاتھ میں لیکر حیران ہو رہی تھی کہ یہی دوا ہے؟ اتنی سی؟ اور حکیم صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں کہ تم ایک ہفتہ اس کو کھا کر پھر میرے پاس آؤ۔ ایک ہفتہ بعد وہ آئی مگر بہت بہتر حالت میں اور پندرہ دن بعد وہ اپنے پاؤں چل کر آئی حالانکہ مہینے سے اس قابل نہ تھی۔ بہت حیران تھی کہ یہ کیا معجزہ ہے اور راقم الحروف بھی حیران تھا اور سب سے زیادہ وہ ڈاکٹر حیران تھا۔ ایک دن راقم الحروف نے حکیم صاحب سے یہ سوال کر ہی دیا کہ آخر یہ علاج کیونکر ہوا۔ فرمانے لگے قاضی صاحب! ہماری طب میں کتابوں سے زیادہ عقل اور تجربہ کو دخل ہے یہ کوئی طبی معجزہ نہ تھا۔ ہوا یہ کہ میری سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ چونکہ مریضہ ٹینس بھی کھیلتی تھی اور گھوڑے پر بھی سوار ہوتی تھی اس لئے ممکن ہے کہ اُس کی کسی آنت میں کبھی جھٹکے کی وجہ سے گرہ پڑ گئی ہو۔ ایسے مریض میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اُسے ایک ایسی دوا دی جو آنتوں میں کھجلی پیدا کرے۔ وہ دوا تیر بہدف ثابت ہوئی، آنت کی گرہ کھل گئی اور متعلقہ اعضا اپنا کام کرنے لگے! اس معجزہ سے وہ ڈاکٹر اتنا متاثر ہوا کہ گھنٹوں اُس نے حکیم صاحب سے طب یونانی کے متعلق گفتگو کی اور اُن کے اعزاز میں ایک بہت بڑا ڈنر دیا جس میں پیرس کے تمام بڑے ڈاکٹر شریک تھے۔ ایسے ہزاروں میں سے بعض چند طبی لطیفوں کا ذکر کسی دوسری بھی جگہ آئیگا۔

جب ذوق علمی متقاضی ہوتا تھا تو پھر صحت کا سوال بالکل نظر انداز ہو جاتا اور پیرس کے کتب خانوں کی سیر حکیم صاحب کے لئے

دنیا کے تمام مشاغل سے زیادہ ضروری ہوتی۔ پیرس کی نیشنل لائبریری
میں صبح کو جاتے تھے اور شام کو نکلتے تھے۔ قلمی کتابوں کے صیغہ میں
گویا انہوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا اگر اجازت ہوتی تو شاید وہ رات
کو بھی اُس عمارت سے باہر نہ آتے، متقدمین کی یہ صحبت اُن کو زندہ
انسانوں کی صحبت سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ پروفیسر بلوشے سے جو اُس
صیغہ کے محافظ و مہتمم تھے دو تین ہی دن میں بہت اچھے مراسم پیدا
ہو گئے۔ لائبریری کے اوقات کے علاوہ پروفیسر مذکور کئی دفعہ
حکیم صاحب کے ہوٹل میں آئے اور جب وہ آتے تھے تو معلوم
ہوتا تھا کہ اُن کے کوئی پرانے دوست آئے ہیں۔ گھنٹوں
مشرقی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا اور خصوصاً طب کی قلمی کتابوں پر
تنقید اور تبصرہ کے دریا بہہ جاتے تھے۔ چند نادر کتابوں کے فوٹو
ان ہی پروفیسر صاحب کے ذریعہ سے حکیم صاحب نے طبیہ کالج
کے لئے حاصل کئے۔ اور ایک بڑی رقم اس کام میں صرف کی مشرقی
تصاویر کے صیغہ میں جاتے تھے تو گھنٹوں ایک ایک البم کے سامنے
کھڑے ہوئے تصاویر کے حسن و قبح پر پروفیسر سے بحث فرماتے تھے
حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ جن کتابوں کے فوٹو انہوں نے حاصل کئے
تھے (ایک تصنیف اسلامی اسپین کے کسی قدیم طبیب کی تھی) اُن کو
شائع کرائیں لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور اب خدا جانے وہ فوٹو
کہاں گئے جن کی تیاری میں ۱۵ ہزار روپیہ کے قریب صرف ہوا تھا۔
اس کتب خانہ میں حکیم صاحب کے ذوق کا ایک اور گوشہ بھی نمایاں
ہوا اور وہ یہ کہ جب تصویروں کے ذخیرہ کو دیکھ رہے تھے تو چند

تصاویر کے متعلق اعتراض بھی کیا کہ اُن کی تقسیم غلط کی گئی ہے۔ مثلاً چند تصویریں ایرانی اسکول سے تعلق رکھتی تھیں لیکن اُن کو مغل سکول کے البم میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح بعض چینی اور جاپانی تصویریں غلط صیغوں میں رکھی ہوئی تھیں اور اس غلطی کو حکیم صاحب نے بتلایا۔ اُن کے ہر اعتراض سے اُن کے صحیح مذاق اور معلومات کا پتہ چلتا تھا۔ یہی حال کتبوں کے متعلق تھا وہ قلم اور رسم الخط کو ایک نظر دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کتبہ کس زمانہ کا ہو سکتا ہے۔ ایشیائی موزیم کی نمایش میں دو دن متواتر صرف کئے اس طرح کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے بھی باہر نہ گئے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی قلمی ذخیرہ کو گھنٹوں بیٹھ کر دیکھتے تھے اور پھر اُسی کے ساتھ اپنے فن عزیز اور طبیہ کالج دہلی کا مفاد بھی پیش نظر رہتا تھا، غالباً پہلی دفعہ پیرس کے ڈاکٹروں نے حکیم صاحب ہی سے ہندستان کی طب یونانی کی حقیقت معلوم کی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے حکیم صاحب اپنے فن کے متعلق ہمیشہ غیر جنبہ دارانہ رائے رکھتے تھے اور ایلوپیتھک طریقہ علاج کی خوبیوں اور اپنے طریقہ علاج کی بعض خامیوں کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتے تھے، لیکن جہاں خود اُن کا فن ایلوپیتھک پر فائق تھا وہاں وہ اپنے دعوی کو قوی دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے اور کبھی دوسروں کی شان و شوکت سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ پیرس میں کئی دفعہ وہاں کے مشہور ڈاکٹروں اور اہلِ علم سے اس باب میں گفتگوئیں ہوئیں اور حکیم صاحب ہر موقع پر اپنے فن کی ایک صحیح اور متاثر کرنے والی تصویر پیش کرتے تھے جس کا اچھا اثر سننے والوں پر پڑتا تھا۔ پیرس میں

پورانی اور قلمی نسخوں کی تلاش میں، اُن کا مقصود زیادہ تر یہ تھا کہ طب یونانی میں قدیم فن جراحی کا پتہ چلائیں۔ اور اپنے فن کو دوا سازی اور تجزیہ کے جدید علم کی سطح پر لاسکیں۔ یورپ سے واپس آکر اُنہوں نے تحقیقات کا کام تو کالج میں شروع کرا دیا۔ لیکن معلومات کا جو خزانہ وہ یورپ سے جمع کر کے لائے تھے اُس کا بہت قلیل حصہ وہ بر روئے کار لاسکے۔ چند سال اور زندہ رہتے تو نہ جانے اس سفر کے کتنے نتائج طبیہ کالج کی ترقی و وسعت کے معاون ہوتے اگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

پیرس میں حکیم صاحب کی مصروفیت کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ اس تیس دن کے قیام میں اتنی ہی ضیافتوں اور جلسوں میں اُن کو شریک ہونا پڑا اور ہر دعوت کی تقریب ایسی تھی کہ وہ اُس کو رد نہ کر سکتے تھے۔ ہندستانی تاجروں اور ہندستانی طلبا کی ضیافتوں سے وہ کیونکر انکار کرتے، جن کے لئے اُن کا پیرس آنا ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ یورپین احباب، عرب و افغان احباب اور کتنے ہی معزز اور عزیز احباب ایسے تھے جو ایک وقت کی مہمانداری پر ضد کرتے تھے اور حکیم صاحب کوئی عذر نہ کر سکتے تھے، بعض بعض دوستوں کے اظہار محبت نے، حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب کو تھکا دیا لیکن وہ کبھی اپنی صحت کی خرابی کو ایسی تقاریب میں عدم شرکت کی وجہ قرار نہ دیتے تھے۔ بلکہ اکثر وہ اپنی روزانہ زندگی کو بغیر مصروفیت کے کچھ زیادہ تکلیف دہ پاتے تھے، کبھی بیداری کا ایک گھنٹہ بھی بغیر کام اور بغیر ہم جنسوں کی صحبت کے اُن کو گوارا نہ تھا۔ تندرست ہوں یا بیمار پیرس کی دعوتیں اور

دلی کے جلسے سب اُن کی زندگی کے ضروری اجزا تھے۔ جب کبھی وہ چار گھنٹے دوسروں کی دعوت سے بچ رہتے تھے تو وہ ان کو اپنے ہوٹل میں اپنی دوست نوازیوں میں صرف کر دیتے تھے، دو چار ہندستانی نیاز مند تو ہر وقت ساتھ ہی رہتے تھے۔ لیکن اُن کے علاوہ، آج موسیو اور میڈم گیلار شب کا کھانا کھا رہے ہیں تو کل چند ہندستانی طلبا دن کا کھانا کھانے کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ پرسوں کچھ عرب تاجر ناشتہ میں شریک ہیں تو اگلے دن جنرل نادر خاں سہ پہر کی چاء میں شرکت فرما رہے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر ذہبی دسترخوان پر شریک ہیں تو کبھی ڈاکٹر تہادر شاد کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ غرض یہ کہ پیرس کی زندگی عبارت تھی کتب خانوں اور تعلیم گاہوں کی سیر اور علمی اور سیاسی صحبتوں سے۔

سوئٹزرلینڈ

ایک مہینہ پیرس میں قیام کرنے کے بعد ۲۴ مئی کو حکیم صاحب سوئٹزرلینڈ پہنچے۔ جھیل لیمان کے ایک کنارہ پر لوزین میں مقیم ہوئے۔

یہ پہلے سے طے کر چکے تھے کہ پیرس کی مصروفیتوں سے محفوظ رہ کر سوئٹزرلینڈ میں محض ترقی صحت کے خیال سے چند ہفتے مسلسل قیام رہے گا اور ایک حد تک یہ ارادہ پورا بھی ہوا۔ پیرس کے ہنگامے وہاں نہ تھے، نہ احباب کا اجتماع تھا۔ نہ دعوتوں اور ضیافتوں کا ہجوم تھا، ڈاکٹر انصاری صاحب اور حکیم صاحب، تنہا ایک انجمن تھے، "ہم دو کا" کا یہ مرکب بہت خوش گوار اور بہت آرام دہ تھا۔ ایک خاص دوست (جو ڈاکٹر صاحب کے پورانے دوست تھے)

فواد سلیم بک الحجازی تھے، وہ مصر کے ایک مشہور قوم پرست اور مصطفیٰ کامل پاشا کی جماعت کے یادگار تھے اُن ہی کے گرد دو چار ترکوں اور مصریوں سے راہ و رسم پیدا ہوئی اور ان ہی کی صحبت میں حکیم صاحب کا علمی ذوق تسکین پاتا تھا۔ فواد سلیم بک خود عربی بولتے تھے اور اُن کے گھر میں بچہ بچہ عربی بولتا تھا وہ خود علم و فضل کے بڑے سرمایہ دار تھے اور اس لئے لوزین کی تنہائی میں حکیم صاحب کو اُن سے بہتر جلیس و حبیب نہ مل سکتا تھا۔ اپنے روزنامچہ میں ۲۴ رمئی سے ۷ رجولائی تک سوئیزرلینڈ کی داستان جو بیان کی گئی ہے، اُس میں سوائے چند مخصوص احباب اور سوئیٹزرلینڈ کے قدرتی مناظر کے کچھ اور نہیں ہے۔ اس فرصت میں بجلی کا علاج شروع کیا اور فواد سلیم بے کے ایک دوست سے ترکی زبان سیکھنی شروع کی۔ دو چار ترک دوستوں سے کبھی کبھی مسئلہ خلافت اور دیگر اسلامی مسائل پر گفتگوئیں بھی ہوئیں جن کا حوالہ روزنامچہ میں ملتا ہے جس کے صرف چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

۶ رجون۔ شوقی بک کے یہاں لنچ پر گئے شفیق رشید بھی موجود تھے لنچ پر اور اس کے بعد ہوٹل دی لاپے میں خلافت کے مسئلہ پر اور مسلمانوں کے آیندہ نظام پر گفتگو ہوتی رہی۔

۱۳ رجون۔ معدہ کی اصلاح کے لئے بجلی کا علاج شروع کیا۔

۱۸ رجون۔ ۱۶ رجون کو مسٹر سی آر داس کی وفات کا افسوسناک حادثہ ہندستان میں ہوا۔ ۱۸ کو ہم نے یہ خبر ٹائمز

میں بہت سج کے ساتھ پڑھی مانترو بذریعہ ریل گئے۔
تمام راستہ دلچسپ تھا زمینیں سرسبز اور کھیتی سے
بھری ہوئی تھیں۔ انگور کثرت سے تھے یہیں ورڈاکٹر
صاحب ہز ہائینس یو راج میسور کی دعوت چار میں
گئے ان کے سکریٹری مانترو میں ملے جن کے ساتھ
تیرتیبے گئے اور وہاں سے داموننت گئے۔ ہز ہائینس
شائستہ اور خلیق ہیں۔ یہاں چار ہندستانیوں سے ملاقات
ہوئی۔ جن میں سے ایک میسور کے تھے چار سو برس
کا ایک پرانا محل دیکھا۔

۱۹ رجون۔ رات کے وقت شفیق رشید بے آئے اور دیر
تک ترکوں کا ذکر کرتے رہے۔

۲۰ رجون ۱۹۲۵ء کو شام کے ۶ بجے عبدالرحمن صاحب صدیقی
لندن سے آئے اور ہمارے ہوٹل میں اترے۔ نیز
اسی تاریخ کو دو بجے کے بعد شفیق رشید بے ان کی
انگلش بیوی اور لڑکا یہاں سے پیرس کے لئے روانہ
ہوئے اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب فواد بے سلیم اور میں
موجود تھے۔ راستہ میں لوٹتے وقت طاہر بک مصری
نے ہمیں کچھ فوٹو ہدیۃً پیش کئے۔

۲۰ رجون۔ (۱) آج ابراہیم بے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب
صدیقی صاحب اور میں جبل لیمان پر جہاز کے ذریعہ
سے گئے۔ یہ یہاں پر فرانس کا ایک چھوٹا قصبہ ہے۔

یہاں کے چشمے مشہور ہیں۔ چشموں پر جو مکان بنا ہوا ہے
وہ خوبصورت ہے۔

(۲) قمار خانہ دیکھا وسیع گنبد میں بیٹھ کر چاء پی۔ پونے سات
بجے کے قریب واپس ہوئے اور ۸ بجے ہوٹل پہونچے۔

۲۲ جون تا ۲۷ جون ۱۹۲۵ء } ۲۳ جون کو جینوا گئے یہ جھیل
لیمان کے غربی گوشہ پر آباد ہے۔ ایک لاکھ چالیس
ہزار کی آبادی ہے اور یہ شہر جنوبی سوئیٹزرلینڈ
میں سب سے بڑا ہے اسی کے ایک گوشہ میں دریائے
رون کا مخرج ہے۔

روزنامچہ کی یہ چند سطریں نمونتاً نقل کی گئیں۔ پورے روزنامچہ میں سینکڑوں مشہور اشخاص کا ذکر ہے جن سے ملاقاتیں ہوئیں۔

دینا سوئیٹزرلینڈ سے حکیم صاحب ایک بہت بڑی طبی نمایش کو دیکھنے دیانا گئے۔ اس سفر کے متعلق اپنے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

گو ویانا ہمارے پروگرام میں نہ تھا لیکن جب ہمیں
لوزین میں اس طبی نمائش کا حال معلوم ہوا تو اسے
اس وجہ سے پروگرام میں داخل کرنا پڑا کہ ہم طبیہ کالج
کے لئے جو چیزیں خریدنی چاہتے ہیں اُن کے انتخاب کے
لئے یہ بہترین موقعہ ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے اُن عزیزوں نے جو برلن
میں تعلیم پا رہے ہیں اور جامعہ کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے

ہیں۔ ایک تعلیمی خاکہ کھینچا تھا اس لئے انہوں نے برکت علی
صاحب۔ خواجہ عبدالمجید صاحب۔ عابد حسین صاحب اور
مجیب صاحب کو ہمارے پاس اس غرض سے بھیجا کہ ہم
بھی اُس تعلیمی اسکیم پر غور کرلیں اور اپنی رائے بھی ان پر
ظاہر کریں۔ یہ سب لوگ ۱۰ر جولائی کو ویانا پہنچے اور اپنی
آرزوؤں کا ایک بڑا حصہ ہم لوگوں نے ان اعزہ کی نذر
خوشی سے کردیا۔

جامعہ ملیہ کی تاریخ میں گویا ویانا کا بھی ایک مقام ہے!
حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری نے اپنے عزائم کی اس
محبوب یادگار کی ترقی کا نقشہ ہندستان سے ہزاروں میل
دور ایک ایسے مقام پر بیٹھ کر بنایا جہاں ہندستان اور
ایشیا کی بربادی کے بہت سے نقشے یوروپین مدبرین بنا چکے
تھے۔ تصور کیجئے اُس صحبت کا جب یہ چند نوجوان ملت کے
ان دو معماروں کے روبرو اپنی خوابوں کے خاکے پیش
کر رہے تھے۔ وہ خاکے جو آج ایک زندہ ادارے اور
زندہ تحریک کی صورت میں ہندستان کی قومی زندگی کا ایک
جز وہیں۔ اُن دو اولی العزم معماروں میں سے جنہوں نے ویانا
میں جامعہ ملیہ کا نقشہ بنایا تھا ایک یعنی ڈاکٹر انصاری تو اب
جامعہ ہی کی سرزمین پر محو خواب ابد ہیں۔

سوئٹزرلینڈ ہی میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر
ممکن ہو تو اب ترکی جاکر وہاں کے حالات کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

لیکن جب ترکی حکومت کو لکھا گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ استنبول تک تو جا سکتے ہیں، لیکن انقرہ میں اس وقت ان اصحاب کی آمد مناسب نہ ہوگی۔ چنانچہ حکیم صاحب نے تو ترکی جانے کا ارادہ فسخ کر دیا لیکن ڈاکٹر انصاری استنبول تک گئے۔ وینس میں دونوں دوست جدا ہو گئے اور حکیم صاحب مارسیلز ہوتے ہوئے براہ مصر، شام کی جانب روانہ ہوئے۔

مصر و شام | مصر میں یہ ہفتہ تمام تر سیاسی اور اسلامی مسائل کے مطالعہ میں گذرا۔ ارکان موتمر خلافت، علمائے ازہر اور ارکان جمعیۃ رابطہ شرقیہ اور دیگر اہل الرائے حضرات کے ساتھ شب و روز صحبتیں رہیں اور یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ بلحاظ صحت جسمانی سویٹزرلینڈ میں جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سب قاہرہ کی سیاسی صحبتوں میں کھو دیا۔! چونکہ اس زمانہ میں موتمر اسلامی کے انعقاد کی بحث بہت زور و شور کے ساتھ ہندستان حجاز اور مصر میں چھڑی ہوئی تھی اس لئے، جیسا کہ خود حکیم صاحب کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے اسی موضوع پر زیادہ تر گفتگوئیں ہوئیں۔ علمائے ازہر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ موتمر کا اجلاس قاہرہ میں ہو غالباً اُن کے ذہن میں یہ تجویز بھی تھی کہ خلیفۂ اسلام خدیو مصر کو بنا دیا جائے۔ لیکن ایک دوسری جماعت اس کے خلاف تھی حکیم صاحب نے اپنے خطوط میں اس افسوسناک اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

"ہمیں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ نفاق جو مسلمانوں کی بدبختی کی علامات میں سے ہے

اور جس نے کم و بیش تمام اسلامی ممالک کا اجارہ لے رکھا ہے مصر میں بھی مسئلہ خلافت کے متعلق ۔۔۔۔ خوب نمایاں تھا۔

قاہرہ میں ۶ دن کی مصروفیت اُن اختلافات کی فضا میں جو موتمر کے متعلق پیدا ہو چکے تھے، حکیم صاحب کے دل کو تکلیف دینے کے لئے کافی سے زیادہ تھی، اُن کے روزنامچہ اور خطوط سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ شیخ الازہر، علمائے ازہر، احمد شفیع پاشا، سید رشید رضا و دیگر سیاسیین کی ملاقاتوں کے علاوہ ہندستانی طلبا کا ایک ہجوم ہر وقت ان کے ساتھ تھا۔ اور پھر دعوتوں اور ضیافتوں سے بھی مفر نہ تھا۔ ہندو اور سندھی تاجروں نے ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا، انجمن رابطہ ہندیہ نے "پارٹی" دی، شیخ ازہر اور سید رشید رضا کے گھر دعوت دی گئی

مصر میں ہندستانیوں کی ایک کافی بڑی جماعت اقامت گزیں ہے، تجار بھی ہیں اور طلبا بھی، حکیم صاحب کی شخصیت سے ان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو اچھی طرح واقف نہ ہو، اہل وطن کی ان صحبتوں میں ممکن نہ تھا کہ دل کا وہ زخم ہرا نہ ہو جائے جو حکیم صاحب ہندستان سے لیکر گئے تھے۔ چنانچہ نیشنل ہوٹل میں انجمن رابطۂ ہندیہ کی دعوت کے موقعہ پر جو تقریر فرمائی وہ از الف تا ے اُن ہی جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی جن کو الفاظ کی احتیاط اور سنجیدگی بھی چھپا نہ سکی فرمایا۔

"بدقسمتی سے ہندستان اُس اونچی جگہ سے گر گیا ہے جہاں تین چار سال کی کوششوں سے پہنچا تھا لیکن ہمیں کسی حالت میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری قوموں کو بھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں ایک دفعہ

اونچا جانا پڑتا ہے پھر نیچے آنا پڑتا ہے۔

ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ اگر ہم مر بھی گئے تو آیندہ نسلیں ہمارے کام کو پورا کریں گی۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ ہم ملک کے لئے آزادی حاصل کرلیں گے۔ میں پرجوش تقریروں کا حامی نہیں ہوں کہ لوگوں کو محض خوش کرنے کے لئے جوش دلا دیا جائے لیکن اگر ہم جوش دلانے والی تقریریں کریں اور جوش دلا کر بیٹھ جائیں تو کام کیونکر ہو سکتا ہے۔ البتہ ہندو مسلمانوں کو لڑانے کے لئے ایسی تقریریں کام آتی ہیں لیکن کام کرنے کا اصول یہی ہے کہ جو کچھ زبان سے کہے وہ کر دکھائے۔ کم بولے زیادہ عمل کرے۔ اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ ہندستان استقلال حاصل کرے تو آپ کو چاہیئے کہ عمل کریں۔

حقیقت میں آپ کی ترقی ہندو مسلم اتحاد پہ منحصر ہے۔ اس وقت ہندستان میں ہندو مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے اس وقت ہندو مسلم اختلاف سے جو نقصان ہو رہا ہے وہ پچیس تیس برس سے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اگر ہمارا ارادہ ہندستان کی آزادی دیکھنے کا نہ ہوتا تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے۔ لیکن ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ تاریخ سے اور قوموں کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں ترقی کرتی ہیں پھر نیچے گرتی ہیں اور پھر ترقی کرتی ہیں لیکن اب ہم بلندی سے نیچے گر گئے ہیں۔ میں سمجھ رہا

ہوں کہ ہم اس کو چھوڑ کر آگے جائیں گے جہاں پہلے
بلندی پر تھے۔ مجھے عرض کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ
نہ صرف عام ہندو مسلمان جہالت کے باعث آپس میں
لڑ رہے ہیں بلکہ تعلیم یافتہ بھی اس وقت نا اتفاقی بڑھانے
میں مدد دے رہے ہیں کبھی وقت آئے گا کہ وہ اپنی غلطی
کو محسوس کریں گے اور سمجھیں گے کہ اُن کا عمل ملک کے
لئے بجائے نفع کے نقصان کا باعث تھا۔ مجھے اس موقعہ
پر یہ بھی کہنا ہے کہ میں مصر میں بھی ہندستانیوں کا اتحاد
نہیں دیکھتا جیسا کہ ہونا چاہئیے ایسی حالت میرے لئے
دل خوش کن نہیں ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں جو حضرات
اس وقت موجود ہیں وہ غریب الوطنی میں مٹھی بھر
ہندستانیوں کو متحد و متفق کرکے زندگی بسر کریں گے"۔

اُن کے دل میں ہنوز امیدیں مایوسیوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا تصور ہنوز حالات کی تاریکیوں میں اُن کے لئے ایک شعاع نور بنا ہوا تھا۔

۲۸ جولائی کی شام کو حکیم صاحب قاہرہ سے فلسطین کی طرف روانہ ہوگئے۔ علمائے ازہر، ممبران رابطہ ہندیہ اور ہندستانی تجار نے خدا حافظ کہا۔ جس زمانہ میں حکیم صاحب نے فلسطین و شام کا سفر شروع کیا یہ زمانہ اُس ملک میں سخت سیاسی شورش اور بےچینی کا تھا۔ قبیلہ دروز کی شورش نے جو جبل دروز کی گھاٹیوں میں فرانسیسیوں سے لڑ رہے تھے، تمام قرب و جوار کے راستوں کو غیر محفوظ کر دیا تھا۔ ذریعہ

جو اسی ریلوے کا اسٹیشن تھا جس پر حکیم صاحب تشریف لے جا رہے تھے فرانسیسی فوج کا مستقر تھا، حکیم صاحب نے دروز کے حالات اور اس آویزش کی جو تفصیلات اپنے خطوط میں تحریر فرمائی ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور فرانسیسی حکومت کی کارروائیوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان خطوط کا وہ حصہ جس میں خود حکیم صاحب نے اپنے چشم دید حالات بیان کئے ہیں معلومات سے پُر ہے۔

ان خطوط سے اور نیز اخبار ہمدرد کے نامہ نگار کی مراسلتوں سے شام ولبنان میں حکیم صاحب کی مصروفیتوں کا ایک اچھا عکس نظر کے سامنے آتا ہے۔ یہ سارا سفر اس ملک کے مشاہیر سے ملاقاتیں کرنے میں گذرا۔ ان ہی لوگوں میں مشہور مفتی فلسطین حاجی امین آفندی بھی تھے جن سے باربار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن مشاہیر کی ایک لمبی فہرست ہمارے سامنے ہے جن سے حکیم صاحب نے اس سفر میں مسائل اسلامی پر گفتگو کی۔

۹ ستمبر تک حکیم صاحب نے ان ممالک کی سیاحت کی اور ۱۰ ستمبر کو وہ پھر مصر واپس آئے۔ ایک ہفتہ پھر یہاں قیام کرنے کے بعد وہ وطن واپس جانے کے لئے جہاز پر سوار ہوئے اور ۲۵ ستمبر کو بمبئی پہنچے۔

بدبخت وطن میں

جس پست حالت میں ملکی اور قومی تحریکوں کو چھوڑ کر گئے تھے اُسی پست حالت میں بلکہ اُس سے زیادہ پست حالت میں اُن کو واپس آکر پایا۔ کانگریس کے اندر انتہا پسندوں اور سوراجیوں اور غیر سوراجیوں کی کشمکش ختم ہو چکی تھی اور کانگریس سوراجی اصولوں کو قبول کرنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کشمکش کے

اثرات نے ملت کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا اور تحریک قومی کی وسعت اب کونسلوں کے انتخابات کے تنگ دائرہ میں محدود تھی کانگریس کے علاوہ حجاز کے معاملات کے متعلق مسلمانوں کے اندر سخت ہیجان پیدا ہو چلا تھا اور ابن سعود کے قبضۂ حجاز کے موافق و مخالف گروہ آپس میں دست و گریبان ہونے پر آمادہ تھے۔ ان حالات میں حکیم صاحب اپنے وطن سے جس طرح افسردہ گئے تھے اُسی طرح افسردہ واپس آئے۔ صحت میں خفیف ترقی ضرور ہوئی جو اُن صحت بخش ممالک کا قدرتی اثر تھا لیکن دل و دماغ کو تازہ کرنے والی کوئی چیز اپنے وطن میں نہ پائی۔ تاہم اُن کی فطرت مایوسی کا اظہار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو جامع مسجد کے جلسہ میں حالات سفر بیان کرتے ہوئے، انہوں نے اپنے ملک کو صرف یہی ایک پیام اُمید دیا کہ

اس سفر میں جو کچھ دیکھا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایشیا ضرور آزاد ہوگا۔"

اُن کی آرزومندی زبان سے تو اس یقین اور عقیدہ کا اظہار کرا رہی تھی، لیکن سفر کی اس تمام روئیداد سے یہ تکلیف دہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حکیم صاحب اپنے وطن سے جو درد دل میں لے کر گئے تھے وہ ممالک اسلامی کے حالات دیکھ کر کچھ اور بڑھ گیا۔ اُن کے ہجور قلب کے لئے سامانِ تسکین نہ یہاں تھا نہ وہاں میسر آیا، وہ دماغ کا سکون اور دل کی راحت ڈھونڈنے گئے تھے لیکن اپنے دل کی آشفتہ حالی میں کچھ اور اضافہ کر لائے۔

درد کچھ اور بڑھ گیا ہم نے جو کی دوائے دل!

سوائے اس ایک سیاسی فائدہ کے کہ وہ مصر، شام، فلسطین اور دیار یورپ میں اہل الرّائے اصحاب سے ذاتی طور پر تبادلۂ خیالات کر سکے اور اپنے وطن کی بہبودی کے لئے کچھ نتائج اخذ کر کے لائے۔ یہ چھ ماہ کا سفر خوشگوار آب وہوا اور فرحت بخش فضا کے سوا اُن کو کچھ اور نہ دے سکا۔

سلامی ممالک کے علمار کی تنگ نظری اور تعلیم یافتہ طبقہ کی سلام سے لاپروائی و دوری، ایک ایسی بحث ہے جس پر حکیم صاحب کے خیالات بہت وسیع اور بہت فیصلہ کن تھے اور بلاشبہ بلادِ اسلامی کے علما کی حالت نے اُن کے خیالات کی تصدیق کی ہو گی۔ یہ بحث ان اوراق میں اپنے موقعہ پر آئے گی۔

سی آر داس حکیم صاحب کو یورپ گئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ہندستان میں یکایک ۱۶ رجون کو مسٹر سی۔ار۔داس کا انتقال ہو گیا۔ یہ قومی حادثہ بہت سی وجوہ سے ناقابل تلافی تھا مہاتما گاندھی کے بعد ہندو لیڈروں میں سی۔ار۔داس کی شخصیت صرف ایک بنگالی لیڈر کی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ تمام ملک کے مسلمہ لیڈر تھے اور بلاشبہ اپنے ذاتی خصائص کے اعتبار سے مہاتما گاندھی کی سطح پر اُن کی جگہ بھی تھی۔ حکیم صاحب، کو داس کے ساتھ ایک خاص تعلق خاطر تھا اور اُن پر اس اچانک موت کا جو اثر ہوا اور اس حادثہ نے جو خیالات اُن کے دماغ میں پیدا کئے وہ اس خط سے واضح ہوتے ہیں جو یوزین سے اُنہوں نے مہاتما گاندھی کو لکھا تھا وہ فرماتے ہیں۔

"گو ہم سب دنیا کو چھوڑنے والے ہیں، لیکن اس وجہ سے کہ دنیا میں نیک دل قابل اور وطن پر جان و مال فدا کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے ہم اُن کی موت کو ایک ایسا نقصان خیال کرتے ہیں جس کی تلافی بہت دشوار ہے۔ سی۔ آر۔ داس نے اپنے ملک کے لئے جو قربانیاں کیں تھیں ہمیں اُمید ہے کہ ملک انہیں کبھی نہ بھولے گا اور اس سوراج کو لیکر رہے گا جس کے حاصل کرنے کی کوشش میں اُنہوں نے اپنی قیمتی جان تک سے دریغ نہیں کیا۔ اُن میں گو بہت سی خوبیاں تھیں مگر سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ ایک ہی عینک سے تمام ہندستانی اقوام کو دیکھتے تھے اور وہ قومی تنگ گلیوں سے نکل کر اُس چوڑے راستہ پر برسوں سے چل رہے تھے جس پر خدا کرے ہندستان کی تمام آبادی چلنے لگے۔"

آزادی کا نصب العین

اس خط میں حکیم صاحب نے آزادیٔ ہندستان کے متعلق اپنے سیاسی عقیدہ کو صاف اور واضح اور جیسی کہ ہمیشہ اُن کی عادت تھی، نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا تھا انہوں نے لکھا تھا کہ:-

"ہم ہندوستان کی کامل آزادی کے خواہاں ہیں اور اُسے اپنا نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے اگر ہندستان کے لئے ہم کسی کم درجہ کی گورنمنٹ کو پسند کریں گے تو اُسے اپنا منتہائے مقصد قرار نہ دیں گے بلکہ

یہ سمجھیں گے کہ ہمارے مقصد کی یہ پہلی منزل ہے"۔

درحقیقت یہ اشارہ تھا اُن حالات کی طرف جو ہندستان میں پیدا ہو رہے تھے، جبکہ حکومت کوشش کر رہی تھی کہ آیندہ آئینی اصلاحات کی ترمیم اور توسیع کے وقت قوم پرستوں سے کوئی سمجھوتہ کرلے۔ حکیم صاحب کا تخیل انتہا پسند اور عمل معتدل تھا، خیالات کا وہی نقشہ مندرجہ بالا الفاظ میں موجود ہے۔ اور اُن کی تمام سیاسی زندگی اسی معیار پر جانچی جا سکتی ہے۔

مخصوص حقوق

خود مسلمانوں کے مخصوص حقوق کے متعلق جو اس وقت بہت زیادہ نزاعی مسئلہ بن چکے تھے حکیم صاحب کا نقطۂ نظر وہی تھا جو ہر خالص وطن پرست کا ہونا چاہیئے لیکن ساتھ ہی وہ زمانہ کے حالات سے بے پروا ہو کر اپنے نقطۂ نظر پر اصرار کرنا اور اُس کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دینا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اختلافی مباحث میں اکثر اپنے لئے درمیانی راستہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ یورپ سفر شروع کرنے سے پہلے بمبئی کرانیکل کے نمائندہ سے موصوف نے جو گفتگو کی تھی اُس میں فرقہ وارانہ حقوق کے متعلق اس طرح اپنے خیال کو ظاہر فرما دیا تھا کہ :-

"سوال - کسی فرقہ کو خاص حقوق دینے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب - جہاں تک اصول کا تعلق ہے خاص حقوق کا دینا درست نہیں۔ مگر دلی رنج سے اس بات

کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ صورتِ حالات
میں ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے' اکثر تعلیم یافتہ
اور شایستہ مسلمان معاہدہ لکھنؤ کو درست نہیں سمجھتے
لیکن پنجاب کے سمجھوتہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ نشستوں
کی تعداد کا فیصلہ ہونے پر نمایندگی آبادی کے لحاظ
سے ہونی چاہیے۔ لیکن قلیل التعداد جماعتوں کو نظر
انداز نہ کرنا چاہیے۔"

یہی طرزِ عمل اُن کا دوسرے قومی اور اسلامی مسائل کے ساتھ تھا۔ ممالک غیر کے اس آخری سفر کا اہم ترین حصہ وہ ہے جو مصر' شام اور فلسطین کی سیاست سے تعلق رکھتا ہے گذشتہ صفحات میں اس سفر کے کچھ اشارات بیان کئے جا چکے ہیں لیکن جو مسائل یکجا بیان کرنے کے قابل تھے اُن کا یکجا بیان کرنا ہی مناسب ہے۔

حجاز کا قضیہ جب حکیم صاحب ہندستان سے باہر تھے تو ابن سعود کے قبضۂ حجاز کا سوال مسلمانانِ ہندستان کو بہت بیچین کئے ہوئے تھا۔ اصل بحث یہ ہو رہی تھی کہ ابن سعود کی فتح کے بعد' حجاز کے مستقبل کا فیصلہ کیونکر کیا جائے۔ قبّوں کے انہدام اور مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کا ہنگامہ کچھ کچھ کم ہو چلا تھا اور یہ حقیقت ظاہر ہو چکی تھی کہ ابن سعود سے جو نازیبا واقعات منسوب کئے جاتے ہیں اُن میں مبالغہ زیادہ اور حقیقت کم ہے۔ تاہم قبّوں اور قبور کی بحث نے اتنا طول پکڑا کہ ہندستان میں دو جماعتیں برسرپیکار ہو گئیں اور مجادلہ اور مناقشہ کی انتہا یہ' ہو گئی کہ علی برادران جیسے عقیدت

کیش مریدین، مولانا عبدالباری جیسے پیر سے روگرداں ہوگئے، آپس میں چوٹیں چلنے لگیں "اور قبر پرستوں" اور "وہابیوں" کے خطاب ایک دوسرے کو دئے جانے لگے۔ ایک طرف سے اعلان ہوا کہ حج کو کوئی نہ جائے اور دوسری طرف سے کوششیں ہوئیں کہ حج کے لئے پہلے سے زیادہ لوگ جائیں۔ ہندو مسلمانوں کی جنگ ایک طرف جاری تھی اور دوسری طرف قبوں اور مقابر کا نام لے لے کر مسلمانوں میں گالی گلوج کا بازار گرم تھا۔ اسی لکھنؤ میں جہاں علی برادران کو فرنگی محل سے سند علم و فضل عطا ہوئی تھی بھرے جلسوں میں ان کی تذلیل کی گئی۔ مولانا محمد علی نے حجاز میں جمہوریت اسلامی کا ایک نظریہ اپنی قوم اور ابن سعود کے سامنے پیش کر دیا تھا اور وہی خلافت کمیٹی کا نصب العین قرار پا چکا تھا۔ ابتدائی فتوحات کے بعد خود ابن سعود نے اس تجویز پر عمل کرنے کے صریح وعدے کئے تھے سفر یورپ کے کاغذات میں حکیم صاحب کے نام ابن سعود کا ایک ایسا خط ملا جس کو لفظ بہ لفظ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

من جانب عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن الفیصل آل سعود،

ولی حضرۃ الاجل المکرم الاخ العزیز المحترم رئیس

جمعیۃ الخلافۃ فی الہند حفظہ اللہ تعالےٰ .... السلام علیکم و

رحمۃ اللہ و برکاتہ ہمیں آپ کی جماعت کے ہر فرد سے سعادت

اور یمن مدام کی توقع ہے اور یقیناً ہماری یہ سعادت

ہے کہ ہم اپنا ہاتھ آپ کے دستِ کرم کی جانب اسلام

مسلمانوں اور بلاد مطہرہ کی خدمت گذاری کے لئے

بڑھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ باہمی تعاون علی الخیر سے تمام
اسلامی جماعتوں کے لئے سعادت کے راستے کھل
جائیں گے۔ جناب والا مجھے جنگوں، فسادوں اور
شروں سے محبت نہیں میرے سامنے سکون وسلامتی
سے محبوب اور کوئی شے نہیں ہے۔ لیکن ہمارے
معزز پڑوسیوں نے پندرہ برس ہمیں جنگ و جدل
پر مجبور رکھا اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ ہماری املاک
ومقبوضات پر طمع وحرص کی وجہ سے انہوں نے
ہمیں حج اور مسجد حرام سے روک دیا جسے اللہ تعالیٰ
نے ہر شخص کے لئے یکساں بنایا ہے۔ بیت مطہر کو ہر
قسم کی مہلکات سے مملو کر دیا کہ جسے کوئی مسلمان برداشت
نہیں کر سکتا۔ ہم نے بلاد حرام اور تمام مقامات
مقدسہ کی تطہیر کی غرض سے علم جہاد بلند کیا تاکہ اُن
کو اس خاندان سے پاک کریں جس نے تفاہم اور حسن
نیت کی کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی۔ اور میں خدا کی
قسم حجاز پر نہ تسلط چاہتا ہوں نہ ملکیت۔ حجاز صرف
میرے ہاتھ میں اُس وقت تک امانت ہے جب
تک حجازی اپنے ملک کے لئے خود حاکم ووالی منتخب
کریں جو عالم اسلامی کا مطیع، اسلامی معزز جماعتوں
اور اُن قوموں کی جو اپنی عزت وحمیت کی بنا پر قابل
ذکر ہیں مثلاً ہندستانی اُن سب کا ماتحت ہو۔ وہ خطہ

جس پر ہم عالم اسلامی سے معاہدہ کرتے ہیں اور جس کی
وجہ سے ہم برسرپیکار ہیں حسب ذیل شرائط کا تابع ہے۔
(۱) حجاز حکومت کے اعتبار سے حجازیوں کے لئے ہے۔
اور عالم اسلامی کے لئے اُن کے حقوق کی بنا پہ ہے
جو ان بلاد میں انہیں حاصل ہیں۔
(۲) اشراف عالم اسلامی کے تحت میں حاکم حجاز کے
اختیارات کے بارے میں ہم ایک استفتٔے عنقریب
جاری کریں گے اور اُس کے بعد اِس کے لئے وقت
معین کریں گے اور وہ امانت جو ہمارے ہاتھ میں
ہے اس حاکم کو ان آیندہ بنیادوں پر سپرد کردیں گے۔
یہ ضروری ہے کہ سب سے بالا لوگوں کا مرجع شریعت
مطہرہ ہوگی۔ حکومت حجاز کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ
اپنے داخلی معاملات میں آزاد ہو مگر اُس کے لئے
کسی کے خلاف اعلانِ جنگ درست نہ ہوگا نیز اُس
کے لئے ایک دستور و نظام تیار کرنا ضروری ہوگا جو
ایسی باتوں کو ناممکن کردے۔ حکومتِ حجاز کسی سلطنت
سے بھی سیاسی معاہدہ نہ کرسکے گی۔ حکومتِ حجاز کسی
غیر اسلامی سلطنت سے اقتصادی معاہدہ نہ کرے گی۔
حجاز کی حدود، مالیات قضا اور اداروں کے دستور
وضوابط کی تشکیل و تعین عالم اسلامی کی منتخب شدہ
نمایندے کریں گے۔ اُن کی تعداد عالم اسلامی و عربی

میں اُن کی اکثریت کے اعتبار سے ہو گی۔ اُن ہی
میں جمعیۃ خلافت۔ جماعت اہل حدیث اور جمعیۃ علما
کے تین طرح کے نمایندے ہوں گے یہ اس کے
لئے ہماری نیت ہے اور مستقبل میں انشا اللہ اس پر
عمل کریں گے۔ ہمیں بڑی امید ہے کہ آپ اپنے مندوبین
کی روانگی میں جلدی کریں گے۔ اس موتمر کی تاریخ انعقاد
کے متعلق بیان باقی ہے جس کی اطلاع آیندہ دیں گے۔
آخر میں شانِ شایان تحیۃ و احترام قبول کیجئے۔ فقط

عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود

۸ ربیع الآخر ۱۳۴۴ھ ہجری

حکیم صاحب اس نقطۂ نظر سے متفق تھے۔ لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا اُنہوں نے نام نہاد "قبر پرستوں" "احناف" اور "وہابیوں" کے مناقشہ میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ کبھی اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ مباحث میں زبان کھولنی پسند نہ کرتے تھے۔ البتہ اگر ہندستان کے حالات نہ بدل جاتے اور ابن سعود کی مخالفت میں ہندستان کے ناسمجھ علما حد سے نہ گذر جاتے تو ہندستان میں حکیم صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد کی دو بڑی شخصیتیں ایسی ضرور موجود تھیں جو ابن سعود کے وعدوں کے مطابق حجاز کے مسئلہ کو بخوبی طے کرانے کی کوشش کر سکتی تھیں۔ لیکن ہندستان کے مولویوں اور ملاؤں نے جو ہنگامہ برپا کیا اسی نے اُن کی آواز کو بے اثر بنا دیا اور تعجب نہیں کہ کسی حد تک اسی شورش نے ابن سعود کے وعدوں کو بھی بالآخر

بے اثر بنایا۔

ترک اور خلافت

غیر ممالک کے سیاسیات کے متعلق حکیم صاحب کی عادت تھی کہ وہ بہت احتیاط کے ساتھ قدم اُٹھایا کرتے تھے۔ حجاز و مصر میں جو انقلاب رونما تھے اُن سے اہم تر انقلابات کا باعث انگورہ کا جادوگر مصطفےٰ کمال ہو رہا تھا، جس نے اپنے حیرت انگیز عزم و جرأت سے ایک دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ حجاز کے انقلاب سے پہلے، ٹرکی میں خلافت کے متعلق ایک ایسا عظیم الشان انقلاب ہو چکا تھا جس کا بہت گہرا اثر ہندستان کے مسلمانوں پر ہوا تھا۔ خلافت کی تمام تحریک کو مجلس انگورہ کی اس تجویز نے کہ منصب خلافت کو آئینی حیثیت سے بالکل ختم کر دیا جائے، متزلزل کر دیا تھا اور قدرتاً ہندستان میں اسلامی تحریک کے قائدین یہ سمجھ رہے تھے کہ مجلس انگورہ کے اس فیصلہ نے اُن کے قدموں کے نیچے سے زمین کاٹ دی ہے۔ جس مسئلہ شرعی کی بنیاد پر اُنھوں نے ہندستان میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کیا تھا اُس مسئلہ کو خود ترکوں نے ایک حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ تحریک خلافت کے حاملین کی جماعتوں میں، رنج بھی تھا تعجب بھی اور غصہ بھی۔ پرجوش "خلافتی" علانیہ مصطفےٰ کمال کو سخت سے سخت الفاظ سے یاد کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ جمیعۃ خلافت کا سارا نظام درہم برہم ہوا چاہتا تھا۔ اس پر اغیار کے یہ طعنے بھی سننے پڑتے تھے کہ جس خلافت کے لئے جانیں دی جاتی تھیں وہ انگورہ میں ایک ردی کاغذ کے پرزہ پر بھی قایم نہ رہ سکی۔ حکیم صاحب نے جو جذبات کے ہیجان سے کبھی متاثر نہ ہوتے تھے اس حالت میں بھی

جو خط مصطفےٰ کمال کو لکھا اُس کا اندازِ بیان اُن کی شخصیت کا صحیح عکس ہے۔ اُنہوں نے لکھا کہ :

"دنیا نے خلافت کو سلطنت سے جدا ایک چیز قرار دیا ہے اور اُسے صرف روحانی منصب قرار دیا ہے ۔۔ .... لیکن شریعت اسلامیہ اس کی قایل نہیں ہے اور نہ اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات بسا ضروری ہے کہ روحانی اور مادی دونوں قوتیں ایک ہی طاقت کے ہاتھ میں ہوں جس کا حق انتخاب قوم کے ہاتھ میں ہو وہ جسے چاہے منتخب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انگورہ میں مجلس ملی نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ دونوں قوتیں اکٹھی ہو جائیں یہ ایسی بات ہے جو عقل میں بھی آتی ہے اور اسلامی شریعت کے خلاف بھی نہیں ہے۔ پھر آل عثمان کا ترکی حکومت سے اخراج اور اُن کی جلا وطنی ایسے داخلی مسائل ہیں جن کو ترکی حکومت ہی حل کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا وجود ترکی قوم کے لئے خطرہ سے خالی نہ ہو خصوصاً جب اُن سے حکومت چھین لی گئی ہو اور وہ قوم کے سپرد کر دی گئی ہو کہ وہ جسے چاہے سپرد کرے۔ اسی وجہ سے ہم ان معاملات پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن عالم اسلام کے لئے اہم مجلس کی وہ قرارداد ہے جو اُس نے تنسیخ خلافت کے لئے پاس کی ہے۔ تجویز کا لفظی ترجمہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ "چونکہ خلافت جمہوریہ

وحکومت کے مفاد کے خلاف ہے اس لئے اُس کو منسوخ
کیا جاتا ہے اور اُس کے اختیاراتِ مجلس کے صدر کے سپرد
کئے جاتے ہیں تاکہ وہاں پر دو قوتیں نہ رہیں"، مجلس کی غیرت
دینی کے اعتقاد کی بنا پر ہم یہی مطلب سمجھنا چاہتے ہیں۔ دوسری
صورت یہ ہے کہ اُس نے خلافت بالکل منسوخ کر دی ہو۔
یہی وہ صورت ہے جس سے عالمِ اسلامی کو اختلاف ہے
اس لئے کہ یہ مسلمانوں کی تفریق و انتشار کا بہت بڑا سبب
ہوگا۔ اس زمانہ میں اسلام تمام زمانوں سے زیادہ اتفاق
و اتحاد کا محتاج ہے اس لئے ہم جناب سے اُمیدوار
ہیں کہ اس مسئلہ کو مجلس میں پیش فرمائے اور اُس کی توضیح
میں دوسری قرارداد ہم تک براہِ کرم پہنچائیے۔"

وہ کبھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں اس چیز کو نہ بھولتے تھے کہ غلام ہندستان خود مختار اور آزاد قوموں کو مشورہ دینے اور اُن سے پُرزور مطالبات کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اُن کی اس مندرجہ بالا تحریر کا اگر اُن آگ اور زہر سے بھرے ہوئے مضامین سے مقابلہ کیا جائے جو اُس زمانہ میں اخبارات کے کالموں میں شائع ہو رہے تھے۔ تو حکیم صاحب کی اعلیٰ اور متوازن ذہنیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ اس قسم کی تحریروں اور تقریروں میں اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے مخاطب کے وقار کو بھی محفوظ رکھتے تھے۔ اُن کے اس خط سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منصب خلافت کو کسی نہ کسی شکل میں قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور جب وہ مصر گئے تو اُنہوں نے اس سوال

پر اعیان و قائدین مصر سے مفصل گفتگو کی، لیکن اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ہندستان کی طرح مصر بھی اُن ہی غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے اور اس لئے باہمی اختلافات کا شکار رہے۔ اس کے بعد وہ خلافت کے مسئلہ پر زیادہ تر خاموش رہے اور انہوں نے کبھی پسند نہ کیا کہ مذہبی جذبات کے وہ مورچے باندھے جائیں جو خلافت اور جمعیتہ کے لوگ قایم کئے ہوئے تھے۔

اب جبکہ نہ خلافت باقی ہے نہ مسئلہ حجاز نہ موتمر اسلامی کا تخیل اور نہ جمہوریہ حجاز کا ہیولہ، اور نہ خود حکیم صاحب اس دنیا میں موجود ہیں یہ بات تو بہرحال اُن کے سوانح میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ اس زمانہ کے دو تین صحیح الخیال مسلمان لیڈروں میں حکیم صاحب ہی ایسے شخص تھے جنہوں نے اسلامی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات کے دباؤ کو نظر انداز نہیں کیا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کیا۔

ہندستان کا ناسور

اپریل ۲۵ء میں جب حکیم صاحب ہندستان سے رخصت ہوئے تھے تو وسط مارچ کے فسادات دہلی کی یاد تازہ تھی۔ اُسی کے بعد جولائی میں کلکتہ کی سرزمین پر ٹیٹیا برج کے قریب گاؤکشی کے متعلق ایک سخت فساد ہوا جس میں چند مسلمان مارے گئے پھر جب آخر ستمبر میں وہ واپس آئے تو تین دن پہلے دلّی میں ہندو مسلمانوں کے درمیان دوسرا بلوہ ہو چکا تھا اور ۹۱ ہندو اور ۳۸ مسلمان ہسپتال میں داخل کئے جا چکے تھے اور اُسی زمانہ میں علی گڑھ میں ایک سخت ہنگامہ ہو رہا تھا جس کی بنیاد رام لیلا کا جلوس تھا۔ یہ تحفہ تھا جو اُن کے وطنِ عزیز

نے جہاز سے اُترتے ہی اُن کی خدمت میں پیش کیا! اور یہ مژدہ تھا جو بمبئی کے ساحل پر اپنے اہلِ وطن کی طرف سے اُن کو ملا ہوگا!! فرانسیسیوں کے خلاف دروزکی مجاہدانہ سرفروشیوں کو دیکھ کر پھر "ہنومان کے جلوس" کے سلسلہ میں دلی کے ہندو مسلمانوں کا "گوشت خوار و دندان سگ" ہوتے دیکھنا اُن کے دل کے زخموں پر نمک کا کام دے گیا ہوگا۔ تاہم وہ اپنی مایوسیوں کو عوام کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کے عادی تھے اور وہ کبھی پسند نہ کرتے تھے کہ عوام کو مایوسی کا پیام دیا جائے۔ چنانچہ بمبئی پہنچ کر اپنے اہلِ وطن کے لئے جو پہلا

ممالک اسلامی

پیام انہوں نے بمبئی کرانیکل کے نمایندہ کے ذریعہ بھیجا وہ اُمید کی.... آواز تھا مایوسی کی صدا نہ تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔

"مجھے اُمید تھی کہ میری واپسی تک فرقہ وارانہ اختلافات بہت حد تک کم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سُن کر مجھے افسوس ہوا کہ ہندو مسلمانوں کے تنازعات اور بڑھ گئے ہیں، پھر بھی میں مایوس نہیں ہوا ہوں اور مجھے اعتماد ہے کہ میرا ملک عنقریب بھلے دن دیکھے گا۔ موجودہ اختلافات درحقیقت فرقہ وارانہ اتحاد کے ردعمل کا نتیجہ ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ یہ اختلافات اپنی طبعی موت سے جلد ختم ہو جائیں گے۔ مجھے نہ صرف ہندستان بلکہ ساری ایشیا کے بھلے دن نظر آ رہے ہیں گو معین طور نہیں بتلا سکتا کہ ایسا کب ہوگا۔ تمام اسلامی ممالک مثلاً شام، فلسطین

ومصر وغیرہ ہمارے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو سمجھنے
سے قاصر ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ گائے کا ذبیحہ، باجے
کا بجنا اور ایسی دوسری باتیں باہمی اختلاف ونفاق
کا سبب کیونکر ہیں، وہ سب کے سب ہندستان کے
مسلمانوں سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ وہ ذرا وسعت
اور کشادہ دلی سے کام لیں"۔

وسعت اور کشادہ دلی کے جو نمونے حکیم صاحب اپنے وطن میں دیکھ رہے تھے اُن کو دیکھنے کے بعد اُن ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہندستان کو یہ پیام دیتے تھے کہ "یہ بہترین موقع ہے کہ وہ آزادی کی شمع راہ بنے اور مشرق کو مغرب کی غلامی سے نجات دلائے"۔ لیکن حقایق موجودہ بھی اُن کی نظر کے سامنے تھے اور وہ اُن کے پیام کے آخری الفاظ سے واضح ہوتے تھے۔

.... یہ نہایت شرم کی بات
ہے کہ نہ صرف ہندو مسلمانوں میں اختلافات ہیں بلکہ
ہندو ہندوؤں سے لڑ رہے ہیں اور مسلمان مسلمانوں
سے جنگ کر رہے ہیں اور جب تک ہم میں سے ہر فرد
اس موقعہ کی اہمیت نہ سمجھے گا یہ حالت ختم نہ ہو گی"۔

جو کچھ اُنھوں نے ۲۵ء میں فرمایا تھا کم وبیش وہی آج ۵۰ء میں بھی کہا جا سکتا ہے حالانکہ اب ہندستان آزاد ہے اور ہم اپنی اُمیدوں کے قصر کے اندر داخل ہو گئے ہیں جو ہمارے لئے ہمارے معمار ملت گاندھی نے تعمیر کیا تھا۔ لیکن اس قصر کے دروازے پر ہم نے اُس

بڑے انسان کا خون بہا ہوا دیکھا اور اُس کے خون سے خود اہل وطن کے دامن آلودہ دیکھے۔

سفر سے واپس آنے کے بعد حکیم صاحب نے اخبار خلافت سے بھی یہی فرمایا تھا کہ

آج ضرورت تھی کہ ہندستان آزادی ایشیا کا علمبردار ہوتا مگر یہ امر کس قدر باعث شرم ہے کہ نہ صرف ہندستان کے مسلمان مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں بلکہ ہندو ہندو بھی آپس میں دست و گریبان ہیں۔

یہی درد بھری آواز انہوں نے خلافت کمیٹی کے متعلق اپنے ایک بیان میں بلند کی اور اہلِ ملک سے اپیل کی کہ وہ پھر خلافت کمیٹی کو کام کرنے کے قابل بنا دیں۔ مگر یہ پیام درحقیقت خلافت کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی ایک آخری کوشش تھی زیادہ تر تو وہ اب اسلامی اور ایشیائی ممالک کی بیداری پر اپنی قوم کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ دہلی کی جامع مسجد میں اپنے سفر کے مشاہدات بیان کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ

"بہت سے ممالک کی سیر کے بعد میں ایشیا کے بعض ملکوں میں پھرا اور شام اور لبنان و مصر وغیرہ میں آیا گیا ان تمام مقامات پر میں لوگوں سے ملا ان سے گفتگو کی اپنے خیالات اُن سے بیان کئے اُن کے خیالات خود سنے، ان سب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمام عالم اسلامی میں ایک حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ قوی اُمید ہے کہ ایشیا

ایک دن پنجۂ یورپ سے نجات پائے گا اور اس کا ایک ایک ملک آزاد ہوگا۔ لیکن یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ایسا کب ہوگا یہ آپ کی کوشش اور وقت اور سب سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر منحصر ہے۔"

اس زمانہ میں سب سے زیادہ اُن کی توجہ شام کے حالات پر مرکوز تھی۔ تمام عربی اخبارات صرف اسی غرض سے پڑھتے تھے انگریزی اخباروں میں بھی جہاں کہیں دمشق یا شام کا ذکر آتا تھا تو ایک ایک لفظ کا ترجمہ سنتے تھے۔ شروع نومبر میں انہوں نے اُن شہداء دمشق کے پسماندگاں کے لئے امداد کی اپیل کی جو فرانسیسیوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔

"میں تمام مسلمانان ہند سے درخواست کرتا ہوں کہ آیندہ ۶ر نومبر کو جمعہ کے دن شہداء دمشق کے ایصال ثواب کے لئے دعائیں کی جائیں اور دمشق کی غیر مسلح پرامن آبادی پر جس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں جو انسانیت سوز اور سفاکانہ مظالم کئے گئے ہیں اُن پر اظہار نفرت کی تجاویز پاس کی جائیں اور یہ مطالبہ کیا جائے کہ فرانسیسی حکم برداری کو فوراً منسوخ کیا جائے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ تمام مقامی ضلع اور صوبہ کی خلافت کمیٹیاں اور تمام مخلص مسلمان اس جلسہ کے انتظام اور انعقاد کی کوشش کریں گے اور مسلمانان شام کی امداد کے لئے کثیر رقوم جمع کر کے اپنا فرض ادا کریں گے۔

پھر حسب ذیل تار مجلس اقوام کے نام روانہ کیا:۔
مسلمانانِ ہند نے ان ہولناک کارروائیوں کا حال جو شام میں اور بالخصوص دمشق میں کی گئی ہیں انتہائی غم وغصہ کے ساتھ سنا ہے اور جہاں وہ غصہ کے ساتھ اس حکمبردار سلطنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جو ایسے مظالم اور ایسے غیرانسانی برتاؤ کی ذمہ دار ہے وہاں لیگ اقوام سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فوراً اس عہد تخویف کا خاتمہ کر دے جو اس وقت شام میں موجود ہے۔ اگر لیگ دنیا کے امن و سکون کا آلہ بننا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ علاقہ جات مندوبہ کے لوگوں کو پھر آزادی دلائے۔ کافی غور کے بعد ہماری یہ رائے قایم ہوئی ہے کہ ان روزروز کی ہولناکیوں کا اعادہ اُس وقت تک بند نہیں ہوسکتا جب تک کہ حکم برداریوں کی رسم ہی کو بالکل ختم نہ کیا جائے۔ جیسے اندیشہ ہے کہ وہ انسانی خون کا ایک ہمیشہ بہنے والا چشمہ جاری رکھے گی اور جو ایشیا میں مستقل اور دائمی جنگ کا بیج بو رہی ہے ــــ مسلمانان دہلی نے بھی جلسہ کرکے مجھ سے درخواست کی ہے کہ اس قسم کا احتجاج اور مطالبہ ان کی جانب سے کروں۔ براہ کرم لیگ کی فوری توجہ اس مراسلہ کی جانب منعطف کیجئے اور اس کے ممبروں میں اس کی اشاعت کرادیجئے۔"

اسی طرح ایک ایک تار غازی مصطفٰے کمال، سلطان فواد، امیر امان اللہ خاں، رضا شاہ، اور ابن سعود کو بھیجا اور ساتھ ہی مصری اخبارات نیز مصری عمائدین پاشا زاغلول۔ حافظ بک رمضان شیخ ازہر وغیرہ سے بذریعہ تار خواہش کی کہ

"تمام جماعتوں کو متحد کیجئے اور مصر کو بیدار کر دیجے تاکہ اپنے شامی پڑوسیوں اور بھائیوں کو فیاضانہ مالی امداد دیکر اور حکم برداری کے خلاف، جس کے لازمی نتیجے ایسے ہی سخت ہوتے ہیں، احتجاج کر کے مصیبت سے نجات دلائے۔ دنیائے اسلام اور تمام مشرق کا اتحاد ہی ایک ایسی چیز ہے جو ایسے ظالمانہ طرز حکومت کا خاتمہ کر سکتا ہے"

چونکہ شام کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے اس لئے اس باب میں بہت زیادہ بے چین تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان میں اس مسئلہ کے متعلق ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک آگ لگ جائے۔ اور اسلامی اقوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانانِ ہندستان اسلامی مصائب سے کس درجہ متاثر ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک مفصل خط مہاتما جی کو لکھا جس کے بعض اقتباسات نقل کرنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :-

"جنوبی شام میں جو دروزیوں کا ملک ہے، اور جہاں اس مظلوم قوم نے دولت منتدبہ یعنی فرانس کے خلاف مسلح مدافعت جاری کر رکھی ہے، حال میں

جو واقعات رونما ہوئے ہیں اُن سے فرانسیسی حکام کے خوفناک مظالم پر روشنی پڑتی ہے۔ دو روز ہوئے کہ سید جمال الدین الحسینی نے جو لجنتہ التنفیذیہ کے جو فلسطین کی سب سے زیادہ ہردالعزیز اور باا ثر جماعت ہے سکریٹری ہیں ایک تار بھیجا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر دمشق فرانسیسی گولہ باری سے بہت بری طرح تباہ ہوا ہے۔ اور اموات کی تعداد بہت زیادہ ہے یعنی بے اندازہ ہے' اگرچہ انگریزی اخبارات میں جو حالات شائع ہوتے رہے ہیں اُن سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شام میں حالات اچھے نہیں ہیں لیکن فلسطین کے اس تار سے اور رواٹیر کے قاہرہ کے تار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی انتہائی مظالم اور خلاف انسانیت کارروائیاں دروزیوں کے ملک اور دمشق پر کر رہے ہیں۔

حال کی تباہ کاریوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو شام کی سیاحت کے دوران میں ہماری نظر سے ایسے واقعات گذرے ہیں جن سے فرانسیسیوں کی سنگدلی' اور شام کے علاقہ مندوبہ کے لوگوں کی ابتدائی انسانی حقوق کی جانب سے تغافل اور بے پروائی ثابت ہوتی تھی۔

اپنے مشاہدات ہم نے اردو اخبارات میں شائع

کرا دیئے ہیں مگر صرف اس لئے کہ آپ کو ہمدرد کے اردو کے بیانات پڑھنے کی دقت نہ ہو ہم شام کی صورت حال کے متعلق مختصراً بعض بہت ہی نمایاں واقعات کا تذکرہ کئے دیتے ہیں۔

جب لیگ اقوام نے شام کی حکم برداری فرانس کو سپرد کی تو حکومت فرانس اور شام کے فرانسیسی ہائی کمشنر نے عام اعلان کیا کہ جس میں اہل شام کو اُن کے اندرونی معاملات کے متعلق کامل خود مختاری دی گئی۔ شام کو چند خود مختار صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا جن میں سے ہر ایک میں لوگوں کا منتخب کردہ ایک گورنر ہو اور ایک جمعیت شوریٰ ہو جو لوگوں کی نمائندگی کرے اور جسے لوگوں نے خود منتخب کیا ہو صوبہ لبنان اور صوبہ دمشق میں تو اس وعدے کی بظاہر کسی حد تک پابندی کی گئی۔ مگر حوران اور دروز کے صوبوں کو نہ خود مختاری دی گئی نہ جمعیۃ نہ اپنا انتخاب کردہ صدر بلکہ ایک فرانسیسی افسر کیپٹن کارلج ای کو زبردستی دروزیوں کے سر پر متعین کر دیا۔ اور جب انہوں نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا تو ان کے وفد کی توہین کی گئی۔ اُن کے اکابر قوم کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔ اور اُن کی مستورات کی تذلیل کی گئی۔"

اس کے بعد حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے خط میں ان تمام مظالم کا تذکرہ ہے جو فرانس نے اہل دمشق اور اہل دروز پر کئے تھے۔

اس خط کے آخری الفاظ یہ تھے کہ :۔

"ہم آپ کو یہ حالات اس لئے لکھ رہے ہیں کہ آپ کے دل میں ان ایشیائی بھائیوں کے لئے جذبہ ہمدردی ظاہر ہو اور کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ لیگ اقوام کو جس نے فرانس کو حکم برداری عطا کی ہے ایک تار روانہ کریں اور دوسری کانگریس کمیٹیوں کو بھی اسی قسم کی کارروائی کرنے کی ہدایت فرمائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان کی موجودہ صورت حالات ایسے کاموں کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن ایک ہندستانی ایک مسلمان اور ایک ایشیائی کی حیثیت میں کافی غور کے بعد ہم نے یہ رائے قایم کی ہے کہ ہمیں ایشیا کی تمام مظلوم اقوام کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہئے۔ اور اُن سے دوستانہ تعلقات بڑھانے چاہئیں جو ہمارے اور اُن کے لئے مفید ہوگا۔"

یہ عکس درحقیقت اُس جذبہ کا واضح عکس ہے جو اسلامی اور ایشیائی ممالک کے اتحاد کے متعلق حکیم صاحب کے دل میں متحرک تھا اور اسی طرح مہاتما جی نے جو جواب دیا ہے اس میں اُن کے احساسات کا نقشہ نظر آتا ہے۔ مہاتما جی نے ینگ انڈیا میں لکھا کہ

"مجھے کوئی ذریعہ ایسا نظر نہیں آتا کہ اس مشورہ کو قبول کروں اور کانگریس کی طرف سے لیگ اقوام

کو کوئی تار بھیجوں اس لئے میں نے حسب ذیل جواب اس خط کا بھجدیا ہے۔

آپ کا اور حکیم صاحب کا خط ملا۔ کانگریس کے صدر کے لیگ اقوام کو تار بھیجنے سے کیا حاصل ہوگا؟ میں اپنے آپ کو ایک ایسا شیر خیال کرتا ہوں جو کٹہرے میں قید ہو، اور فرق صرف اس قدر ہے کہ شیر غصہ سے منہ میں کف بھرلاتا ہے، دہاڑتا ہے اور دانت کٹکٹاتا ہے اور لوہے کی سلاخوں پر زور زور سے پنجہ مار کر آزاد ہو جانے کی فضول کوشش کرتا ہے اور میں حدود و قیود سے آگاہ ہوں اور غصہ دکھانے سے احتراز کرتا ہوں۔ اگر میرے پاس کوئی طاقت ہوتی تو میں آپ کا مجوزہ تار فوراً بھجدیتا۔ وہ باتیں جو میں اپنے اخبار ینگ انڈیا میں شائع کرنے سے چھوڑ دیتا ہوں میرے دل کی گہرائیوں میں مدفون ہیں اور وہ ان سے بہت زیادہ گران وزن ہیں جنہیں میں شائع کر دیتا ہوں لیکن غیر مرئی طاقت (خدا سے مراد ہے) کے حضور میں اُن کی اشاعت سے باز نہیں رہتا۔ جب میں اُس افق پر نگاہ ڈالتا ہوں جو ہمارے چاروں طرف ہے تو میرا دل نڈھال ہو جاتا ہے۔ اور جب میں اُس کمزور سی آواز پر کان لگاتا ہوں جو اندر سے آتی ہے تو میری اُمیدیں بندھ

جاتی ہیں اور باوجود اس بھڑکتی ہوئی آگ کے جو میرے چاروں طرف ہے میں مسکرانے لگتا ہوں کبھی قابل نہ ہونے کا اعلان خود اپنی زبان سے کرنے سے تو خدا کے لئے مجھے بچائے ....

لیکن ایک اور سب سے اچھا کام جو میں کر سکتا تھا یہ تھا کہ اس قابلِ قدر خط کو اور اپنے جواب کو شائع کر دوں۔ جن درخواستوں کی کمک پر اخلاقی، یا مادی کسی قسم کی بھی طاقت نہ ہو، اُن پر میرا عقیدہ نہیں ہے۔

اخلاقی قوت تو اس طرح مہیا ہو جاتی ہے کہ درخواست کرنے والے کسی کام کے کرنے کا عزم مصمم کر لیں۔ اور اپنی درخواست کو پُراثر بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کریں یہ ایک ایسا ابتدائی اصول ہے کہ جس سے بچے تک واقف ہیں۔ وہ روٹی نہیں کھاتے وہ رو دیا کرتے ہیں بلکہ اگر وہ شریر ہیں تو اپنی ماؤں کو مارنے بھی لگتے ہیں اگر وہ ان کے مطالبات پورے نہ کرے تا وقتیکہ ہم اس اصول کو نہ سمجھتے ہوں اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، اُس وقت تک ہم اگر کانگریس کو اور خود اپنے آپ کو اور زیادہ نقصان نہ پہنچائیں تب بھی کم از کم دوسروں کے تمسخر کے لئے تو ضرور ہی وقف کر دیں گے۔

شریر بنا تو اگر ہم چاہیں تب بھی نہیں بن سکتے۔ ہم دکھ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسی ہماری خواہش ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم بحیثیت ہندستانی ہونے کے، ہندو، مسلمان، عیسائی، اور پارسی سب، بلکہ تمام ایشیائی اس تذلیل، ظلم، یا ڈائر شاہی جور وجفا کے مقابلہ میں جو شام میں ہوئی یا اس کا کچھ اور نام رکھ کر اس کے مقابلہ میں اپنی عاجزی اور بے چارگی کو محسوس کریں۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کا صحیح احساس ممکن ہے کہ ہمیں ان جانوروں ہی کی نقل اتارنا سکھا دے جو طوفانی موسم کے وقت ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تاکہ ایک سے دوسرے کو گرمی پہنچے اور ہمت بھی بندھی رہے۔ یہ جانور کبھی ایسا نہیں کرتے کہ موسم کے دیوتا سے درخواست کریں کہ اپنے غصہ کو کم کردے وہ صرف اتنا ہی کرتے ہیں کہ اس غصہ کے بالمقابل اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں۔

اور آج ہم ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور خلیج روز بروز وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ ہم آج تک اور تو اور چرخے کا بھی مطلب نہیں سمجھے ہیں، اور جو لوگ سمجھ گئے ہیں وہ سوت نہ کاتنے اور کھدر نہ پہننے کے لئے سو بہانے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف طوفانی بادل جمع ہو رہے ہیں اور ہم بجائے

اس کے کہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر گرمی حاصل کریں اکیلے کھڑے کانپنے کو ترجیح دیتے ہیں، یا طوفان کے دیوتا سے درخواست کرنے کو کہ وہ ذرا اپنا ہاتھ روک لے۔ اگر مجھ میں یہ قدرت نہیں ہے کہ میں ہندوؤں، اور مسلمانوں، میں اتحاد کرا سکوں یا لوگوں کو چرخہ چلانے کی ترغیب دے سکوں تو اتنی عقل تو ضرور ہے کہ رحم کی درخواستوں پر دستخط کرنے سے باز رہوں۔

اور پھر یہ لیگ اقوام کیا ہے؟ کیا فی الحقیقت وہ صرف انگلستان اور فرانس کا دوسرا نام نہیں ہے کیا اور طاقتیں جو اس میں شامل ہیں وہ کسی شمار میں ہیں؟ کیا اسی فرانس سے جس نے اپنے نصب العین کے طغرا یعنی "اخوت، مساوات اور انصاف" کی خلاف ورزی کی ہے۔ درخواست کرنا کسی طرح بھی کار آمد ہو سکتا ہے؟ اس نے جرمنی کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس کے اور رعیت کے درمیان شاید ہی کوئی اخوت ہے اور اس کا مساوات کا اصول شام میں اسی کے پیروں کے نیچے کچلا جا رہا ہے اگر انگلستان سے درخواست کرنا ہے تو لیگ اقوام تک جانے کی کیا ضرورت ہے وہ تو یہیں بیٹھے بیٹھے ہم سے بہت زیادہ قریب ہے۔ انگلستان تو سوائے اس مختصر مدت کے جب

کہ وہ دہلی میں آجاتا ہے ہر وقت شملہ کی چوٹیوں پر مسلط ہے لیکن انگلستان سے ایسی درخواست کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اگسٹس کے خلاف قیصر سے التجا کرنا! آیئے تو پھر حقیقت اور صداقت کو اس کے لباس عریانی میں دیکھیں اور قوم سے اپنا فرض ادا کرنے کی درخواست کرنا سیکھیں۔ مظالم شام کا انسداد ہندستان کے ہاتھ میں ہے، اگر ہم اپنی اس بڑائی کی اہمیت محسوس کرنے سے قاصر ہیں تو پھر ہمیں اپنی کمزوری اور چھوٹائی کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ رہنا چاہیئے۔ لیکن خواہ مخواہ کیوں چھوٹے بن جائیں۔ ہمیں کم از کم ایک کام مکمل طریقہ پر کرنا چاہیئے۔ یا جس طرح ہمارے چوپائے بھائی کیا کرتے ہیں۔ لڑائی کو لڑتے لڑتے اس کے تلخ اور ناخوشگوار انجام تک پہنچا دیں۔ یا پھر انسانوں کی طرح ہمیں خود بھی سبق سیکھ لینا چاہیئے اور ایک ایسے وسیع پیمانے پر موالات باہمی قایم کر کے جس کی مثال دنیا میں نہ ملے ہمیں دوسروں کو یہ سکھا دینا چاہیئے کہ اپنے سے زیادہ کمزوروں کے ملکوں میں تہذیب لیجانا نہ صرف فضول بلکہ گناہ ہے اور کروروں انسانوں کے درمیان ایسی موالات صرف چرخے ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے۔

(ینگ انڈیا)

کٹھیرے میں بند شیر'' کا یہ جواب بلاشبہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک کٹھیرے میں بند شیر'' کا ہونا چاہئے۔ یہ تحریر اُس زمانہ کے حالات اور مہاتما گاندھی کے تاثرات کا ایک اچھا عکس ہے اسی لئے اُسے پورا پورا نقل کیا گیا۔ اُس وقت اور ہمیشہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا تصور مہاتما جی کی پرخلوص روح میں سمایا رہا اور ایشیائی ممالک کے مصائب میں مدد کرنے کا ذریعہ بھی بغیر ہندو مسلم اتحاد کے اُن کی نظر میں کچھ نہ تھا۔ وہ تو یہ عاجزانہ حیثیت بھی اختیار کرنے پر امادہ تھے کہ

> اپنی عاجزی اور درماندگی کا احساس ممکن ہے کہ ہمیں اُن جانوروں ہی کی نقل اُتارنا سکھا دے جو طوفانی موسم کے وقت ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ تاکہ ایک دوسرے کو گرمی پہنچے۔

اس معاملہ میں حکیم صاحب کے نقطہ نظر کا ایک پہلو ایسا تھا جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ تھا کہ غالباً حکیم صاحب چاہتے تھے کہ خلافت کی تحریک کی طرح مظالم شام کے خلاف ہندستان میں پھر کوئی متحدہ محاذ پیدا کیا جا سکے۔ لیکن بہرحال مہاتما جی فرقہ واری اتحاد سے اُس وقت بہت ہی مایوس تھے۔ چنانچہ نومبر میں جب مولانا ابوالکلام نے اخبارات میں اس مسئلہ پر اپنا ایک بیان شائع کرایا اور مہاتما جی سے درخواست کی کہ وہ بھی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر کے ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر پھر غور کریں تو مہاتما جی نے مولانا کو بھی مایوسی کے اُسی رنگ میں جواب دیا جو حکیم صاحب کے خط کے جواب میں ظاہر ہوا تھا۔ اُنھوں نے لکھا کہ :-

مجھے مایوسی اس بات کی ہے کہ کانگریس نہ اس مسئلہ کا
حل سوچ سکتی ہے اور نہ اُس پر عمل کر سکتی ہے۔ ہمیں
حقیقت کو خود اپنی نظروں سے بھی اوجھل نہیں کرنا چاہئے۔
کانگریس میں آج ان لڑنے والوں کی کوئی نمائندگی نہیں،
جو ہر دو قوم میں موجود ہیں جب تک کہ وہ لوگ جو لڑنے
والوں کے پیچھے ہیں، کانگریس کے اثر میں نہ آجائیں اور
جب تک اخبار کے وہ اڈیٹران جو اختلافات پیدا کرتے
رہتے ہیں، یا تو اتحاد کے قائل نہ ہو جائیں یا پھر اُن کا
کوئی اثر باقی نہ ہو، اس وقت تک کیا کانگریس اتحاد کیلئے کچھ
بھی مفید کام کر سکتی ہے؟ میرے تلخ تجربہ نے مجھے یہ سکھایا
ہے کہ جو لوگ اتحاد کے نام لیوا ہیں، وہی نفاق کے بانی
ہیں۔ جو فضا آج کل ہمارے گرد و پیش ہے وہ بالکل ویسی
ہی فضا ہے جیسی گذشتہ جنگ سے پیشتر یورپ میں تھی۔
اخبارات کبھی سچ بات نہیں بتاتے تھے مختلف قوموں کے
نمائندوں نے جھوٹ بولنے کو ایک فن بنا لیا تھا۔ اُس وقت
جنگ کی حالت میں ہر چیز جائز سمجھی جاتی تھی بعینہٖ یہی حالت
آج ہماری ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلمانوں کے درمیان
جو تعلقات باقی ہیں، وہ ایک جنگ کا نمونہ پیش کرتے
ہیں ہم اپنے اپنے مذہبوں کی حفاظت کے لئے جھوٹ
اور فریب کا ارتکاب کر سکتے ہیں، یہ بات میں نے ایک
شخص سے نہیں بہتیروں کی زبان سے سُنی ہے کہ ہندو مسلم

اتحاد ہو کے رہے گا" اور میں مانتا ہوں کہ موجودہ حالت سے مایوسی کی ذرّہ برابر بھی کوئی وجہ نہیں۔

مگر مجھے افسوس ہے کہ میں مولانا صاحب کی اپیل کا اس سے زیادہ حوصلہ افزا جواب نہیں دے سکتا، وہ مطمئن رہیں کہ اُن کی طرح میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا ویسا ہی خواہاں ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جبکہ میں اس کے حصول میں اُن کے طریقہ کار پر یقین نہیں کر سکتا؟ میں اس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ میں ہر ایک پر خلوص کوشش کی کامیابی کے لئے جو اس مقصد میں کی جائے، دعا کروں گا۔ میں نے زیادہ کہنا جو بند کر دیا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اتحاد میرے عقیدے کا جزو نہیں رہا، میں پھر اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اس میں ایمان ہے جو کبھی زائل نہ ہوگا۔ لیکن جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میرا دخل دینا زخم پر بجائے مرہم کے نمک کا کام کر رہا ہے تو میں دانشمندی اسی میں سمجھتا ہوں کہ علیحدہ چپ چاپ کھڑا رہوں"

جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوگا "چپ چاپ" کھڑے رہنے کے اصول کو خود مہاتما جی زیادہ عرصہ تک نہ نبھا سکے وہ جو ایک روشنی اُن کے دل میں تھی وہ زیادہ عرصہ تک فانوس کے اندر بند نہ رہ سکی۔ اُن ہی کی طرح مایوس حکیم صاحب بھی تھے، افسردہ خاطر بھی تھے، رنجیدہ بھی تھے، مگر مسلم اتحاد کے متعلق کسی حلقہ میں بھی کوئی کام شروع ہو.... وہ شریک

ہو جاتے تھے اور کام کرنے سے کسی طرح نہ تھکتے تھے۔ جب ایک دفعہ کسی چیز کو حاصل کرنا ضروری سمجھ لیتے تھے تو پھر "علیحدہ چپ چاپ" کھڑے رہنے کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ ۔۔۔۔۔۔۔ جہاتما جی کی خاموشی بھی عارضی ہے۔

مظلومین دمشق کی امداد کے لئے حکیم صاحب نے پوری قوت سے کام شروع کیا اور فراہمی سرمایہ کے لئے ایک مرکزی کمیٹی بنا دی۔ وقتاً فوقتاً معقول رقم مظلومین کو پہنچتی رہیں۔ اُنہوں نے اس کمیٹی میں ہر سیاسی خیال اور رائے کے لوگوں کو شریک کیا۔ اور اس معاملہ کی اہمیت سے اپنے اہل وطن کو پوری طرح باخبر کر دیا۔ اس قسم کے کاموں سے کسی فوری نتیجہ کے پیدا ہونے کی اُمید عبث ہے، لیکن ایسی کوششوں کے کچھ نامعلوم نقوش قوموں کے اجتماعی دماغ پر ثبت ہو جاتے ہیں جو آج نہیں تو بیس برس بعد، دُنیا کی تاریخ میں نظر افروز ہوتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے محسوسات کو ہندستان سے قریب تر کر دینے کا فرض جس طرح اجمل خاں نے انجام دیا کسی دوسرے مسلمان لیڈر سے ممکن نہ تھا۔ اور جو کامیابی ان کو ہوئی کسی دوسرے شخص کو حاصل نہ ہو سکتی تھی اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہی تھی کہ حکیم صاحب کا عربی زبان سے اس قدر زیادہ واقف ہونا اور عربی زبان کو عربوں کی طرح لکھنا اور بولنا اسلامی ممالک میں اُن کی شخصیت کو اعیانِ جمہور سے زیادہ قریب کر دیتا تھا اور اپنی اس مخصوص قابلیت سے اُنہوں نے مسئلہ اتحاد ایشیا اور ممالک اسلامی میں بہت زیادہ کام لیا۔

ایک وقفہ وسط اکتوبر میں رام پور تشریف لے گئے اور دہلی

آکر پھر مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے آخر اکتوبر میں وفد خلافت کے ممبران جن میں مولانا ظفر علی خاں صاحب، مسٹر شعیب قریشی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد عرفان شامل تھے، حجاز کو روانہ ہوئے۔

۲۹ر اکتوبر کو جامعہ ملیہ کی سالگرہ کے موقعہ پر اور پھر ۱۲ر نومبر کو ہمدرد و کامریڈ کی سالگرہ میں شریک ہونے کے بعد اور ۱۳ر نومبر کو مولانا شوکت علی صاحب کے نواسہ کو بسم اللہ پڑھا کر دسمبر کا زیادہ حصہ مظلومین دمشق کی اعانت کے انتظامات میں گذارا۔ فراہمی چندہ کی جو کمیٹی بنائی گئی تھی اُس کے صدر نواب ذوالفقار علی خاں صاحب قرار پائے اور خود حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری اس کمیٹی کے سکرٹری تھے۔

حکیم صاحب نے اب اپنی صحت کی بہتری سے مایوس ہو کر یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بڑے بڑے جلسوں اور ہنگاموں سے علیحدہ رہیں گے چنانچہ سفر یورپ کے بعد آخر ۲۵ئ تک وہ شاید ہی کسی بڑے جلسہ میں شریک ہوئے۔ کانپور کی کانگریس میں جو آخر دسمبر ۲۵ئ میں ہوئی وہ شریک نہ تھے تاہم اُن کا ایک پیام صدر کانگریس نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا تھا اور وہ بھی محض رسمی تہنیت اور اظہار ہمدردی سے زیادہ کچھ نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ آخر ۲۵ئ میں اور واپسی سفر یورپ کے بعد وہ اپنی زندگی کے خطرات سے بخوبی آشنا ہو چکے تھے اور حتی الامکان سکون و آرام ڈھونڈتے تھے۔ صرف ایک چیز ایسی تھی، جو اُن کی صحت کے لئے سب سے زیادہ مضر تھی مگر وہ اُس کو کسی حال میں چھوڑ نہ سکتے تھے جو اُن کا مطب تھا، جس کا دروازہ اُنہوں نے آخر دم تک بند کرنا گوارا نہ کیا یہ خدمت خلق خدا اُن کا آبائی راستہ تھا جس کے ترک کرنے کا وہ نام

بھی لینا پسند نہ فرماتے تھے!

وسط دسمبر میں اطلاع ملی کہ آخرکار نجدیوں نے جدہ کو فتح کرلیا اور امیر علی اپنی امیدوں سے مایوس ہوکر بھاگ گیا۔ ستمبر میں مدینہ فتح ہوچکا تھا اور اس طرح ۲۵ء اسلامی دنیا کے سب سے اہم واقعہ پر ختم ہوا یعنی حجاز کی کامل تسخیر اور جدہ کی فتح کے بعد نجدی فاتح کے حق میں مرکز اسلام کا انقلاب حکومت اس وقت تک ہندوستان میں احناف اور وہابیوں کی تفریق موجود تھی۔ لیکن بہر حال حامیان ابن سعود کا اثر زیادہ تھا اور عام فضا، ابن سعود کے موافق تھی لیکن ۲۶ء مسئلہ حجاز کا ایک نیا دور اپنے ساتھ لا رہا تھا۔

مسئلہ حجاز کی ایک اور کروٹ

مسئلہ حجاز میں اختلافات کے دو بنیادی پتھر تھے ایک ملوکیت اور ایک جمہوریت، اب تک یہ خیال تھا کہ موتمر کا انعقاد اس بحث کا فیصلہ کردے گا۔

ابن سعود کے صاف و صریح وعدوں کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جاچکا ہے۔ ان وعدوں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا جنوری ۲۶ء میں سلطان کا دعوت نامہ ہندوستان میں وصول ہوا جس میں ایک دفعہ پھر ان وعدوں اور اعلانوں کی صراحت کے ساتھ تجدید کی گئی تھی۔

دعوت نامہ وصول ہونے سے پہلے ہی ہندوستان میں سلطان ابن سعود کے شاہ حجاز منتخب ہونے کا اعلان ہوچکا تھا اور مرکزی خلافت کمیٹی ۱۹ جنوری کو تار دے چکی تھی کہ:۔

> "اخباروں میں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ حجازیوں نے آپ کو بادشاہ منتخب کرلیا اور آپ نے اسے منظور کرلیا۔ ہم امید کرتے تھے کہ حجاز کی حکومت کا فیصلہ آیندہ آنے والی موتمر

اسلامی میں جیسے خود آپ نے مدعو کیا ہے ہوگا ہم بے چینی کے
ساتھ اس غیر متوقع کارروائی کے متعلق مستند اطلاع کے
منتظر ہیں کیونکہ اس سے انتشار رونما ہے!!

آخر جنوری میں ابن سعود نے اپنی ملوکیت کی بحث کو صدر جمیعۃ علماء
کے نام ایک تار میں بالکل صاف اور طے کر دیا یعنی اُنھوں نے لکھا کہ:-

میں ہر وقت عالم اسلامی کے مشورے ان تمام امور میں
قبول کرنے کو طیار رہوں جو حجاج و زائرین کی راحت و
آسائش اور حجاز میں اعمال خیر کے اجراء سے تعلق رکھتے
ہیں - رہا اہل حجاز کی جانب سے میری بادشاہت کا اعلان
تو اس کے متعلق میری دلی خواہش یہی تھی کہ یہ ابھی ملتوی
رہے - لیکن ہمیں اس کے لئے مجبور و مضطر کر دیا گیا - تمام
اہل حجاز نے بیک آواز ہم سے ان کی بیعت قبول کرنے کا
تقاضا کیا - پھر بھی ہم نے ان سے اس وقت تک التوا
کی خواہش کی کہ تمام مسلمان اس معاملہ میں کوئی اجتماعی
فیصلہ کریں - اہل حجاز نے جواب میں یہ کہا کہ آپ ہمیں
اس بات کی آزادی عطا فرما چکے ہیں کہ ہم اپنا حاکم خود
منتخب کریں اور یہ ہمارا ایسا حق ہے کہ اس میں کوئی
ہمارا شریک نہیں اور ہم آپ کی جگہ دوسرے کو نہیں
چاہتے باوجود اس کے ہم نے (قبول بیعت میں) توقف
کیا - مگر جب اہل نجد کو ہمارے توقف کی اطلاع ہوئی تو
اُنھوں نے میرے اوپر ایک قیامت قائم کر دی اور

بالاعلان مجھ سے کہا کہ ہم حجاز میں صرف اس لئے لڑے ہیں کہ حجاز کی خود مختاری قائم رہے اور کسی اجنبی کو اس میں مداخلت کا موقعہ نہ ملے اور خدا تعالےٰ کا کلمہ بلند ہو اور ان دیار مقدسہ میں خدا تعالےٰ کی کتاب اور سنت نبویہ (علی صاحبہا الصلاۃ و السلام) کے موافق عمل درآمد کیا جاوے اور راستے پر امن ہو جائیں اور حجاز میں الحاد باقی نہ رہے اور یہی وہ امور ہیں جن کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اب تمہارا قبول بیعت میں توقف کرنا ہمارے لئے اس اعتقاد کا موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ تمہاری لڑائی اپنے اغراض کے لئے تھی اور تم حجاز کی خودمختاری نہیں چاہتے۔ اگر تم نے (اپنا وعدہ پورا) نہ کیا تو تم معصیت کے مرتکب ہو گے اور خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔ پس ایسے تنگ و دشوار موقعہ میں جس پر اس وقت حجاز کا امن اور نظام کی درستی موقوف تھی میرے لئے بیعت قبول کرنے کے سوا چارۂ کار نہ تھا ورنہ ایسا فتنہ قائم ہو جاتا جس کے نتائج کا اندازہ مشکل ہے اس لئے میں نے خدا پر بھروسہ کرکے بیعت قبول کرلی اور میں اپنے عہد پر قائم رہوں گا کہ مسلمانوں کے ان دیار مقدسہ میں جو حقوق مشروعہ ہیں ان کی رعایت کروں اور خدا تعالےٰ توفیق دینے والا ہے اور بغیر خدا تعالےٰ کی مدد کے کوئی قوت و طاقت نہیں۔ والسلام علیکم

(شاہ حجاز و سلطان نجد عبدالعزیز)

اُس طرف سے یہ ایک مختتم چیز تھی لیکن اس طرف یہ کچھ اور زیادہ ہیجان کا باعث ہوئی اور فروری شروع ہوتے ہوتے ہندی مسلمانوں کی دو مستقل جماعتیں ایک دوسرے کے سامنے آگئیں یعنی ایک وہ جو سلطان نجد و حجاز کی سلطانی کی حامی تھی اور ایک وہ جو حجاز میں جمہوریت قائم کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ حالانکہ ہندوستانی غلاموں کی دونوں جماعتیں یکساں بے اثر اور بے معنی تھیں۔ نہ ملوکیت کے حامی سلطان نجد کے تخت و تاج کے محافظ ہوسکتے تھے نہ جمہوریت کے داعی حجاز میں اپنا منشا پورا کرنے کا کوئی ذریعہ اختیار کرسکتے تھے۔ یہ سب شور و غل ایک حیلۂ افتراق و انتشار تھا۔ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران، بخارا و نجد و حجاز کے متعلق اس قوم کے فیصلے جو خود اپنے وطن میں اپنے معاملات کا تصفیہ نہ کرسکی تھی کس قدر تمسخر انگیز تھے بہرحال افتراق بین المسلمین کا یہ ایک نیا مورچہ زیادہ مضبوط کرلیا گیا۔

طبیہ کالج

وسط فروری میں مجلس خلافت کا وہ وفد واپس آیا جو حجاز حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ حکیم صاحب اس زمانہ میں طبیہ کالج کے سالانہ جلسوں کے اہتمام میں مصروف تھے ۱۲ فروری کو ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بھرتپور نے جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت فرمائی اور حاضرین کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے نمایاں اشخاص، سیاسی اور سرکاری اس موقعہ پر شریک تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے آخری زمانہ میں طبیہ کالج کو قوم اور ملک کی بڑھتی ہوئی بیداری کے دوش بدوش چلانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور طب قدیم کو زمانہ کے قدم بقدم چلانے کے لئے ان کی با اثر شخصیت نے ہر خیال کے لوگوں کو کالج کی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ مسٹر پٹیل صدر اسمبلی، پنڈت مدن موہن مالوی مسز نائیڈو

اور مسز بیسنٹ کے پہلو بہ پہلو وہ سر حبیب اللہ، سر چارلس انس مسٹر ٹامسن چیف کمشنر کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرسکتے تھے اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ طب قدیم کی تحریکوں کو سرکاری اور غیر سرکاری آویزش سے بالاتر رکھنا کامیابی کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ زنانہ مدرسہ میں ہز ہائینس مہارانی بڑودہ نے انعامات تقسیم فرمائے۔ جو ایڈریس اس موقعہ پر مہارانی صاحبہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس میں حکیم صاحب نے دردناک الفاظ میں ہندستانی عورتوں کی مجبوری و معذوری کا ذکر فرمایا۔ حکیم صاحب طبقہ نسواں کی اصلاح و ترقی کے متعلق بہت وسیع خیالات رکھتے تھے حتیٰ کہ وہ پردہ کی ناروا سختی کو بھی ہندستانی عورتوں کی پستی کا بڑا سبب سمجھتے تھے۔ وضع قدیم کی تمام خوبیوں کے ساتھ ان کا مطمح نظر تعلیم و تمدن جدیدہ کی بہت بلند سطح پر تھا۔

دہلی اور لکھنؤ کی رقابت

طبیہ کانفرنس کے موقعہ پر جس کے اجلاس ۶، ۷ اور ۸ مارچ کو منعقد ہوئے حکیم صاحب نے باوجودیکہ وہ دوسرے ضروری کاموں میں مصروف تھے تاہم انہوں نے کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں ایک مختصر تقریر کرنے کی ضرورت غالباً اس وجہ سے محسوس کی کہ صوبجات متحدہ میں ایک طبیہ کالج کے قائم کرنیکا مسئلہ دہلی اور لکھنؤ کے اطبا میں باعث اختلاف ہو گیا تھا اور حکیم صاحب چاہتے تھے کہ اس کا فیصلہ اسی رواداری اور غیر جنبہ واری کے ساتھ کردیں جو ان کی فطرت کا تقاضا تھا۔ اپنی تحریک کے متعلق شروع ہی سے ان کو لکھنؤ اور دہلی کے سوال سے مقابلہ کرنا پڑا اور اطبا لکھنؤ اور دہلی کے رقیبانہ آویزش سے وہ ان کاموں کو بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

اُن کی فطرت عالی انسانوں کی خدمت کے جذبہ کو اس قسم کی مقامی اور ادنیٰ آویزش سے آلودہ کرنا پسند نہ کرتی تھی اور طبیہ تحریک کی تمام تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ اپنے کام میں ادنیٰ جذبات کو دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں کانفرنس کے موقعہ پر بعض مخالفین نے کچھ مخالفانہ اشتہارات تقسیم کرانے چاہے اور جلسہ گاہ میں ایک لڑکے کو مطبوعہ اشتہارات دے کر اس غرض کے لئے بھیجا۔ حکیم صاحب کی نظر اُس لڑکے پر پڑی اور اُنھوں نے جب اُس سے وہ اشتہار لے کر ملاحظہ کیا تو فرمایا کہ جن صاحبوں نے یہ اشتہار تقسیم کرانے ضروری سمجھے اُنھوں نے آدمی بھیجنے کی تکلیف کیوں گوارا فرمائی۔ میرے پاس یہ اشتہار بھیج دیتے، میں خود ان کو تقسیم کرا دیتا۔ چنانچہ یہ فرما کر اشتہارات اُس لڑکے سے لے کر خود حاضرین میں تقسیم فرما دئے!

اس واقعہ نے پٹنہ میں کانفرنس کے اجلاس کو اس قدر کامیاب بنایا کہ اُس کی کامیابی عام طور پر تعجب انگیز تھی۔ یہ رواداری اور بے نفسی اُن کی کشتی کو ہزاروں طوفانوں سے صحیح وسالم نکال لے جاتی تھی! اس موقعہ پر بھی اُنھوں نے وہی لب ولہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ:۔

> میں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں کبھی لکھنؤ اور دہلی کا سوال پیدا نہیں ہوا میں کھلے طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ لکھنؤ کو طبی مرکز کے لحاظ سے دہلی پر ترجیح دیتا ہوں اور ذاتی طور پر اپنے دل میں لکھنؤ کی بڑی وقعت رکھتا ہوں چونکہ ضابطہ کے موافق یہ امر ضروری تھا کہ کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے جو جوابات مرتب کئے تھے اجلاس میں

ان کو پیش کر کے منظوری حاصل کی جائے اس لئے میں امید
کرتا ہوں کہ اس بارے میں کسی غلط گمان کو دل میں جگہ نہ
دی جائے گی۔ مسئلہ جائے قیام کالج کے متعلق مخالفت و
موافق تقریریں ہوئیں لیکن میں اس وقت اس معاملہ میں
بالکل علیحدہ اور غیر جانب دار ہوں۔ اگر کالج لکھنؤ میں قائم
ہو تو مجھے کوئی رنج نہ ہوگا اور اگر کانفرنس کی رائے کے
مطابق علیگڈھ میں قائم ہو تو میں خوش ہونگا لیکن اسی سلسلہ میں
مجھے یہ بات ضرور ظاہر کرنا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق تقریر و
مباحث میں اگر کسی بھائی یا بھائیوں کی دل آزاری ہوئی ہو
تو وہ معاف فرمائیں اور کوئی بُرا اثر لے کر نہ جائیں۔ چونکہ
مجھے اس قسم کی باتوں سے ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے
اس لئے میں اس بحث و مباحثہ سے الگ رہا ہوں لیکن
میں محسوس کرتا ہوں کہ کچھ بھائیوں کو ضرور رنج ہوا ہوگا
مگر میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں اس لئے کہ
ہر شخص کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی آزادی ہے البتہ یہ
ضرور کہوں گا کہ اختلاف رائے سے رنج نہ ہونا چاہئے۔
اگر کسی بھائی کے دل میں کچھ رنج اختلاف رائے سے ہوگیا
ہے تو میری درخواست ہے کہ وہ اسے اپنے دل سے
نکال کر دل کو صاف کر لیں"

وہی ایک جذبہ تھا جو اُن کو ہر ملّی تحریک کی امداد پر آمادہ کرتا تھا
اور وہ ہمیشہ نہایت خوشی سے ہر ایسے کام میں شرکت فرماتے تھے جس میں

قدیم طب کی اعانت کا کوئی پہلو ہو۔ طبیہ کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی وہ ۱۲ مارچ کو امرت دھارا کی سال گرہ میں شرکت کرنے کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ اپنی تقریر میں ٹھاکر دت صاحب شرما بانی امرت دھارا کی مستعدی استقلال اور صداقت" کا ذکر فرماتے ہوئے اور پنڈت صاحب کو اُن کی کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ :۔

"اگر کسی آدمی کے اندر کسی کام کے لئے سمجھ ہو اور اُس کے ساتھ ہی سچائی کوشش اور استقلال ہو تو ناممکن ہے کہ اسے بہترین پھل حاصل نہ ہو سکیں"

پنجاب کا شکوہ

اور یہ گویا وہ خود اپنی سوانح حیات بیان فرما رہے تھے! اس موقعہ پر جبکہ ایک ہندو کارخانہ کی سالگرہ کی تقریب میں پنجاب کے بہت سے معززین جمع تھے حکیم صاحب اس بات کو نہ بھول سکے کہ پنجاب ہندو مسلم نا اتفاقی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اور طب کے بعد جو چیز اُن کے دل کو سب سے زیادہ عزیز تھی وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک اعلیٰ تخیل تھا۔ اس موقعہ پر اُنہوں نے بہت صاف الفاظ میں اہل پنجاب کو فرقہ دارانہ حالات کے خلاف متنبہ فرمایا:

"اگر آپ سب لوگ صداقت کوشش اور استقلال کے ساتھ ملک میں سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوں تو کیوں کامیابی نہ ہو۔ مگر ہاں آپ اس ملک میں کیونکر سوراجیہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ آپ دونوں بھائی (ہندو مسلمان) اس وقت باہمی جنگ و جدال میں مصروف ہیں۔ پنجاب لڑائی کے لئے مشہور ہے۔ بڑے بڑے پہلوان بھی اسی صوبہ سے

نکلتے ہیں جس طرح جسمانی طاقتوں کی آزمائش اس صوبہ میں کی جاتی ہے اسی طرح بدقسمتی سے (مجھے معاف کریں) قومی طاقتوں کی زور آزمائی کی جا رہی ہے میں آپ سب بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ اس مسئلہ پر غور کریں کہ اس باہمی جنگ سے جو جو نقصان کانگریس کو پہنچا ہے وہ کسی دوسری وجہ سے نہیں پہنچا۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ہماری تحریک آزادی کی مخالف ہے اور گورنمنٹ عظیم الشان طاقت رکھتی ہے لیکن کیا آپ سمجھ نہیں سکتے کہ گورنمنٹ کی طاقت سے ہم کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ باہمی جنگ وجدل سے پہنچا ہے۔ میں نہ صرف اس وجہ سے کہ میں ہندو اتحاد کا حامی ہوں بلکہ جب کبھی غور کرتا ہوں میں اب تک معلوم نہ کر سکا کہ دونوں قوموں نے باہمی جنگ کرنے سے کیا فائدے حاصل کئے اگر کسی نے کوئی طاقت واقعی دوسری قوم پر حاصل کرلی تو اس کا کیا فائدہ ہوا جبکہ دوسری قوم کو نقصان پہنچا۔ ضرورت تو ایسے کام کی ہے کہ جس کے کرنے سے دونوں قوموں کو مشترکہ فائدہ پہنچ سکے اور وہ کام باہم مل کر سوراجیہ حاصل کرنا ہی ہے جس سے ملک کا ہر باشندہ یکساں فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔"

جب لاہور میں حکیم صاحب اہل پنجاب کو فرقہ وارانہ نفاق کے خلاف متنبہ کر رہے تھے اسی زمانہ میں کانپور ہندو مسلمانوں کے فساد کا مرکز بنا ہوا

تھا۔ وہ پنجاب کی حالت پر افسوس فرما رہے تھے اور یہاں صوبہ جات متحدہ میں ہولی کے موقعہ پر ہندو مسلمانوں کی یہ ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ دوسری طرف مسئلہ حجاز پر مسلمانوں کے درمیان سخت نااتفاقی پیدا ہو رہی تھی۔ ۹ رمارچ کو مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسہ میں حکیم صاحب کے مکان پر جب وفد حجاز کی دو اختلافی رپورٹیں پیش ہوئیں تو ظفر علی خاں صاحب اور دوسرے اراکین وفد کے درمیان اس قدر کشمکش پیدا ہو گئی کہ آخرکار ظفر علی خاں صاحب کی جماعت جلسہ سے اُٹھ کر چلی گئی اور یہ گویا فریقین کے درمیان اُس مسئلہ کی نسبت آخری اعلان جنگ تھا۔ جس مسئلہ کا حل کرنا نہ ظفر علی خاں صاحب کی جماعت کے اختیار میں تھا نہ خلافت کمیٹی کے۔ دونوں خدائی فوجدار پرچھائیوں سے لڑ رہے تھے!

مارچ کا مہینہ ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ اپریل کی دوسری تاریخ سے کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے۔ ایک ہفتہ تک کلکتہ کی سڑکوں پر ہندستان کی یہ دو بڑی قومیں ایک دوسرے کو قتل کرنے اور لوٹنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ نئو کے قریب جانیں ضائع ہوئیں اور سینکڑوں مجروح ہوئے۔ بنائے فساد مسجد کے سامنے باجہ کا سوال تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ روزانہ اخبارات کلکتہ کے فساد کی خبریں لے کر آتے تھے حکیم صاحب کے دل درمند پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

بڑھتا ہوا انتشار

حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب کے دل میں ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی کے متعلق جو رنج اور درد عرصہ سے تھا اُس کے علاوہ ایک اور احساس بھی پیدا ہو چکا تھا۔ وہ احساس یہ تھا کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ اس قسم کی نااتفاقی کے رفع کرنے میں

زیادہ تر بعض ہندو لیڈران کی ضد حائل ہوتی ہے۔ کوہاٹ کے متعلق مہاتما جی کی رائے سے اُن کو اختلاف پیدا ہوا اور پھر دلی اور شملہ کی صلح کانفرنس میں اُنہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ بعض ہندو لیڈر فضا کی خرابی کے مسلمانوں سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ یہی احساس خلافت کمیٹی اور جمیعۃ علماء کے اکثر اراکین کے اندر موجود تھا۔ فرقہ داری فتنہ کے اس حمام میں جہاں سب ننگے تھے ذمہ داریوں کی ناپ تول کچھ آسان نہیں ہوتی۔ تاہم اب ضروری ہو گیا تھا کہ اُن ہندو لیڈروں سے پھر بات چیت کی جائے جو ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اعلان کیا گیا کہ خلافت کمیٹی کا ایک خاص اجلاس ۷ و ۸ مئی ۱۹۲۶ء کو دہلی میں منعقد ہو گا۔ اس اعلان پر علاوہ صدر جمیعۃ علما اور مولانا محمد علی وغیرہ کے حکیم صاحب نے بھی دستخط کئے۔ اب ہوا کا رُخ بتا رہا تھا کہ خلافت کمیٹی اور کانگریس کے درمیان وقت وداع قریب آگیا ہے ہمدرد اور خلافت جیسے قوم پرست اخباروں کا لہجہ بھی بہت بدل گیا تھا۔ ۷ مئی کی کانفرنس میں حکیم صاحب نے صاف صاف چند باتیں کہیں اور اسی نقطہ سے اُن کی پبلک زندگی کا خاتمہ شروع ہوتا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا:۔

> بدقسمتی سے ملک کی فضا آج بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ہندو مسلم نا اتفاقی کا خطرہ نہایت زبردست خطرہ ہے۔ یہ خطرہ صرف ہندوستان کی دو قوموں کے مفاد ہی سے تعلق نہیں ہے بلکہ یہ حصول آزادی کی راہ میں ایک سخت رکاوٹ ہے اس وقت ہندوستان اس اعلیٰ مقصد کو بھول گیا ہے جس کو

ے کروہ اُٹھا تھا اور جس کے لئے اُس نے قربانیاں کی تھیں۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا آج بھی ویسا ہی حامی ہوں جیسا کہ ہمیشہ تھا۔ اگر ہم اتحاد کو چھوڑ رہے ہیں تو یہ ایک ایسا گناہ کر رہے ہیں جس کا کفارہ ہم کبھی ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا ہم آج اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ ترک موالات کے رزولیشن کو مٹا دیں۔ اگر ترک موالات خلافت کمیٹی کے اُصولوں میں کوئی اساسی چیز ہے تو ہم ہندوؤں کو کوئی اعلان جنگ نہیں دے سکتے۔ اگر ترک موالات کے رزولیوشن کو ہٹا دیا جائے تب بھی ہم یہاں جمع ہو کر یہ کارروائی کر سکتے ہیں، مگر اس کے ہوتے ہوئے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

لیکن میں ہندو مسلم اتحاد کی تاریخ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں مالابار اور ملتان کی وجہ سے ہندوؤں میں ایک اشتعال پیدا ہوا جس سے ہندو مہا سبھا مضبوط ہو گئی۔ اور شدھی اور سنگٹھن کی تحریکات میں اضافہ کیا گیا۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جو ہندوؤں کی طرف سے اُٹھا اور اس کی بڑی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو مالابار اور ملتان کے واقعات سے متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کے اس اقدام کو میں کسی طرح بہتر نہیں سمجھ سکتا۔ کیا ہندو بھائی یہ بتائیں گے کہ اس قسم کے واقعات آرہ، کٹار پور میں نہیں ہوئے تھے؟ اور کیا مسلمانوں کی پوزیشن اس وقت بالکل ایسی ہی نہیں تھی؟ مسلمانوں نے اس وقت کیوں محسوس نہیں کیا کہ کہیں ہندوؤں کی طاقت ان کی ہستی کو خطرہ میں نہ ڈال دے۔ اگر اس وقت مسلمانوں نے کچھ نہیں کیا تو پھر ملتان اور

مالا بار کے بعد ہندوؤں کا طرز عمل کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کے بعد بھی جو کچھ ہوا اس کے متعلق ہندو مہا سبھا کی سرگرمیوں کو اسی صورت میں مبنی برحق کہا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جوابی نظام موجود ہوتا ان فسادات کے بعد خود مسلمانوں کی جانب سے مالا بار اور ملتان کے مسلمانوں کو جو ملامت کی جا چکی تھی اس کے بعد بھی ہندو قوم کی مدافعت کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کو یہ طرز عمل اختیار کرنے سے قبل دو چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے ایک تو یہ کہ آیا یہ وقت مناسب ہے یا نہیں اشتعال کی حالت میں اگر کوئی بنیاد رکھی جائے تو وہ کسی خاص حد تک محدود نہیں رہتی اور دوسرے یہ کہ اگر ہم صرف مدافعانہ کاموں کو پیش نظر رکھ کر کھڑے ہوئے تو ایسی عام تحریک کا کیا نتیجہ ہو گا۔ کیا ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو ہندوؤں کی اس ذہنیت میں کوئی بھی فال نیک نظر آتی ہے۔ اس کے نتائج خطرناک ہوں گے جنہیں کوئی بھی نہ روک سکے گا۔ اگر ہندو بھائی چاہتے ہیں کہ سوراج حاصل کریں ملک میں امن و امان قائم ہو اور اگر ہندوستان کے اندر ہندو بہادر رہیں تو انہیں غور کرنا چاہیئے کہ ان کے طرز عمل کے نتائج کس قدر ان کے اصل مقصد کے خلاف ہیں۔ اگر وہ غور نہیں کرتے اور اپنی تمام جدوجہد پورے ساز و سامان کے ساتھ جاری رکھتے ہیں تو نہیں معلوم اس کا کیا انجام ہو گا۔ خدا جانتا ہے کہ ہندوستان برسوں تک سوراج یا اپنے معمولی حقوق مانگنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہے کہ وہ اس عام ذہنیت کو جو ہندو بھائیوں میں پائی جاتی ہے خاموشی کے ساتھ برداشت کریں یا اس کا جواب دیں اور ان کے قومی حملہ کو جاری رکھیں یا اس پر غور کریں کہ کوئی مدافعت کرنی چاہیئے۔

یا نہیں اور اسی مقصد کے لئے یہ اجلاس منعقد ہوا ہے۔ ہر ایک سچے
نیشلسٹ کا یہ فرض ہے کہ جب دو قوموں میں جنگ ہو تو کمزور کا ساتھ
دے، کوئی مسلمان بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔ جب وہ دوسری
قوم کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی قوم کے
ساتھ دینے میں وہ انصاف سے گریز کر رہا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ
اگر کوئی چیز ہندوؤں کی طرف سے آئے اور میں اُس پر اعتراض کروں
تو میں نیشلسٹ نہیں ہوں۔ ہر مذہب میں سچ بولنے کی ہدایت کی گئی ہے
اگر مسلمان مسلمان اور ہندو ہندو ہیں تو انہیں اس کا خیال کرنا چاہیئے
میں کم سے کم ان بھائیوں سے جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ سوال کرنا
چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے پاس کوئی نظام نہ ہوا اور اس صورت
میں کوئی نظام اُن پر حملہ کرے تو وہ بھائی اُس قوم کے متعلق کیا
مشورہ دیں گے۔ اس حالت کو بدستور جاری رکھا جائے یا مدافعت
کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر مسلمان مدافعت کے لئے کھڑے ہو گئے تو مدافعت
سے گزر کر تصادم بھی ہو گا اور ہمارا اعلیٰ مقصد ہاتھ سے نکل جائے گا۔
مجھے تو برسوں تک آزادی کی خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی
ہندوؤں کو چاہیئے کہ مسلمانوں کو اس گڑھے میں نہ ڈھکیلیں۔"

یہ اس تاریک مایوسی کے اظہار کا آخری موقعہ تھا جو انتقال سے
ایک سال پہلے حکیم صاحب کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ لیکن جس سانچے
میں اُن کے افکار اور تصورات ڈھل چکے تھے وہ قائم تھا۔ یہ سچ
ہے کہ وہ یہ دیکھ کر ہندو مہاسبھا کی جارحانہ پالیسی نے عام طور پر
ہندوؤں کو متاثر کر دیا ہے اور کانگریس پر اب مہاسبھا کی قوت

فاینق سے بہت شکستہ خاطر ہو گئے تھے لیکن اس حد تک نہیں کہ اُن کی ذہنی زندگی کا رُخ بدل سکتا۔ جس طرح وہ مہاسبھائی ذہنیت سے بیزار تھے اسی طرح وہ بعض انتہا پسند مسلمان لیڈروں کی انتہا پسندی اور فرقہ پرستی سے بھی بیزار تھے۔ چنانچہ خلافت کمیٹی نے جب ایک جارحانہ اعلان مہاسبھا کے مقابلہ میں شائع کیا تو اُنہوں نے صاف کہا کہ یہ بھی فرقہ پرستی اور تنگ دلی کا ایک رُخ ہے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری یورپ گئے ہوئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو اُنہوں نے ملک کے اِن حالات پر پھر حکیم صاحب سے مشورہ کیا اور حکیم صاحب باوجود اپنی مایوسیوں کے پھر اس تحریک میں شریک ہو گئے کہ ہندستان میں ایک ایسی غیر فرقہ وارانہ جماعت بنائی جائے جس کے اراکین کسی فرقہ واری جماعت سے کوئی واسطہ نہ رکھیں، یہ ایک درمیانی جماعت ہو جو دونوں طرف کے انتہا پسند فرقہ پرستوں کے درمیان کھڑی ہو جائے۔ اس تحریک میں ڈاکٹر انصاری کے علاوہ پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک ہو گئے۔ اس جماعت کا نام انڈین نیشنل یونین رکھا گیا۔ اُس کے متعدد اجلاس مسوری اور دہلی وغیرہ میں ہوئے۔ اُسی زمانہ میں حکیم صاحب نے پھر ایک دفعہ یہ کوشش کی کہ کانگریس کے اندرونی اختلافات بھی رفع ہو جائیں اس وقت علاوہ نوچینجز اور سوراجیوں کے ایک جماعت اور کانگریس میں نمودار ہو چکی تھی جس نے حکومت سے جوابی تعاون کرنے کا اصول اختیار کیا تھا۔ اس جماعت نے کانگریس کی سوراجی جماعت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے ایک صحافتی بیان میں صاف صاف کہا کہ کانگریس کی سوراجی جماعت کا جوابی تعاون کرنے والی جماعت سے کوئی سمجھوتہ بالکل

خلاف اصول ہے۔ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ یہ مفاہمت ناقابل عمل ثابت ہوگی کیونکہ اُس کی بنیاد میں خامیاں ہیں شاید اس مفاہمت سے سوراجیوں کو انتخابات کے موقع پر کچھ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن اس کے بعد حامیان موالات وتارکین موالات کے درمیان ایک جنگ شروع ہو جائیگی۔ اس بات کا انحصار سوراجی ارکان کی شخصیتوں پر ہوگا کہ جن صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہو وہاں وہ وزارت قبول کر کے ملک و قوم کی کچھ خدمت کر سکیں گے یا نہیں۔ لیکن اگر ان وزراء کی شخصیتیں بہت زبردست بھی ہوں تو بھی بہت کم فائدہ پہنچا سکیں گے۔ اور اکثر وزراء دفتری اقتدار کے آلہ کار بن کر اس کی حکمت عملی پر کاربند ہو جائینگے۔"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حکیم صاحب کا یہ اندیشہ بے بنیاد نہ تھا۔ انہوں نے اس بیان میں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا تھا کہ اس مفاہمت کے پردے میں "کانگریس موالات کی طرف ایک قدم اور بڑھ گئی ہے۔"

حکیم صاحب کے اس اختلاف میں ایک اور نکتہ مضمر تھا جس کو وہ لوگ سمجھ رہے تھے جو خلافت کانفرنس میں حکیم صاحب کی صاف گوئی سُن چکے تھے۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ جوابی تعاون کرنے والوں سے سوراجیوں کی مفاہمت حکیم صاحب کی نظر میں مہاسبھا کے ساتھ مفاہمت تھی۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ جوابی تعاون والے لیڈر درحقیقت مہاسبھائی لیڈر تھے اور بلاشبہ حکیم صاحب بحیثیت ایک سوراجی کے کسی طرح اُن لوگوں کا شریک کار ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسمبلی میں مہاسبھائی لیڈروں نے سوراجیوں کو مرعوب کر لیا ہے اور اکثر سوراجیوں

اس کمزور پالیسی پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پبلک زندگی سے کنارہ کش ہو جانے کے بھی وہ سیاہ و سفید کی "مقاہمت" پر خاموش نہ رہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی پبلک زندگی کا یہ آخر زمانہ سخت دماغی اور روحانی کاوشوں کا زمانہ تھا۔ اُن کی صاف گوئی جیسا کہ ہونا چاہئے تھا۔ انتہا پسند فرقہ پرستوں پر بہت گراں گذری چنانچہ بعض ہندو اخبارات نے اُن کی ذات پر حملے کرنے شروع کئے۔ مثلاً "پرتاپ" نے لکھا کہ :-

جب حکیم اجمل خاں صاحب نے اس آواز میں بولنا شروع کیا جس میں خواجہ حسن نظامی یا دوسرے متعصب بول بولا کرتے تھے۔ تو اب امید کس سے رہ گئی۔ مہاتما گاندھی نے حکیم اجمل خاں صاحب کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ بیس کڑور ہندوؤں کو اُن کے سپرد کیا تھا جب کہ ۱۹۲۱ء میں وہ سرکار کے ساتھ شانتمئی یدھ شروع کرنے والے تھے۔ جن حکیم اجمل خاں کی دہلی کے ہندو وہاں کے مسلمانوں سے زیادہ عزت کرتے تھے آج وہ حکیم اجمل خاں بھی مر گئے بھارت ماتا آج جس قدر نہ روئے کم ہے۔ علی برادران کانگریس میں آنے سے پہلے کٹر ملّانے تھے۔ دوران جنگ میں سرکار نے انہیں نظر بند رکھا۔ اس لئے وہ رہا ہوتے ہی کانگریس کی طرف جھک پڑے۔ لیکن اس عرصہ میں پھر ان کا اسلامی تعصب دور نہ ہوا اگر وہ اس موقعہ پر لڑھک پڑے تو ہمیں تعجب نہیں اور نہ افسوس ہے لیکن حکیم صاحب کی گراوٹ

کو دیکھ کر تعجب بھی ہے اور افسوس بھی۔ اب اگر مسلمان
ہندوؤں پر کہیں زیادتی کریں گے تو وہ کس کے پاس فریاد
لے کر جائیں گے۔ حکیم صاحب نے اپنی ابتدائی تقریر میں
سارا الزام بے قصور ہندوؤں کے سر تھوپا اور انہیں
چیلنج دیا کہ اگر وہ اسی طرح چلتے رہے تو مسلمانوں
کو بھی ان کا جواب دینا پڑے گا۔

(پرتاپ)

ڈھکے ہوئے زخم پر جب اُنگلی لگ جاتی ہے تو مجروح اپنے درد و کرب کو چھُپا نہیں سکتا۔ ایک خاص فرقہ کی ہندو ذہنیت اس درجہ گر کر چکی تھی کہ وہ حکیم اجمل خاں سے بھی ایمان داری اور سچائی کو منسوب نہ کر سکتے تھے۔ اُن کے نزدیک حکیم صاحب کی نکتہ چینی بھی فرقہ پرستی کا ایک مظاہرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب اس قسم کی نکتہ چینی کا جواب کبھی نہ دیا کرتے تھے۔ اور اُن کے اخلاقی دستور العمل میں ان چیزوں کا جواب خاموشی تھا تاہم ان اوراق میں اس قسم کی ناگوار باتوں کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ ۱۹۲۶ء کی ہندوستانی فضا اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا ایک نمونہ پیش کر دیا جائے تاکہ ناظرین حکیم صاحب کی زندگی کے آخری زمانہ کی روحانی صعوبتوں کا اندازہ کر سکیں۔

سوہان روح

مہاسبھائی ذہنیت کے ہندوؤں سے قطع تعلق کرنے کے بعد بھی خود مسلمانوں کے اندرونی مناقشات اُن کے لئے سوہان روح تھے۔ حجاز کا مسئلہ ہر روز

پیچیدہ ہوتا جاتا تھا۔ ۱۳ مئی کو وفد خلافت موتمر حجاز میں شرکت کے لئے روانہ ہوا اور اس ارادہ کے ساتھ روانہ ہوا کہ موتمر میں ابن سعود کی ملوکیت کی مخالفت کرے گا حالانکہ ابن سعود نے انتہائی عاقبت بینی کے ساتھ موتمر کے انعقاد سے پہلے ہی نہ صرف حجازیوں سے بیعت لے لی تھی، نہ صرف ہندستانی مسلمانوں کو صاف طور پر جتلا دیا تھا کہ اب یہ مسئلہ قابل بحث نہیں ہے بلکہ برطانیہ سے بھی اپنی ملوکیت کو منوا لیا تھا۔ جو دروازہ بند ہو چکا تھا اُس کے کھولنے کے لئے خلافت کمیٹی کے نمایندے حجاز جا رہے تھے! پہلی چیز جو ان نمایندوں نے حجاز جا کر سُنی وہ یہ تھی کہ جنت البقیع اور مزار سید حمزہ توڑ کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اس خبر نے ہندستان میں حزب الاحناف اور وہابیوں کی جماعتوں کی زبانیں پھر کھول دیں اور جو گلے چیختے چیختے پڑ گئے تھے اُن کو پھر کھانس کھکار کر صاف کر لیا گیا سب کی آنکھیں موتمر کے نتایج پر لگی ہوئی تھیں اور آخر جولائی میں وہ نتایج بھی ظاہر ہو گئے۔ سلطان ابن سعود کی ملوکیت قائم رہی۔ ہندستان کے مسلمانوں نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کی سیاست کو خالص مذہبی اصطلاحوں کے معیار پر نہیں جانچا جا سکتا۔ اسی لئے خلافت کے نمایندے جتنی زیادہ امیدیں لے کر گئے تھے اتنے ہی زیادہ مایوس واپس آئے۔ اس کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کے فرقوں کے درمیان جو کیچڑ اچھالی گئی اس کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی بھی اس میدان میں دست و گریباں ہو گئے۔

حکیم صاحب جون کے مہینے میں زیادہ تر رام پور میں مقیم رہے

یہ زمانہ بلوہ اور فساد کی خبریں اخبارات میں پڑھتے گزرا، گورکھپور مضافات کلکتہ، لکھنؤ۔ راولپنڈی، جھانسی۔ دہلی۔ احمد آباد، الہ آباد بارہ بنکی غرض ہفتہ کے ہر دوسرے دن کہیں نہ کہیں ایک بلوہ ہوتا رہا۔ کہیں کسی ہندو کا گگرا کسی مسلمان نے چھو دیا۔ کہیں کسی مسلمان پیر کے مزار کی توہین ہندو نے کر دی، کہیں سنگھ سبھا کا جلوس باعث خونریزی ہوا کہیں گائے کی قربانی کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے گلے کاٹے گئے۔ صرف کلکتہ کے فساد میں جو نقصانات جان ہوئے اُن کی سرکاری اعداد (جو یقیناً غیر سرکاری اعداد سے کم ہوتے ہیں) بہت عبرتناک ہیں۔

ہلاک	ہندو	۸۴
"	مسلمان	۸۱
زخمی	ہندو	۶۷۱
"	مسلمان	۶۶۴
گرفتار	ہندو	۱۶۹
"	مسلمان	۲۷۲

سوراج مانگنے والی قوم کی ہمت مردانہ کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا تھا! جون کی طرح جولائی کا مہینہ بھی ہندو مسلمانوں کی خونریزیوں میں گزرا۔ پٹنہ میں فساد ہوا پھر کلکتہ کے قریب، اُس کے بعد دو دن تک خاص کلکتہ میں، رتھ جاترا کے سلسلہ میں خونریزی ہوتی رہی اس زمانہ میں حکیم صاحب کا زیادہ قیام رام پور اور مسوری میں رہا۔

اُس وقت بیرونی ممالک میں سب سے اہم واقعہ غازی عبدالکریم کی شکست تھی، جس نے جہاد ریف کا خاتمہ کر دیا۔ غازی ریف کو عمر بھر

کے لئے ایک جزیرہ میں بند کردیا گیا اور اس طرح فرانسیسی قوت کے مقابلہ میں عربوں کی آزادیوں کا زمانہ دراز کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

دمشق و شام کے معرکے ابھی جاری تھے۔ لیکن اُن کا نتیجہ بھی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ جولائی میں حکیم صاحب کے ایک خاص دوست، یعنی عمر ثوبانی کا بمقام بمبئی دفعتاً انتقال ہوگیا، وہ عمر ثوبانی کو بیحد عزیز رکھتے تھے اور ان کو "عمر" کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔

طبیہ کالج کا شعبہ تحقیقات

رام پور کی آمد و رفت کے علاوہ، جولائی کا زیادہ وقت حکیم صاحب نے طبیہ کالج کے محکمہ تحقیقات کی تکمیل و تنظیم کی تدابیر میں گزارا۔ طب یونانی کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں حکیم صاحب کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس کی تفصیل کسی دوسری جگہ پیش کی جائے گی۔ ان کے ذہن میں علمی تحقیقات کے دو صیغے تھے۔ اول یہ کہ وہ چاہتے تھے کہ علم طب کے ماہرین قدیم نصاب پر جدید علوم کی روشنی میں تنقید و تنقیح کریں اور رفتہ رفتہ تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں طب یونانی کی تعلیم کا ایک نیا اور بہتر نصاب تیار کرلیں۔ اس غرض کے لئے اُنھوں نے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ساتھ وہ خود بھی کام کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جب کہ وہ رام پور اور مسوری میں مقیم تھے اُنھوں نے اس کمیٹی کے جلسوں میں اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا اور طب یونانی کا جب کبھی کوئی نیا نصاب تعلیم مرتب ہوگا۔ تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت زیادہ حکیم صاحب کی خداداد قابلیت کا مرہون منت ہوتا۔ اس تحقیقات کا دوسرا شعبہ جڑی بوٹی اور

مفردات سے متعلق تھا وہ چاہتے تھے کہ طب یونانی کے مفردات کو جدید سائنس کے اصولوں کے مطابق پرکھا جائے، اُن کے اعمال خواص معلوم کئے جائیں اور معلومہ ادویہ میں نئے نئے مفردات کا اضافہ کیا جائے نیز مرکبات کو بذریعہ تحلیل و تجزیہ جانچا جائے اور جو معلومات اس طرح حاصل ہو اُس کی روشنی میں طب کے قدیم اصولوں کی اصلاح کی جائے۔ یہ کام اتنا اہم اور اُس کے نتائج اس قدر وسیع تھے کہ حکومت کی امداد کے بغیر اُس کا شروع کرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن اجمل خاں کبھی کسی چیز کو جس کے کرنے کی دُھن اُن کے اندر پیدا ہو جاتی تھی ناممکن نہیں سمجھا کرتے تھے۔ کوئی دوسرا بھی اگر عرض کرتا تھا کہ حکیم صاحب! یہ تو نہ ہو سکے گا تو ہمیشہ مُسکرا کر فرما دیا کرتے تھے "جی نہیں آپ دیکھئے، ہو جائیگا" چنانچہ ریسرچ کا محکمہ طبیہ کالج میں قائم ہو گیا۔ اس شعبہ کے لئے حکیم صاحب نے جرمنی میں ایک ماہر فن کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ڈاکٹر سلیم الزماں اس کام کے لئے پوری طرح تیار ہو کر جرمنی سے واپس آئے اور اُنھوں نے اس شعبہ میں کام بھی شروع کیا لیکن افسوس ہے کہ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد اس شعبہ کی اہمیت کو کسی نے نہ سمجھا اور مرحوم کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

غیر فرقہ وارانہ تحریک جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے فرقہ واریت سے بچ کر قوم پرستوں کا ایک محاذ از سر نو قائم کرنے کے لئے ہندوستان کے داخلی سیاسیات میں ڈاکٹر انصاری مولانا ابو الکلام آزاد اور پنڈت موتی لال نہرو اس امر میں کوشاں تھے

کہ قوم پرستوں کو فرقہ وارانہ تحریکوں سے بالکل الگ کرلیا جائے۔ ڈاکٹر انصاری تمام فرقہ وارانہ انجمنوں سے قطع تعلق کرچکے تھے اور اول الذکر حضرات کی طرف سے ملک میں ایک عام اپیل شائع کی جاچکی تھی، یہ درحقیقت ہندو مسلمانوں کی باہمی اُلجھنوں کو سُلجھانے کی ایک دوسری صورت پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اُس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز سوامی شردھانند کی بلند ہوئی۔ اس جماعت میں اس وقت تک جو اصحاب شامل ہوچکے تھے وہ سب بااثر شخصیت رکھنے والے لوگ تھے، یعنی مسٹر شاشتری۔ حکیم صاحب سر تیج بہادر سپرو۔ نواب ذوالفقار علی خاں مسٹر سین گپتا ڈاکٹر انصاری، مسز نائیڈو۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد وغیرہ وغیرہ لیکن سوامی شردھانند نے اس دعوت کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے وہ نہ صرف اس تحریک کے موافق نہ تھے۔ بلکہ سخت مخالف تھے سوامی جی نے فرمایا کہ:۔

> میں نے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اعلان کو بڑے غور سے پڑھا ہے میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ انڈین نیشنل یونین پہلے سے موجود ہے اور سوراجیہ پارٹی تمام مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات دور کرنے کے لئے اس میں شامل ہوسکتی تھی۔ یہ پارٹی کہتی ہے کہ اس کا پالیٹکس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ اتحاد کانفرنس کے پاس کردہ رزولیوشنوں کو بنیاد کے طور پر اختیار کرے گی۔ میرے خیال میں کانفرنس نے ہندو مسلم اتحاد میں شامل پولیٹکل سوالات سے الگ

رہنے میں غلطی کی ہے۔ نئی پارٹی کے مقاصد گو نا قابل اعتراض ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایسے آدمی کہاں سے ملیں گے جو کسی بھی فرقہ وارانہ انجمن کے ساتھ تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اگر نئی پارٹی نے فرقہ وارانہ انجمنوں میں کام کرنے والوں سے اس طرح اجتناب کیا تو اسے ان لوگوں کی مدد حاصل نہیں ہوگی جن کا فی الحقیقت عوام پر قابو ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ پنڈت مالویہ اور کئی دیگر سرکردہ لیڈران کے ساتھ جو قوم کے حقیقی لیڈر ہیں۔ مشورہ نہیں کیا گیا۔ لیکن حکیم اجمل خاں صاحب کو جنہوں نے پچھلے دنوں خلافت کانفرنس دہلی کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کے طور پر ایک سخت متعصبانہ اور فرقہ پسندانہ تقریر کی تھی۔ خوش آمدید کہی گئی ہے۔"

سوامی جی حکیم صاحب کی "متعصبانہ" تقریر کو بھولے نہ تھے۔ اور انہوں نے بلاشبہ ان اکھڑے ہوئے الفاظ میں نئی پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مہاسبھائی ذہنیت کو بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ واقعہ حد درجہ عبرتناک ہے کہ دہلی کی سیاسی جدوجہد میں اجمل خاں اور سوامی شردھانند یہ دو شریک کار ایسے تھے جنہوں نے مہینوں دوش بدوش تمام خطرات کا مقابلہ کیا تھا اور جن کو ایک دوسرے کے خیالات کے معلوم کرنے کے بہترین مواقعہ میسر آئے تھے، لیکن فضا کے بدلتے ہی ایک طرف تو طبیعت کا وہ رنگ پیدا ہوا جس کی مثال مندرجہ بالا اقتباس ہے مگر دوسری طرف حسب معمول

وہی خاموشی اور سنجیدگی تھی جس کو کسی معترض کا کوئی اعتراض اور کسی مخالف کا کوئی حملہ متاثر نہ کرسکتا تھا۔ یہی نہیں کہ ہندوؤں کی طرف سے اس مجوزہ جماعت پر نکتہ چینی کی گئی بلکہ تمام ایسے مسلمانوں کی طرف سے بھی جو فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر تھے اس تجویز کی مخالفت کی گئی اور آخرکار یہ بھی ایک پانی کا بلبلا تھا جو اٹھا اور بیٹھ گیا۔

جولائی کا مہینہ ان حالات میں گزرا اور ستمبر آتے ہی کونسلوں کے انتخابات کے سلسلہ میں سوراجیوں کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ اس جدوجہد سے مہاتما گاندھی بالکل الگ تھے لیکن حکیم صاحب نے کانگریس کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا اور باوجود تمام موانع کے جہاں کہیں ممکن ہوتا تھا وہ کانگریس کے متعلق اپنے عقیدہ کو صاف طور پر بیان کردیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ایلکشنوں کی جدوجہد میں فرقہ واری جذبات کام نہ کریں۔

علمائے اسلام

۸ر نومبر کو حکیم صاحب کانپور تشریف لے گئے جہاں وہ ندوۃ العلمار کے اجلاس کی صدارت کرنے کا وعدہ فرما چکے تھے۔ ندوہ سے حکیم صاحب کا تعلق بہت پرانا اور درحقیقت اُس کے قائم ہونے کے زمانہ سے تھا۔ ندوہ کی تحریک کے متعلق اُن کے خیالات کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ زمانہ کی ضرورت سے باخبر علما جو محض درس نظامی کے حدود کے اندر اپنے قوئ عقلی کو محدود نہ کردیتے ہوں، پیدا ہونے چاہئیں اور اسی لئے وہ اول دن سے مولانا شبلی مرحوم کی کوششوں میں ہر طرح شریک اور معاون تھے۔ ندوہ کی تاریخ میں دوسری دفعہ اُن کو سالانہ اجلاس

کی صدارت پیش کی گئی اور چونکہ وہ خود علما کے متعلق اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک مناسب موقعہ چاہتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے اُس دعوت کو قبول فرمایا۔ ۵ر نومبر کو حکیم صاحب نے اجلاس کا افتتاح فرمایا۔

اس موقعہ پر حکیم صاحب نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ علمائے ہندوستان کے لئے اصلاح حال کی ایک دعوت تھی جس کے پیش کرنے کی بہت کم لوگوں کو جُرأت ہو سکتی تھی، حکیم صاحب کے دل میں عرصہ سے علما کی پست حالت کھٹک رہی تھی اور تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں اُنہوں نے اس جماعت کی بہت سی کمزوریوں کو پہچان لیا تھا۔ ۱۹ء و ۲۰ء و ۲۱ء کے ہنگاموں میں وہ اکثر ایسے بزرگوں کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے جو بظاہر علما کی جماعت سے تعلق رکھتے ہوئے بہ باطن ہر قسم کی انسانی کمزوریوں میں آلودہ نظر آتے تھے۔ اُس زمانہ کے بعض اخبارات نے مدرسہ دیوبند اور علمائے دیوبند کے خلاف جو سلسلہ مضامین شروع کیا تھا وہ خود حکیم صاحب کے اشارہ اور منشا کے مطابق شروع کیا گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علما کے بیجا اثرات کا طلسم ٹوٹے اور لوگ اُن کی کمزوریوں سے آشنا ہو کر اُن کی کورانہ تقلید سے باز آئیں۔ چنانچہ اپنے خطبہ صدارت میں تمہیدی شکریہ کے بعد اُنہوں نے صاف صاف وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے فرمایا:۔

"مَیں طبعاً غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ قومی سالانہ اجلاسوں میں صدارتی خطبات کو اظہار قابلیت کا ذریعہ بنایا جائے اور

ان میں ناپسندیدہ طوالت سے کام لیا جائے۔ اس قسم کے خطبے جتنے مختصر ہوں بہتر ہیں۔ اس لئے کہ آج ہمیں کلام کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ کام کی احتیاج ہے۔

ندوہ کے نیک مقاصد آپ کو معلوم ہیں اور گو وہ تعداد میں چند ہوں لیکن میں تو ندوہ کا مقصد صرف ایک ہی سمجھتا ہوں جو مسلمانانِ ہندستان کے لئے اپنی اہمیت سے خاص طور پر ممتاز ہے اور وہ موجودہ دور کے ضرورتوں کے مطابق علماء کا پیدا کرنا ہے۔

اس زمانہ میں جبکہ سیکڑوں نئی نئی ضرورتیں پیدا ہو رہی ہیں علماء کرام اُنہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اُنھوں نے گزشتہ صدیوں میں اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں خدمات انجام دیں اور ہر ایک دور کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے فرائض کو ادا کیا۔ لیکن دورِ حاضر کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ اس کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔

اس ضروری اور اہم بحث کے سلسلہ میں چند ایسی ضرورتوں کو مثال کے طور پر بیان کرتا ہوں جن سے میرے مدعا کے سمجھنے میں امید ہے کہ آسانی ہو گی۔

(۱) گو اسلام کے دورِ اول میں علم کلام کے تدوین کی ضرورت نہیں تھی لیکن جبکہ عربوں نے فلسفۂ یونان کو عربی کا لباس پہنایا اور اس کی درس تدریس کا

سلسلہ اُن میں جاری ہوا تو اُنہوں نے اس انقلاب خیالات کو محسوس کیا جو مسلمانوں میں فلسفہ کی زہریلی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور علم کلام کی بنیاد ڈال کر اُس کا صحیح تدارک کیا لیکن اب یہ علم کلام دورِ حاضر کے لئے مجموعی طور پر مفید نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔ تاکہ عصری علوم اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام سے بیگانگی کی ہوا پھیلتی جاتی ہے وہ دور ہو سکے اور اُن حملوں کی مدافعت کی جا سکے جو غیر مسلم اقوام کی طرف سے اسلام پر رات دن ہو رہے ہیں"

مسلمانوں کی اقتصادی پستی کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے اس بات پر زور دیا کہ سود کے مسئلہ کو طے کیا جائے اور صاف صاف بتایا جائے کہ "اس کے جواز کی شرعی صورتیں کیا ہیں اور بینک کا سود محرمات شرعیہ میں سے ہے یا نہیں" انہوں نے شکایت کی کہ علماء نے اب تک اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی ہے۔ اسی طرح اُنہوں نے علماء کو بتایا کہ جزئیات فقہ میں زمانہ کی ضروریات کے اعتبار سے مناسب تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر بھی اُنہوں نے اعتراضات کئے اور تکفیر کی شدت پر بہت افسوس کے ساتھ فرمایا کہ:۔

اس تکفیر کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اگر مکفرین کے مجموعہ فتاویٰ کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو یہ کہنا مشکل

ہو جائے گا کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں
سے کون واقعی مسلمان ہے! ....

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ہندستان کے حضرات علما کے سوادِ اعظم نے ابھی تک معیارِ اسلام مقرر نہیں کیا جس کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے صرف ہندستان کی غیر اسلامی آبادی ہی پر اُس کا اخلاقی اثر خراب نہیں پڑ رہا ہے بلکہ خود اسلامی آبادی بھی بہت تلخی کے ساتھ اس ناگوار اور ناپسندیدہ حالت کو محسوس کر رہی ہے۔ پردہ کی رسم کے متعلق اُنہوں نے فرمایا کہ

یہ پردہ جو اس وقت ہندستان میں رائج ہے دوسرے ملک کے مسلمانوں میں قطعی طور پر نہیں ہے وہاں کی عورتیں علی العموم برقعہ پہن کر باہر نکلتی ہیں اور اُس کاروبار میں برابر حصّہ لیتی ہیں جس کا بارِ خانہ داری نے اُن کے کندھوں پر ڈال رکھا ہے۔ وہ گھر میں آرام سے بیٹھنے کی عادی نہیں ہیں بلکہ باہر چل پھر کر اتنی ریاضت کر لیتی ہیں جو اُن کی صحت کے لئے ایک حد تک ضروری ہے۔ اسی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے بھی کہ وہ گھروں کی کثیف ہواؤں کے عوض میں باہر کی نسبتاً تازہ اور بہتر ہوا سے استفادہ حاصل کرتی رہتی ہیں اُن کی صحت ہندستان کی مسلم عورتوں کی صحت سے کئی درجہ بہتر ہوتی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ بھی ہمارے حضرات علماء کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔

تعلیم نسواں پر بھی اُنہوں نے زور دیا اور اس امر پر تاسف کا اظہار کیا کہ علما اس سے بالکل بے پروا ہیں بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو حد درجہ محدود کرتے ہیں۔ آخر میں اُنہوں نے فرمایا کہ:۔

یہ اور اسی قسم کی اور چند اہم ضرورتیں ہیں جن پر ندوۃ العلمار کے ذمہ دار حضرات کو دوسرے ذمہ دار علمار کی شرکت کے ساتھ خاص توجہ اور اُس کے بعد عمل کی ضرورت ہے جس کی طرف میں اُنہیں ادب کے ساتھ آج دعوت دے رہا ہوں اور یہ اُمید کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں وہ جلد سے جلد غور اور فکر شروع کردیں گے تاکہ اُن کی توجہ اور اُن کا علمی اشتغال (جس کا اسلام آج محتاج ہے) وہ خدمت انجام دے سکے جو مسلمانوں کے امراض کی حقیقی دوا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر بھی حکیم صاحب نے علمار کو متوجہ کیا اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرقہ پرستی کے ہنگامہ میں اب علمار کی ایک جماعت بہت نمایاں حصہ لے رہی تھی۔

حقائق کے آئینہ میں دیکھئے کہ ندوہ کے پلیٹ فارم پر آج سے ۲۳ سال پہلے حکیم صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ آج بھی کم و بیش اس قابل ہے کہ بار بار دُھرایا جائے۔

شاید کوئی کمتر درجہ کا آدمی ان ہی حقائق کو زیادہ سخت اور غیر سنجیدہ الفاظ میں ادا کرتا، لیکن یہ اُن کی وضع نہ تھی وہ کڑوی بات آہستگی سے فرماتے تھے اور نشتر سے تلوار کا کام کبھی نہ لیتے

تھے۔ پھر بھی اجلاس میں علمائے کرام کے "اقتدار" کو اُن کے الفاظ نے بہت زیادہ صدمہ پہنچایا اور رنج و غصہ کا اظہار اُن کے خلاف تو نہ ہو سکا لیکن وہ بادل ظفر علی خاں صاحب کے سر پر برس پڑے۔ اور علمائے کرام کی جماعت میں یہ بادل تو ہر وقت برسنے کے لئے تیار رہتے ہیں!

دسمبر میں بمقام گوہاٹی کانگریس کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا لیکن حکیم صاحب اپنی طبیعت کی افسردگی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اُنھوں نے ایک پیام بھیج دیا جس میں پھر ایک دفعہ فرمایا کہ :-

> اگر کانگریس نے اسے ایک اہم مقصد سمجھ کر ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی راہ عمل پیدا نہ کی تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ کا سارا پروگرام خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو بیکار رہے گا۔

اُن کے دل کے ساز سے، جس کے بہت سے تار ٹوٹ چکے تھے وہی ایک آواز ہر دفعہ نکلتی تھی اور وہی ایک تخیُّل تھا جو مجروح ہو کر بھی زندہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اُن کی سیاسی زندگی کی ساری تفسیر تھی، یہی حاشیہ تھا اور یہی متن تھا! لیکن جس وقت وہ کانگریس کو متنبہ کر رہے تھے کہ اگر "ہندو مسلم اتحاد کی کوئی راہ عمل پیدا نہ کی تو سارا پروگرام بیکار رہے گا" اُسی زمانہ میں ہندو مسلم نفاق کا بدترین نتیجہ دہلی میں پیدا ہونے والا تھا۔ یعنی ۲۳ دسمبر کو سوامی شردھانند قتل کر دئے گئے اور مذہبی جنون کی قربان گاہ پر اُن کی جان قربان

ہوگی۔ حکیم صاحب اس واقعہ سے بیحد متاثر تھے اور جب چند گھنٹوں کے لئے دہلی آئے تو اُنہوں نے ہندو مسلمانوں سے اس واقعہ کے متعلق اپنی دلی نفرت اور رنج کا اظہار فرمایا۔ بلاشبہ اُن کی نظر میں اس سے بدتر واقعہ کوئی نہ ہو سکتا تھا اور ہندو مسلم نا اتفاقی کا یہ وہ شر تلخ تھا جس کی تلخی اجمل خاں سے زیادہ کسی شخص نے محسوس نہ کی ہوگی۔

اُن کی زندگی کا آخری سال شروع ہو گیا تھا، وہ سیاست کی کشمکش سے کنارہ کش ہو چکے تھے اور اُن کی طبی بصیرت نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ سال دو سال ہی کے اندر انہیں اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہنی ہوگی۔ اُن کو اب پبلک زندگی کے ان حوادث سے بے پروا ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اُن کی فطرت کا تقاضا اس کے خلاف تھا وہ آخر وقت تک بھی یہ نہ کر سکے اور گو عملی زندگی سے علیحدہ تھے لیکن دوسروں کی عملی زندگی سے ہمہ وقت تعلق خاطر رہتا تھا۔ اُن کا سانس اس آب و ہوا کے باہر ایک دن بھی نہ چل سکتا تھا۔ جن مشاغل نے اُن کی زندگی کا خاتمہ کیا وہی مشاغل درحقیقت اُن کی زندگی کا سہارا تھے۔

سفر کی آخری منزل

قلب کی کلفتوں اور مجروح جذبات کی سوزشوں کا آخری سال اجمل خاں کی عمر کا آخری سال تھا۔ وہ آزردہ خاطر، اور مایوس ہوکر دارِ فانی کی زندگی سے بیزار ہو چلے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ خود ایک بڑے طبیب تھے اور کچھ اس قدرتی احساس کی بنا پر جو ہر بہتر اور برتر انسان کے اندر اپنی زندگی کے آخری ایام میں پیدا ہو جاتا ہے، حکیم صاحب، اپنے بُلانے والے کی آواز کا انتظار کر رہے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ وقت آگیا ہے، ساعت موعود دور نہیں ہے اور اب سفر ختم ہونے والا ہے، کبھی کبھی اپنے خاص احباب پر اس کیفیت کا اظہار بھی فرما دیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ رام پور میں ایک نیاز مند نے اُن کے اصرار سے تنگ آکر جب عرض کیا کہ "حکیم صاحب آپ بُلا لیتے ہیں اور پھر رخصت ہونے کی اجازت نہیں دیتے، حالانکہ میرے کاموں میں سخت ہرج ہوتا ہے" تو وہ یہ بات سُنکر حسب معمول مُسکرائے نہیں بلکہ بہت سنجیدہ چہرہ بنا کر فرمانے لگے "کیوں میاں، اب ہماری صحبت سے گھبرا گئے، گھبراؤ نہیں اب یہ جھگڑا عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے"۔ رحلت سے دو دن پہلے کی یہ گفتگو ہے!

یوں تو اُن کی زندگی کی تمام دلچسپیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں، اور اُن کو اپنی منزل سامنے نظر آرہی تھی، لیکن اپنی زندگی کے ان آخری بارہ مہینوں میں بھی وہ اپنے تین مخصوص فرائض کو بدستور انجام دے رہے تھے، یعنی طبیہ کالج، جامعہ ملیہ، اور ہندو مسلم اتحاد۔ ان تینوں کے متعلق اُن کی دلچسپیاں علالت میں بھی وہی تھیں جو تندرستی میں تھیں، افکار و آلام کے ہجوم میں بھی وہی تھیں جو اطمینان و

طمانیت کی حالت میں۔ اجمل خاں کے کیرکٹر کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہی تھا کہ وہ جس مقصد کو سامنے رکھ لیتے تھے وہ ہمیشہ اُن کے سامنے رہتا تھا،

سیاست کے عملی میدان سے، جہاں ہندو مسلم آویزش کے سوا اب کچھ باقی نہ تھا وہ بہت دُور ہو گئے تھے۔ خود دہلی میں جب دسمبر ۱۹۲۶ء کے آخری ایام میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تو اُس میں شریک نہ ہوئے، لیکن اس زمانہ میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر خدا مجھ کو چند سال اور دنیا میں رہنے کی اجازت دے تو میں جامعہ کی بنیادوں کو مضبوط کر دوں، طبیہ کالج کے حالات سے وہ مطمئن تھے لیکن جامعہ ان کا سب سے کمسن بچہ تھا۔ آخر جنوری میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جامعہ کے پرنسپل بہار کا دورہ کر رہے تھے اور حکیم صاحب نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ بہار کے خاص خاص مقامات پر خود جا کر جامعہ کے لئے اپیل کریں گے،

بہار کا دورہ

چنانچہ آخر جنوری میں اپنی چھوٹی صاحبزادی کی شادی سے فارغ ہو کر حکیم صاحب بہار تشریف لے گئے۔ ۱۰ر فروری کی شام کو وہ پٹنہ پہنچے اور پانچ دن میں اُنھوں نے پٹنہ۔ باڑہ، بہار شریف اور مظفر پور میں تقریریں کیں اور ایک معقول رقم جامعہ کے لئے وصول فرمائی۔ اُن کی صحت اب جواب دے چکی تھی، لیکن اُن کا عزم اُن کو سنبھالے ہوئے تھا۔ بہار کے سفر میں پانچ دن تک رات اور دن اُنھوں نے سفر کیا، ایک ایک دن میں تین تین سو اور چار چار سو میل موٹر

میں سفر کرتے رہے، راستہ میں رُک رُک کر جلسوں میں تقریریں کیں، پٹنہ میں سیکڑوں مریضوں کو دیکھا اور ۵ ارفروری کو جب پٹنہ سے روانہ ہونے لگے تو بالکل پست اور شکستہ ہو چکے تھے اُس دن رات کو پٹنہ اسٹیشن کا ایک واقعہ یاد رہے گا جس سے اجمل خاں کی شخصیت کا ایک خاص انداز واضح ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اسٹیشن پر جب ریل کے ایک ڈبے میں سامان رکھا جانے لگا تو دو انگریزوں نے جو پورے ڈبے پر قابض تھے، اعتراض کیا اور سر علی امام کے صاحبزادے صفدر امام سے اُلجھ پڑے پندرہ منٹ تک ان سے اور صفدر امام سے سخت گھونسہ بازی ہوتی رہی اور بلاشبہ اُن میں سے ایک قوی تر "صاحب بہادر" اس قدر پٹ گئے کہ شاید عمر بھر میں نہ پٹے ہوں گے۔ جب ڈبے کے اندر یہ گھونسہ بازی ہو رہی تھی تو سر علی امام اور حکیم صاحب بھی اندر آ گئے، سر علی امام نے تو بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی مگر حکیم صاحب خاموش کھڑے ہوئے دیکھتے رہے اور جیسے ہی دونوں لڑنے والے الگ ہوئے اُنھوں نے دوڑ کر صفدر امام کو سینہ سے لگا لیا، گویا کہ اُن کی بہادری کی داد دی اور انتہائی شفقت کے ساتھ اُن کے چہرہ کا بوسہ لیا۔ اجمل خاں خود بہت مضبوط قلب رکھنے والے آدمی تھے اور دوسروں کے اندر بہادری کی شان دیکھ کر اُس کی قدر کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسے نوجوانوں سے بہت مانوس ہوتے تھے جن کے اندر اس قسم کا جوش (خصوصاً زبردستیوں کے مقابلہ میں) ظاہر ہوتا تھا۔ بیماریوں نے اُن کے جسم کو کمزور کر دیا تھا مگر اُن کے اندر عزت نفس کا یہ جذبہ جوانی

سے بستر مرگ تک یکساں قوی رہا۔ وہ دوسروں میں بھی یہی قوت اور یہی جذبہ دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ۱۶ فروری کو حکیم صاحب دہلی واپس آئے اور ۱۷ کو طبیہ کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔ طبیہ کالج کے متعلق اپنی آخری رپورٹ میں اُنہوں نے جو کچھ بیان کیا اور کالج کی جو ترقیاں پبلک کے سامنے پیش کیں وہ گویا اُن کے عہد کی کامیابیوں اور اُن کی کوششوں کا انتہائی نتیجہ۔

شروع مارچ میں لیجسلیٹو اسمبلی کے پریسیڈنٹ مسٹر پٹیل نے طبیہ کالج میں انعامات تقسیم کئے اور اپریل میں طبی کانفرنس کا اجلاس رام پور میں منعقد کرایا گیا۔ یہ آخری اجلاس تھا جس میں اجمل خاں شریک ہوئے۔ اور آخری دفعہ طبی تحریک کے سب سے بڑے معاون نواب رام پور مغفور نے اس اجتماع میں شرکت فرمائی۔ حکیم اجمل خاں اور نواب حامد علی خاں دونوں دوستوں کی یہ آخری نمود تھی۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب نے پنجاب پراونشل طبی کانفرنس کے بعض اندرونی جھگڑوں سے متاثر ہو کر جن کی بنیاد فرقہ واری تھی ایک تقریر فرمائی۔ پنجاب کی کمیٹی میں اطبائے یونانی کے ساتھ وید شریک نہ تھے اور رام پور کی کانفرنس میں پنجاب کمیٹی کے طرز عمل کے متعلق بہت زیادہ ردوکد ہو رہی تھی۔ اس موقعہ پر حکیم صاحب نے فریقین کو مخاطب کر کے اپیل کی کہ ادنیٰ قسم کے تعصبات کو ترک کر کے اور متحد ہو کر اپنے فن کی خدمت کریں۔

اس موقع پر پیغمبر طب اپنا آخری اور رخصتی خطبہ پڑھ رہا تھا،

اس کے بعد طبی تحریک کے کسی اجتماع میں اُس کی آواز نہیں سُنی گئی! وہ خود جانتے تھے کہ یہ موقعہ آخری ہے۔ رام پور کے طبی اجتماع کے موقعہ پر اجمل خاں کی صحبتوں کا نقشہ حکیم ذاکر حسین خاں صاحب نے اپنی یادداشت میں یوں کھینچا ہے کہ :-

اپریل ۱۹۲۷ء میں دارالریاست رام پور میں آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کا اجلاس ہونا تجویز ہوا۔ ۲۳ ر اپریل کی شب میں ہم سب لوگ رام پور پہنچ گئے صبح کو میں جناب شفاء الملک حکیم محمد عبدالمجید صاحب و جناب حکیم محمد عبدالمعید صاحب لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہونے کے قصد سے اُن کے کمرہ میں گیا یکایک میری نظر مسیح الملک رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، جناب ممدوح اُس وقت طب یونانی کے بعض مسائل کے متعلق تقریر فرما رہے تھے اور عالیجناب شفاء الملک حکیم عبدالحمید صاحب و جناب خواجہ کمال الدین صاحب و حکیم خواجہ شمس الدین صاحب و حکیم عبدالحبیب صاحب دریا آبادی ممبران انڈین میڈیسن بورڈ یوپی اپنی اپنی جگہ پر ممدوح مغفور کی تقریر سُن رہے تھے آخر میں آپ نے فرمایا کہ اپنی زندگی کا بہترین حصہ فن طب کی خدمت میں صرف کر کے اس کی بنیاد مضبوط قائم کر دی ہے اب آئندہ آپ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس مستحکم بنیاد پر عمارت بنا کر ہمیشہ کے لئے اس کو قائم رکھیں اور اُس کی ترقی کے ذرائع پیدا کریں سب سے آخر میں یہ فرماتے ہوئے اُٹھے کہ مجھ کو اپنی

زندگی کی اُمید اتنی بھی نہیں ہے کہ سال آیندہ کی کانفرنس
میں شرکت کرسکوں"

ایک دوسری جگہ اپنی یادداشت میں حکیم ذاکر حسین صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"حکیم صاحب اس وقت بہت زیادہ ضعف و اضمحلال محسوس
کر رہے تھے اور اپنی زندگی سے کچھ مایوس نظر آتے تھے۔
چنانچہ اُنھوں نے ایک تقریر میں فرمایا کہ میں شاید آیندہ سال
آپ لوگوں میں نہ ہوں"

رام پور کی کانفرنس سے کچھ روز پہلے حکیم صاحب کو ایک سخت ذاتی صدمہ پہنچ چکا تھا، اُن کو اپنی بہو، یعنی حکیم جمیل خاں صاحب کی اہلیہ سے بہت محبت تھی، وسط اپریل میں اس کے دفعتاً انتقال نے اجمل خاں کی زندگی کی جھکی ہوئی دیواروں کو اور بھی زیادہ جھکا دیا اور گو وہ کہتے کچھ نہ تھے، لیکن اس بہو کا غم اُن کی قوت برداشت سے زیادہ تھا، جب وہ اپنی زندگی کی آخری طبی کانفرنس میں مصروف تھے تو اپنے بعض خاص احباب سے فرمایا کرتے تھے کہ اب میرا دل ان ہنگاموں سے اُچاٹ ہو چلا ہے، غیب سے اُن کو اشارے ہو رہے تھے، کہ اب وہاں کیا کرنا ہے یہاں آؤ! لیکن وہ اپنے فرائض کی فکر سے پھر بھی غافل نہ تھے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ایک آخری کوشش | طبیہ کالج اور جامعہ کے علاوہ اُن کی

وابستگی ہندو مسلم نزاعات کے تصفیہ سے جس قدر تھی اس کا حال ان اوراق میں جابجا واضح ہوتا رہا ہے۔ جس طرح طبیہ کالج کے لئے اپنی آخری کوشش سے وہ فارغ ہوئے، اور جامعہ کے لئے اپنی زندگی کا آخری دورہ اُنہوں نے کیا، اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے متعلق اپنی زندگی کی ایک آخری کوشش وہ کرنا چاہتے تھے۔
۲۶ء کے بعد ۲۷ء میں بھی ہندوستان کی قومی زندگی ہندو مسلم نزاعات میں مبتلا تھی، ہر طرف خون بہہ رہا تھا اور لاٹھیاں چل رہی تھیں، خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں اپنے اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھیں۔ خلافت کمیٹی کو ابن سعود کی مخالفت میں اس قدر غلو تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے حج کی ممانعت کے احکام صادر کررہی تھی اور دوسری طرف پنجاب کے بعض مسلمان جو ابن سعود کے حامی تھے، "شمع حرم کے پروانوں" کو حجاز جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ گویا اسلام کا یہ فرض عین بھی اب سیاسیات عامہ اور اختلاف باہمی کا ہدف بنا ہوا تھا!! کانگریس میں سوراجیوں اور نوچینجروں کی آویزش ہنوز جاری تھی، جب یہ حال تھا تو ہندو مسلمان غنڈوں کے لئے میدان خالی تھا۔ ۲۷ء کے اہم فسادات اور ہندو مسلم بلووں کی ایک مختصر فہرست بھی بہت طویل ہو گی۔ اگر اُن شہروں کے ..... نام بھی لکھ دیئے جائیں جہاں ۲۷ء کے ابتدائی مہینوں میں فرقہ واری فسادات ہوئے تو حالات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ نام تمام ہندوستان کے صوبوں پر پھیلے ہوئے ہیں مثلاً

بھاگلپور، اندور، باریسال، بمبئی، پونا، غازی پور،

لاڑکانہ، دہلی، علی گڑھ، لاہور، داناپور، ملتان، شولاپور، بریلی، اُناؤ، چمپارن، کانپور، ناگپور، سکندرآباد، پانی پت، دہرہ دون، جبل پور، گڈھ مکتیشر، رہتک، ندیا، ترنتارن، بیتیا، باسم، کومیلا، پٹوا کھلی، آگرہ اور ان میں سے بہت سی جگہ دو دو اور تین تین مرتبہ بلوے ہوئے، گویا کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرا کہ کہیں نہ کہیں ہندستان کے ہندو مسلمانوں نے اپنی انسانیت کو رسوا نہ کیا ہو۔ اس فضا میں بھی ہندو مسلم اتحاد کی جدوجہد کو جاری رکھنا حکیم صاحب ہی کا کام تھا۔

شروع جون میں ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر دہلی کے ہندو مسلمانوں کے نمایندوں کا ایک جلسہ شریف منزل میں منعقد ہوا۔ جس میں قربانی اور دیگر مسائل پر غور کیا گیا اور ایک مصالحتی بورڈ قائم کیا گیا جس کے صدر حکیم صاحب منتخب کیے گئے۔ اُسی زمانہ میں اُنھوں نے ایک پبلک جلسہ میں دہلی کے ہندو مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :-

"میں گزشتہ دو سال سے علیل ہوں۔ علالت کے باعث میں اس قابل نہ تھا کہ کسی پبلک جلسہ میں تقریر کر سکوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور اس کے لئے کوشش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ہندو مسلمانوں کے ساڑھے تین سال کے جھگڑے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس امر پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ لڑائی سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔

کیا ان لڑائیوں کی وجہ سے ہندوؤں نے یہ اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ ان کا یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ مساجد

کے سامنے باجہ بجائیں یا مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ وہ ہندوؤں کا باجہ مساجد کے سامنے روک دیں۔ ہندو مسلمانوں نے کوئی حق ایسا حاصل نہیں کیا غرض مسجد اور باجہ کا سوال ساڑھے تین سال کی لڑائیوں کے بعد بھی فیصل نہ ہوا اور یہی حال قربانی گاؤ کا ہے۔ سیاسی اختلاف بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ساڑھے تین سال کے تجربہ کے بعد ہم ان معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں ہم کو لڑائی جھگڑوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔"

اس تمام جد و جہد کا اتنا نتیجہ تو ہوا کہ عید الضحیٰ کے موقعہ پر دہلی فساد کی آگ سے کسی نہ کسی طرح بچ گئی۔ لیکن عام حالات قابو میں نہ آسکے اور حقیقت یہ ہے کہ اجمل خاں کے نصیب میں اپنی اس آرزو کا پورا ہونا لکھا ہی نہ تھا۔ ستمبر میں شملہ پر ہندو مسلمانوں کے سمجھوتہ کی گفتگو شروع ہوئی اور دو تین ہفتہ اس کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم صاحب جو خرابیٔ صحت کے باعث دہرہ دون میں مقیم تھے، دو دفعہ اسی سلسلہ میں شملہ تشریف لے گئے لیکن دونوں قوموں کے ۵۰ نمائندوں کی جد و جہد کے باوجود کانفرنس کا نتیجہ صرف اتنا ہی نکلا کہ عارضی طور پر ایک کمیٹی بن گئی جس نے نزاعی مسائل کی ایک فہرست تیار کرلی، لیکن خود اس کمیٹی ہی میں ہندو مسلمانوں کے مزاج کی حدّت رنگ لائی اور آخر موتمر کے منتشر کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور حکیم صاحب،

ڈاکٹر انصاری اور دیگر قائدین کی ساری کوششیں فرقہ پرست مسلمان اور ہندو تائیین کی ضد اور زبردستی پر قربان ہوگئیں۔ اس مرض کا علاج اب کانفرنسوں اور کمیٹیوں کی طاقت سے بالکل باہر ہوچکا تھا، شملہ کانفرنس میں دو سخت مزاج فریق اُن کے لئے بہت تکلیف کا باعث ہوئے، ایک طرف مہا سبھائی جن میں سے ایک (ڈاکٹر مونجے) نے ناگپور میں اعلان کردیا تھا کہ ہندو اپنے ڈنڈے سے مسلمانوں کو جواب دیں اور دوسری طرف پنجاب کے بعض لیڈر جن میں سے ایک (ظفر علی خاں) نے شملہ کانفرنس میں ڈنڈا اُٹھاکر اور یہ کہہ کر اپنے غیض غضب کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا کہ "میں ہندو کے ڈنڈے سے ڈرنے والا نہیں"۔ اجمل خاں ان دونوں انتہا پسند فریقین سے مایوس اور ناخوش تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنی یادداشت میں اُس زمانہ کا یوں ذکر فرماتے ہیں کہ :-

> مارچ ۱۹۲۷ء میں دلی میں مختلف سیاسی خیالات کے مسلمان لیڈروں کی ایک میٹنگ مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوئی اس میٹنگ میں مسلمانوں کی طرف سے یہ پیشکش ہندوؤں کو کی گئی کہ مسلمان مشترکہ انتخاب اس شرط پر منظور کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ایک تو ان کی نشستوں کا تحفظ ہر صوبے میں آبادی کے تناسب سے کردیا جائے۔ (۲) مرکزی لیجسلیچر میں انکی نمایندگی ایک تہائی رکھی جائے (۳) سندھ صوبہ بمبئی سے علیحدہ کردیا جائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو وہی ریفارم دیئے جائیں جو تمام ہندوستان میں نافذ ہوں۔

جو صورت حال اس وقت پیدا ہو چکی تھی اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے بہت فراخ حوصلگی کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھایا گیا تھا۔

"اپریل ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بمبئی میں ایک جلسہ کیا اُس میں مسلمانوں کی اس تجویز کو چند فروعی ترمیمات کے ساتھ پاس کیا اور اس طرح ہندو مسلمانوں کے درمیان سیاسی اختلاف کو دور کرنے کا حل پیدا کیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندو مہا سبھا نے اپنے جبلپور کے جلسہ میں اس تجویز کو ٹھکرا دیا"

"شمالی ہند میں ہندو مسلم فسادات کی یہ حالت ہو گئی کہ کوئی روز ایسا نہیں ہوتا تھا کہ اخباروں میں کسی نہ کسی جگہ سے ان واقعات کے ہونے کی خبر نہ آتی ہو اور جان و مال تلف نہ ہوتے ہوں۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کی اپیلیں بالکل بے اثر تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہندو مسلمان نہ ایک دوسرے کو انسان سمجھتے تھے اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ معمولی انسانی سلوک کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایک دیوانہ پن ایک سودا اُن کے سر پر سوار تھا جس نے اُن کے ہوش و حواس کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ اور وہ جامۂ بشریت کو بھی اُتار کر پھینک چکے تھے۔ اس زمانہ میں لارڈ اروِن وائسرائے ہند نے ایک اپیل شائع کی تھی جس میں ہندستان کو بہت کچھ غیرت دلائی

تھی۔ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں جبکہ اسمبلی کا اجلاس شملہ میں ہو رہا تھا خلافت کی ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ شملہ میں بلائی گئی اور وہاں مسٹر شعیب قریشی اور میری کوشش اور اصرار سے یہ بات طے ہوئی کہ یہ دونوں صاحب خلافت کمیٹی کے نمایندہ کی حیثیت سے مہاسبھائی اور کانگریس کے لیڈروں سے ملیں اور اس کی کوشش کریں کہ شملہ میں ایک یونٹی کانفرنس منعقد کی جائے اور ہندو مسلم اختلافات کو طے کیا جائے چنانچہ وہیں اسمبلی کے کمیٹی روم میں یونٹی کانفرنس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد کی گئی جس میں دو ہفتہ تک متواتر سمجھوتہ کی کوشش کی گئی لیکن ہندو مہاسبھائی لیڈروں کی طرف سے اتنی دشواریاں اور دقتیں پیش کی گئیں کہ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور یہ کانفرنس بیکار ثابت ہوئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب اس کانفرنس میں برابر شریک رہے اور ہر طریقہ پر سمجھوتہ کے لئے کوشاں رہے‘‘

شملہ کی یونٹی کانفرنس میں مہاسبھائی لیڈروں کی روش دیکھ کر کانگریسی لیڈروں کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مصالحت میں برابر روڑے اٹکاتے رہیں گے چنانچہ صدر کانگریس مسٹر سری نواس آینگر نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کی سرپرستی میں ایک یونیٹی کانفرنس کلکتہ میں بلائی جس میں مذہبی اختلافات کے متعلق ہندو

مسلمانوں کے درمیان ایک سمجھوتہ طے ہوا جس کو بعد میں
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ نے بھی منظور کیا۔
اس سمجھوتہ کو نہ صرف کانگریسی مسلمانوں نے بلکہ
کانگریس کے باہر جتنے سربرآوردہ مسلمان تھے
سب نے پسند کیا البتہ ہندو مہاسبھائی لیڈروں
نے نہ صرف اس کو ناپسند کیا بلکہ اس قسم کے سمجھوتہ
کرنے کے حق کو چیلنج کیا؛؛

یہی وہ مہاسبھائی ذہنیت تھی جو اجمل خاں کو باربار مایوس کرچکی تھی اور اپنے آخری زمانہ میں وہ حسب عادت معتدل الفاظ میں مگر تلخ لہجہ میں اپنے احباب سے اس تکلیف دہ ذہنیت کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔ مگر باوجود اپنی مایوسی کے وہ اس مایوسی سے عام لوگوں کے طبائع کا متاثر ہونا پسند نہ کرتے تھے اور ہمیشہ ایسے موقعوں پر بہت احتیاط کے ساتھ اپنے خیالات بیان کیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایسوشی ایٹڈ پریس کے ایک نمائندہ سے حکیم صاحب نے ہندو مسلم فسادات کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے وہ آرزو، اُمید، اور توقعات سے لبریز تھے۔

جداگانہ حقوق کا پھندا

ہندو مسلمانوں کے تقسیم حقوق کے متعلق جولائی میں حکیم صاحب نے ایسوشی ایٹڈ پریس کو ایک واضح اور مفصل بیان دیا تھا جو بلاشبہ ان کی طرف سے اس جنگ کے متعلق جو ہندو مسلمانوں میں آئینی و سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے ہو رہی تھی، ایک

قول فیصل تھا جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حکیم صاحب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو کس قدر ناپسند کرتے تھے اور ہندستان کی متحدہ قومیت کے کس قدر آرزومند تھے۔ ایسوشی ایٹڈ پریس نے حکیم صاحب کا جو بیان شائع کیا وہ حسب ذیل ہے :-

"نمائندہ ایسوسی ایٹڈ پریس کا بیان ہے کہ حکیم صاحب موصوف نے نہایت پُرزور الفاظ میں اس تبدیلی ذہنیت پر اظہار مسرت فرمایا جس کی شہادت وہ تجاویز دے رہی ہیں جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے منظور کی ہیں۔
حکیم صاحب نے فرمایا اس کا تمام تر کریڈٹ ان مسلم محبّان وطن کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ایسی تاریخی حیثیت رکھنے والی تجویزیں مرتب کیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان تجاویز کو منظور کر کے ایک بار پھر اس کا مظاہرہ کر دیا کہ کانگریس ایک حقیقی قومی حیثیت رکھتی ہے۔
حکیم صاحب نے اس کے بعد مسٹر سری نواس آئنگر کے تدبر اور محبت وطن اور اخلاص مندی کا نہایت پُرزور الفاظ میں اعتراف فرمایا۔ حکیم صاحب موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا کہ معاملات کو طے کرنے کے لئے جس قدر حل سوچے گئے ہیں ان سب میں یہ موجودہ زیر بحث تجویزیں بہترین اور موثر ہیں۔ ہندو مسلم پیچیدگیوں کو طے کرنے کے لئے یہ نہایت منصفانہ فیصلہ اور حل ہے۔

نامہ نگار مذکور نے اس کے بعد حکیم صاحب سے دریافت
کیا کہ آپ کا اُس مخالفت کے متعلق کیا خیال ہے
جو کی گئی اور آپ کی رائے میں یہ تجویزیں جس طرح کہ
اُنہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے قبول کیا ہے
مسلم مفاد پر کیا اثر ڈالیں گے۔

حکیم صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "مجھے
معلوم ہے کہ ایسے مسلمان بھی ہیں جو ان تجاویز کو قبول
کرنے سے ہچکچاتے ہیں ان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے
کہ مشترکہ انتخاب میں ایسے ہی مسلمان امیدوار مجالس
قانونی کے لئے منتخب ہو سکیں گے جو ہندوؤں کے بڑے
دوست اور طرفدار رہیں یا ہوں اور وہ شاید اپنے
قوم کے حقوق کی اچھی طرح حفاظت نہ کر سکیں گے۔
اب دو ہی باتیں ہیں یا تو مسلمان اپنی دیگر معاصر اقوام
کے ساتھ صلح اور دوستی کے ساتھ رہیں یا اُن سے
غیر دوستانہ رویہ رکھیں۔ آخر الذکر صورت کا کیا نتیجہ
نکلے گا۔ اس سے بہت سے لوگوں کے دل پریشان و
مضطرب ہیں۔ میرے خیال میں تو خود نیابت جداگانہ
اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے بالکل غیر موثر ہے
بلکہ بجائے نفع کے نقصان پہنچا رہی ہے، وہ قومی اتحاد
کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کا کام دے
رہی ہے بلا اس قومی یکجہتی و اتحاد کے جُداگانہ نیابت

بمبئی ۔ مدراس ۔ ممالک متوسط۔ ممالک متحدہ ۔ بہار اور آسام میں کس طرح مسلم حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔

ممالک متحدہ کے سوا باقی تمام صوبجات میں اگر گورنمنٹ کے ممبران بھی مسلمان ممبروں سے متحد ہو جائیں اور اُن کے ساتھ رائے دیں تب بھی وہ اقلیت ہی میں رہینگے۔ جب ایسا ہے تو انتخاب جدا گانہ سے آخر کیا حفاظت ممکن ہو گی ۔ آپ شبہات و بے اعتمادی کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر محافظت حقوق کی صدا بلند نہیں کر سکتے ۔ آپ کو کسی قابل عمل حل کا طریقہ اختیار کرنے سے قبل فرقہ وار کشیدگیوں کو دور کرنا ہو گا ۔ میرے خیال میں مشترکہ انتخابات ایک بہت اچھا اقدام ہے جو ہم کو منزل مقصود کی طرف لے جائے گا ۔ بجائے دیگر موثر حفاظتوں کے اختیار کرنے کے مسلمانوں کو خوشی کے ساتھ اُس کو منظور کرنا چاہیئے۔ یہ ممکن ہے کہ ہندو رائے عامہ کا ایک مسلم نمائندے کے انتخابات میں کوئی خاص اثر پڑے مگر جب ایک سے زیادہ ہندو امیدوار ہوں گے تو مسلمان رائیوں کی اہمیت سے قطع نظر کرنا ناممکن ہو گا ۔ اسی باہمی اثر کے ذریعہ سے ایک صحیح نمائندہ کا انتخاب ممکن ہو سکے گا اور بڑی حد تک موجودہ فرقہ وارانہ فضا درست ہو سکے گی ''

نامہ نگار مذکور نے اس کے بعد سوال کیا کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کو نیابت میں زیادتی اور کثرت حاصل ہے مسلمان رائے دہندوں کی کمی ہے اور اس صورت میں بھی ایک مسلمان امیدوار کے انتخاب پر ہندو رائے عامہ کا اثر پڑے گا تو اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے۔

حکیم صاحب نے جواب دیا کہ "ہاں موجودہ حالات میں یہ خیال صحیح ہے لیکن مسلمانوں کے لئے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ اس پوائنٹ پر اپنے جائز مطالبہ کو پیش کریں۔ مجوزہ سمجھوتہ تو میرے خیال میں معاملات کو طے کرنے اور ایک قابل عمل اسکیم ڈھونڈ نکالنے کی حقیقی خواہش پر مبنی ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا اہتمام ممکن ہو سکے گا کہ مسلمانوں کی قوت رائے دہندگی کو ان صوبوں میں بڑھایا جائے جہاں کہ ان کو زیادہ حق نیابت حاصل ہے۔ اگر اقتصادی کمزوری اس امر میں مانع ہوگی اور اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان رائے دہندگی کا حق نہ پا سکیں گے اور اپنے افلاس کے باعث اس معیار پر نہ آ سکیں گے جس پر رائے کا حق ملتا ہے تو ان کے لئے یہ معیار ضرور نیچا کر دیا جائیگا مثال کے طور پر مسلمانان بنگال یا پنجاب کو لیجئے کہ ان کو کچھ زیادہ اکثریت حاصل ہے اگر ان کی جماعت

کی حق رائے کی قوت میں اس حد تک اضافہ ہوا، جہاں تک اُن کو نیابت میں اکثریت حاصل ہے تو اُن کو اُن کا جائز حق ملے گا۔"

"نامہ نگار مذکور نے اس کے بعد سوال کیا کہ حکیم صاحب آپ یقیناً واقف ہوں گے کہ گورنمنٹ جداگانہ انتخاب کی کبھی بہت زیادہ دلدادہ نہ تھی۔ آپ اس عام شبہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو زیادہ تر مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں ہے کہ ۱۹۱۹ء کی تحقیقاتی کمیشن کے بعد گورنمنٹ مشترکہ انتخاب کے اصول کو قبول کرلے گی۔ لیکن بمبئی سے سندھ کی علیحدگی اور صوبجات سرحدی و بلوچستان کو اصلاحات دئے جانے کی تجویز کو مسترد کردے گی۔ کیا اس سے مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچے گا؟

حکیم صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "اگر مسلمان مشترکہ انتخاب کے خواہشمند ہوں تو بھی اب شاہی آئینی کمیشن کو اس کے نافذ کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اور آپ مسلم رائے عامہ کا حوالہ دیتے ہیں تو مسلم رائے عامہ تو اس پر بھی مجبور کرسکتی ہے کہ وہ شرط جس کو اُنہوں نے مشترکہ انتخاب کے نفاذ کے لئے لازمی قرار دیا ہے منظور کی جائے۔ علاوہ بریں اس تجویز کو اب کانگریس نے قبول کرلیا ہے اور بطور قومی مطالبہ کے اب یہ جوش اور قوت کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کا قرینہ ہے کہ آخر میں حکومت کو اُسے منظور ہی کرنا پڑے گا۔ ایک متحدہ قوت اعتماد اور دماغی صلاحیت کے ساتھ اگر ہم کام کریں گے تو کوئی بات محال یا غیر ممکن نہ رہے گی۔"

نامہ نگار مذکور نے اس کے بعد سوال کیا کہ اچھا ممالک متحدہ کے مسلمانوں کی بابت آپ کا کیا خیال ہے جو اس نقصان کا بہت زیادہ احساس کرتے ہیں جو اُن کو مجوزہ انتظام کی بدولت پہنچے گا۔

حکیم صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "ممالک متحدہ کے مسلمانوں کے خیالات و حسیات بظاہر قوی معلوم ہوتے ہیں میرے خیال میں بہترین ہندوستانی مسلمانوں کے ایک حصّہ کی وہ نیابت و نمائندگی کرتے ہیں اس وجہ سے میں اُن سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ معاملات کو ایک تنگ نقطۂ نظر سے محض صوبہ داری محاذ کی بنیاد پر نہ دیکھیں بلکہ معاملات پر وسیع نظر ڈالیں اور خیال کریں کہ اس صورت میں بہ حیثیت مجموعی ہندوستانی مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ وہ اگر اس نقطۂ نظر سے معاملات پر غور کریں گے تو میرا خیال ہے کہ اُن کو وہی تجاویز قبول و پسند ہوں گی۔ علاوہ بریں ۱۴ فیصدی کے بجائے ۳۰ فیصدی نیابت کا مل جانا معاملہ کی نوعیت کو نہیں بدل دیتا آخر ۳۰ فیصدی بھی تو اقلیت ہی ہے۔"

نامہ نگار مذکور نے اس کے بعد کہا کہ بظاہر اگر وہ گورنمنٹ کے ممبران کی تائید حاصل کریں تو کیا وہ ہندو اکثریت سے اپنی حفاظت کرسکیں گے؟

حکیم صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "ہاں، اگر ممالک متحدہ کے مسلمان سرکاری افسران کے ہمنوا ہو جائیں اور ایسے معاملات میں بھی ان کے شریک ہو جائیں جو تمام ملک کے لئے مضر ہوں تو اُن کو سرکاری ووٹ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن میرے خیال میں صوبجات متحدہ کے مسلمان اس ناگوار پوزیشن کو اختیار کرنے سے بہت بلند ہیں۔ مختصر یہ کہ انہیں افسران سرکاری کی رائے کو اپنی تائید میں شمار نہ کرنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں وہ ۴۰ فیصدی بھی اپنے حقوق کی کس طرح حفاظت کرسکیں گے۔ یہ محض ہندو مسلمانوں کے باہمی اعتماد ہی سے ممکن ہے اور اس طرح ۱۴ فیصدی نیابت بھی اتنی ہی اچھی ہے جس قدر کہ ۳۰ فی صد۔"

اس کے بعد نامہ نگار مذکور نے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں مختلف جماعتیں ہر جگہ سختی کے ساتھ اپنی نیابت پر قناعت کریں گی اور اس کے بعد وہ مراعات کی درخواست نہ کریں گی؟

حکیم صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہر اقلیت کا یہ فطری رجحان ہوتا ہے کہ وہ مراعات طلب کرے

میرے خیال میں دونوں جماعتوں کو مراعات کا سوال
مختلف صوبوں میں اپنی اپنی اقلیت کے متعلق طے کر لینا
چاہئے۔ میری رائے میں یہ خیال کرنے سے کہ یہاں
کچھ اور وہاں کچھ اور کی حکمت عملی پر کام کر کے باہمی اتحاد
اور بہتر تعلقات قائم ہو سکتے ہیں کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔
اب تو مجھے اُمید کرنی چاہئے کہ مسلمانوں کی تمام جماعت
اس قدر قومی جذبات اور سیاسی بلند حوصلگی کا مظاہرہ
کرے گی جس سے وہ تجویزیں جو مختلف جماعتوں کے
نمائندوں نے طے کی ہیں قبول کی جا سکیں۔ مجھے توقع
ہے کہ ان پسندیدہ تجاویز کے اصلی محرک اور کانگریس
کے لیڈر کافی قوت کے ساتھ اس سلسلہ میں وسیع پروپگنڈہ
رائے عامہ کو ہموار بنانے کے لئے کریں گے تاکہ عوام
کو اس کا اچھی طرح احساس ہو سکے کہ مجوزہ تبدیلیوں
کے کس قدر مفید اور درست نتائج نکل سکتے ہیں"

یہ بیان تفصیل کے ساتھ اس لئے نقل کیا گیا کہ جو لوگ یہ گمان کر رہے تھے کہ آخر زمانہ میں حکیم صاحب فرقہ واری جذبات سے متاثر ہو گئے تھے انہیں معلوم ہو جائے کہ اُنہوں نے آخر وقت تک فرقہ واری مسائل میں اپنا توازن کس حد تک قائم رکھا تھا۔ گو کہ یہ بحث اب بالکل بعد از وقت ہے لیکن اس کا ذکر کرنا حکیم صاحب کے سیاسی تصورات کے تذکرہ کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔

اُس بدبختی کے زمانہ میں عقل و فہم کی یہ آخری آواز، آرزو اور

اُمید کی یہ آخری جھلک اُس شمع سحر کا دم واپسیں تھا جس کا شعلہ چند مہینوں کے اندر بجھ جانے والا تھا۔ ہندو مسلم اختلافات کا جو آخری حل اُس وقت سوچا گیا تھا وہ اگر فرقہ پرستوں کی علی تابُد سے محروم نہ رہتا تو یقیناً آج نہ دو قومی نظریہ وجود میں آتا اور نہ ملک کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا۔ اس تجویز کی مخالفت سب سے زیادہ ہندو مہاسبھا نے کی اور ہندو مہاسبھا کے ہم آواز اُس وقت کانگریس کے چند لیڈر بھی تھے۔ گزشتہ ۳۰ سال میں کئی دفعہ ہندو مسلم اتحاد کا جہاز اقلیت کے حقوق اور مشترکہ انتخاب کی چٹان سے ٹکرایا اور بالآخر غرق ہو گیا۔ مہاسبھا اور اُس کے دوستوں کی کم نظری اور تنگ دلی نے جو بیج اُس وقت بویا تھا اُس کا تلخ ثمر آج ہم کھا رہے ہیں۔

شروع نومبر ۲۷ء میں رام پور و بھوپال سے واپس تشریف لاکر حکیم صاحب پھر ہندو مسلم اتحاد کی ٹوٹی ہوئی ڈوری میں گرہیں لگانے لگے۔ شریف منزل میں مسلمانوں سے مشورے کرنے کے بعد ۳ رنومبر کی شام کو اُنہوں نے ہندو مسلمانوں کے ایک عام جلسہ میں تقریر فرمائی۔ اُس وقت بھی انتہا پسند ہندوؤں کی عام ذہنیت یہ تھی کہ جب جلسہ کے دوران میں مسٹر سری نواس آئنگر نے کہا کہ "زمانہ قدیم میں ہندو بھی اپنے دیوتاؤں کے روبرو گائے کی قربانی دیتے تھے۔ اور اس لئے انہیں مسلمانوں کو گائے کی قربانی بند کرانے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے" تو ہندوؤں کی طرف سے بہت شور و غوغا ہوا اور آوازیں آنے لگیں کہ ان الفاظ کو واپس لیا جائے۔ اس لئے کہ یہ ایک جھوٹ

ہے۔ اس پر مسٹر سرینواس کو اپنے الفاظ کی تاویل کرنا پڑی۔ جس پر شور بند ہو گیا۔ جلسہ کی ابتدائی کارروائی پُرامن رہی۔ ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی نے رواداری کے لئے حاضرین سے استدعا کی۔ اور اس امر کا اعلان کیا۔ کہ موتمر اتحاد کلکتہ کی قراردادیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے حد فاصل قائم کرتی ہیں۔ مسٹر سرینواس نے اس امر پر زور دیا کہ وہ گائے کی قربانی کے مسئلہ کو مسلمانوں کی رواداری پر چھوڑ دیں۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کو چاہئے کہ مساجد کے روبرو باجہ بجانے کے معاملہ میں ہندوؤں پر اعتماد کریں۔

اس طرف ہندو مسلمانوں کو باہمی اعتماد کی تلقین کی جارہی تھی اور دوسری طرف خاص دہلی میں عبدالرشید قاتل شردھانند کے جنازہ کا جلوس باعث فساد بنایا جارہا تھا۔ اس جلوس کے سلسلہ میں آٹھ ہی دس دن بعد دہلی کے ہندو مسلمانوں میں خونریزی ہوئی۔ بعض اخبارات نے حکیم صاحب کے متعلق یہ خبر شائع کی کہ وہ جیل کے دروازہ پر عبدالرشید کی نعش کو لینے گئے تھے اور جلوس میں شریک تھے۔ عام ہندوؤں کے خیالات میں اب اجمل خاں کے متعلق معمولی حُسن ظن کی گنجایش بھی باقی نہ تھی! حکیم صاحب نے فوراً بذریعہ اخبارات اس خبر کی تردید کی مگر اپنے ہموطنوں کی اس بے اعتمادی سے انہیں جو روحانی صدمہ ہوتا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اُن کے لئے ان حالات میں کانگریس کی تمام جدوجہد بے معنی تھی۔ جب حکومت نے اعلان کیا کہ آئندہ آئینی اصلاحات کا فیصلہ کرنے کے لئے سرکاری کمیشن مقرر ہوگا اور جب یہ

معلوم ہوا کہ کمیشن میں ہندوستانیوں کے نمائندے شریک نہ کئے جائیں گے تو بجا طور پر کانگریس نے کمیشن کے مقاطعہ کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اب اس قسم کی جد و جہد اس مرض کا علاج نہ تھی جو اجمل خاں کے دست شفا کا بھی مرہون منت نہ ہو سکا تھا۔ خود حکیم صاحب اب اپنا زیادہ وقت دہلی کے خاندانی مطب میں یا رام پور کے شاہی محل کی عزلت میں گزار رہے تھے۔

جامعہ ملیہ کے متعلق آخری تقریر۔ شروع نومبر میں جامعہ ملیہ کے جلسہ میں آخری دفعہ شرکت فرمائی، اس موقعہ پر مہاتما گاندھی کا جامعہ کی جانب سے خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اپنی مختصر تقریر میں حکیم صاحب نے جامعہ کے مطمح نظر اور اصول کار کو آخری دفعہ صاف صاف بیان فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

"جامعہ ملیہ گو کہ تحریک عدم تعاون کی یادگار ہے اور اس کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں رکھی گئی تھی جبکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اُن طلبہ کے لئے تعلیمی آسانیاں مہیا کی جائیں جو مہاتما گاندھی کے اعلان پر سرکاری مدارس چھوڑ کر آئے تھے۔ مگر جامعہ نے سیاست میں کوئی حصّہ نہیں لیا بلکہ قوم کے بچّوں کو صحیح قومی تعلیم دی۔ سرکاری مدارس میں آج کل جو تعلیم دی جاتی ہے اُس میں قومی مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ صرف ان ہی لوگوں کے لئے مفید ہے جو سرکاری عدالتوں میں جاتے ہیں اور باقی لاکھوں ہندوستانیوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا یہ جامعہ اس ضرورت کو محسوس کر کے قائم کیا گیا تھا۔"

اس تقریر میں اُنھوں نے اپنے اس اصول کار کو بالکل واضح کردیا تھا جو جامعہ کے متعلق وہ ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔ اور جس کی بنا پر مولانا محمد علی مرحوم اور اُن کے ہم خیال حضرات سے وہ ہمیشہ اختلاف رائے کرتے رہے اور جس کی خاطر اُنھوں نے آخر عمر میں جامعہ کا سارا بار اپنے کاندھوں پر لے کر اس کو علیگڑھ سے دہلی منتقل کرلیا تھا۔ وہ اپنے اصول کی صحت پر اس قدر وثوق رکھتے تھے کہ جامعہ کے اخراجات کا ایک حصہ اکثر اپنی جیب سے ادا فرماتے تھے اور کبھی دیکھنے والوں کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی کہ جامعہ بغیر عام چندوں اور رؤسا کے عطیات کے کیوں کر چلایا جارہا ہے۔ اُن کا دست کرم پردہ میں رہ کر درازہوتا تھا اور اُن کے چندہی احباب اس امر واقعہ سے باخبر تھے کہ آخر زمانہ میں خود حکیم صاحب کی ذاتی آمدنی کا کتنا حصہ جامعہ کی نذر ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی اس آخری تقریر میں فرمایا تھا وہ جامعہ کو عام سیاسیات سے جُدا رکھ کر محض آزاد قومی تعلیم کا مرکز بنا رہے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اُس کے تعلیمی مقاصد سیاسیات کی کشمکش میں پڑ کر فوت ہو جائیں۔ زمانہ نے ثابت کردیا کہ اُنہیں کا بنایا ہوا راستہ صحیح تھا اور الحمدللہ کہ اُن کی سب سے چھوٹی مگر سب سے زیادہ محبوب اولاد معنوی اُن کی وفات کے بعد بھی اُسی راستہ پر ترقی کررہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ حکیم صاحب کبھی دل سے طلبا کے مدارس چھوڑ کر سیاسیات میں شریک ہونے کو پسند نہ کرتے تھے۔ مگر وہ کانگریس و خلافت کمیٹی کے حکم اور فیصلہ سے منہ موڑنا بھی گوارا نہ کرتے تھے اور اس لئے علی گڑھ کالج اور تارکین موالات کی کشمکش میں ایک حد تک حصہ لیتے رہے۔

جامعہ کے اس آخری اجتماع میں شرکت کے بعد وہ رام پور تشریف

لے گئے اور پھر صرف ایک دفعہ اور مجمع عام میں نمودار ہوئے۔ وہ موقعہ امان اللہ خاں شاہ افغانستان کے بمبئی میں آمد کا موقعہ تھا۔ تمام اسلامی ممالک اور خصوصاً افغانستان سے اجمل خاں کا محبت بھرا دل بہت مانوس تھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ افغانستان سفر یورپ کے سلسلہ میں بمبئی بھی آئیں گے تو باوجود صحت کی خرابی کے اُنھوں نے ایک دفعہ اُن سے ملنے اور اُن کے سامنے خراج محبت بذات خاص پیش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ دوستوں نے بہت سمجھایا مگر صحت کی انتہائی خرابی بھی اُن کے شوق پر حاوی نہ ہو سکی۔ نواب فیض احمد خاں صاحب بیان فرماتے تھے کہ کئی دن سے کمر میں چک آ گئی تھی اور اُس زمانہ میں اس قابل بھی نہ تھے کہ بغیر امداد کے کروٹ لے سکیں، لیکن بمبئی کے سفر کا سامان تیار ہو رہا تھا۔ اس حالت میں بھی اہل غرض اور مریضوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا، نواب صاحب موصوف نے ایک دفعہ خاص طور پر جا کر سمجھایا کہ کاموں کو بند کر کے صحت کی طرف توجہ کیجیے۔ وہ فرماتے تھے کہ میرے اس کہنے پر چیں بجبیں ہو گئے۔ اور فرمایا کہ "نواب صاحب اس معاملہ میں کچھ نہ فرمایا کیجیے"، یعنی کوئی کام بند نہیں ہو سکتا۔ صحت اچھی ہو یا بُری۔ یہ عزم یہ ارادہ یہ جوش عمل تھا جو گور کے کنارے تک اُن کا ہمدم و دمساز رہا۔ اول تو امان اللہ خاں سے ملاقات کا شوق پھر اُن کے روبرو جامعہ کی عرضداشت پیش کرنے کا مقصد اور اس میں کامیابی کی امید یہ خواہشیں اُن کے دل میں تھیں جو اُن کا ہاتھ پکڑے ہوئے اُن کو بمبئی لئے جا رہی تھیں۔

ایک نیازمند نے عرض کیا کہ یہ حالت کسی طرح سفر کے قابل نہیں، یہ سفر نہیں خودکشی ہے، فرمایا سچ کہتے ہو مگر میری زندگی کی یہ آخری تمنا ہے

کہ امان اللہ خاں سے دو باتیں کر لوں۔ موت تو بہر حال آنی ہے" اس حالت میں کہ گھر سے اسٹیشن تک، خدام و احباب کے کندھوں کا سہارا لے کر اور اسی طرح اسٹیشن سے ریل گاڑی تک سخت تکلیف برداشت کرکے وہ پہنچے اور بمبئی کے لئے سوار ہو گئے۔ ۱۳ر دسمبر کو وہ بمبئی پہنچے اور ۱۴ر کو پہلی دفعہ امان اللہ خاں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس تخلیہ میں عرصہ تک وہ امیر سے گفتگو کرتے رہے۔

۱۶ر دسمبر کو اُنہوں نے مجمع عام میں جامعہ کی طرف سے سپاس نامہ پیش فرمایا۔ وہ سپاس نامہ خود ان ہی کا لکھا ہوا تھا اور فارسی زبان میں اُن کی ادبی قابلیت کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ افسوس کہ اس کی کوئی نقل باوجود تلاش کے حاصل نہ ہو سکی۔

آخری سفر اور سفرِ آخرت

۲۶ر دسمبر کو بمبئی سے دہلی واپس تشریف لائے دن بھر قیام کرنے کے بعد شب کی گاڑی سے رام پور کی طرف روانہ ہوئے، اس آخری سفر میں خواجہ عبدالمجید صاحب اُن کے ساتھ تھے اسٹیشن پر مولانا مظہرالدین صاحب اڈیٹر اخبار الامان خدا حافظ کہنے حاضر ہوئے تو چلتے چلتے اُن سے فرمایا کہ "مولانا لارڈ ہیڈلی دلی تشریف لا رہے ہیں، افسوس ہے کہ میں یہاں نہ ہوں گا۔ مگر آپ خواجہ کمال الدین صاحب سے دریافت کر لیجئے کہ کب اُنکو رام پور بلایا جائے۔" اس وقت کس کو معلوم تھا کہ چار دن بعد اُن کے بجائے صرف اُن کا جسد خاکی رام پور سے دہلی واپس آئے گا! یوں تو چند سال سے وہ آنتوں کی تکلیف میں مبتلا رہتے تھے اور قولنج کے دوروں نے اُن کی جسمانی طاقت کو بہت

گھٹا دیا تھا، لیکن سفر بمبئی سے دو تین مہینہ پہلے رام پور ہی میں اُن کو ایک دورہ قلب کی اس بیماری کا ہوا جس کو طب انگریزی کی اصطلاح میں ANCINA PECTORIS کہا جاتا ہے۔ یہ وہی مرض تھا جس نے جوانی میں پہلے سفر عراق سے چند روز پہلے اُن پر حملہ کیا تھا اور پھر بعد کو بھی اُس کے ایک دو دورے پڑ چکے تھے۔ لیکن درمیان کے پندرہ بیس سال وہ مرض جسم کی کسی تاریکی میں بے حرکت رہا، جب دوسرے قوی ماؤف ہو گئے تو پھر قلب کی اس خطرناک تکلیف نے عود کیا۔ جب وہ بمبئی تشریف لے گئے تو اس مرض کے دو تین دورے ہو چکے تھے، پھر بمبئی کی مشغولیت کے بعد وہاں بھی اُن کو ایک شب شدید دورہ پڑا۔ وہ ہمیشہ اس دورے کا فوری علاج یہ کرتے تھے کہ گرم پانی پی کر قے کر دیتے تھے اور ایسا کرنے سے مرض کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ ۲۷، اور ۲۸ر دسمبر کو وہ رام پور میں رہے اور اس وقت وہ کمزور ہو چکے تھے، غذا کئی دن سے محض برائے نام تھی، لیکن بظاہر مزاج کی کیفیت بدستور تھی، ہز ہائنس کی صحبت میں گھنٹوں بیٹھا رہنا، دوست احباب سے تفریح و تفنن، تاش کی بازیاں، اور بلیرڈ، یہ تمام مشاغل بدستور جاری تھے اور بادی النظر میں، وہی اجمل خاں تھے جن کی ہر ادا دوستوں کے لئے بالیدگی روح اور کیف محبت کا سامان تھی۔ ۲۸ر کی سہ پہر کو بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے، "ڈپٹی صاحب" (عبدالمجید خاں مرحوم وظیفہ یاب ڈپٹی کلکٹر) سے حسب معمول تفریح و تفنن کا سلسلہ جاری تھا، یہ چھیڑتے تھے، وہ بگڑتے تھے، پھر ہنس پڑتے تھے۔ لوگوں کو بلا بلا کر دکھایا جا رہا تھا کہ "دیکھو ڈپٹی صاحب ہار رہے ہیں" پھر شام کے لئے "ڈپٹی صاحب" سے بلیرڈ کے میچ طے ہو رہے تھے

اور اُن کو جتایا جا رہا تھا کہ "دیکھنا تم ہارو گے" اُن کے خاص اور عزیز دوستوں میں ایک ڈپٹی صاحب ہی تھے جن کو وہ کبھی کبھی "تم" کہہ کر پکار لیتے تھے، کبھی اس سے بھی زیادہ کچھ فرما دیتے تھے! شب کو کھانا نہ کھا سکے اور کچھ دیر ہز ہائنس کے پاس بیٹھ کر ۱۰ بجے کے قریب اپنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ پھر کوٹ پہن کر برآمدہ میں ٹہلتے رہے اور ۱۱ بجے کے بعد بستر پر لیٹ گئے ابھی آکر لیٹے ہی تھے کہ ہز ہائنس کے چوبدار نے اطلاع دی کہ "یاد فرماتے ہیں" حکیم صاحب نے فرمایا کہ جا کر کہہ دو میری طبیعت اس وقت نا درست ہے، صبح حاضر ہوں گا۔ اس جواب کے تھوڑی ہی دیر بعد ہز ہائنس خود تشریف لے آئے حکیم صاحب بستر سے اُٹھنے لگے مگر ہز ہائنس نے اصرار کیا کہ آپ لیٹے رہیں۔ تکیہ کا سہارا لئے ہوئے ہز ہائنس سے باتیں کرتے رہے ایک بجے کے قریب ہز ہائنس تشریف لے گئے مگر حکیم صاحب نے چیف سکریٹری کو یہ کہہ کر روک لیا کہ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ دن میں موقعہ نہیں ملتا ذرا بیٹھ جائیے۔ وہ پلنگ ہی پر اُن کے پاس بیٹھ گئے ابھی سلسلہ کلام شروع ہی کیا تھا کہ قلب کی تکلیف شروع ہوئی صاحبزادہ عبدالصمد خاں صاحب نے تکلیف کو محسوس کر کے دریافت کیا کہ خیریت ہے کیا ہوا، فرمانے لگے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ ذرا گرم پانی منگوائیے۔ ادریس کو حکم دیا گیا کہ وہ گرم پانی لائے سوء اتفاق کہ غسلخانہ کے نل میں اُس وقت گرم پانی نہ تھا لہٰذا ادریس کو باہر بھیجا گیا کہ وہ گرم پانی کے خزانہ سے پانی لائے۔ وہ اس طرف گیا، اور یہاں کرب زیادہ ہونے لگا دو چار مرتبہ کروٹیں لیں، کچھ کراہے، اور ابھی

چیف سکریٹری یہ بھی نہ سمجھے تھے کہ ہو کیا رہا ہے، دفعتاً ایک طرف کو کروٹ لی ایک خفیف جھٹکا جسم میں معلوم ہوا اور فطرت اعلیٰ کی آواز پر لبیک کہہ کر رخصت ہو گئے۔ انتہائی تکلیف میں بھی زبان سے کچھ نہ فرمایا۔ صرف ایک دفعہ اتنا تو کہا کہ "اللہ! کیا کروں" اور اُس کے بعد قفس خاکی میں وہ جو حقیقی اجمل خاں ۴۶ برس قید رہے، وہ نہ تو "خاص باغ" میں تھے نہ رام پور میں تھے نہ اس خراب آباد دنیا میں!

۲۹ر دسمبر کی صبح کو ۲ بجکر ۱۵ منٹ پر یہ بلند اقبال مسافر اپنی منزل حقیقی پر پہنچا اور دنیا کا یہ اولعزم قیدی زندگی کے تمام کلفتوں آنسوؤں اور آہوں سے آزاد ہو کر اُس لازوال سکون مطلق میں تحلیل ہو گیا جہاں زندگی دائم اور لافانی ہے۔

آخری شام

باوجودیکہ میں نے ان صفحات کی ترتیب سے اپنے اور حکیم صاحب کے ذاتی تعلقات اور اُس محبت و عقیدت کے ذاتی تاثرات کو جُدا رکھا ہے جو میری جذباتی زندگی پر حاوی رہے ہیں۔ لیکن ان اوراق کے خاتمہ پر اُن کی زندگی کا آخری دن ـــ اُس دن کا ہر لمحہ ـــ کچھ اس طرح میرے حافظہ میں زندہ ہے کہ گویا کل ہی وہ ہم سے رخصت ہوکر اپنے وطن حقیقی کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید میری زندگی کے آخری لمحہ تک اجمل خاں اُسی طرح زندہ رہیں گے جس طرح میں نے اُن کو اُن کی زندگی کے آخری دن دیکھا تھا۔

اُن کی محبت و شفقت اور میری نیازمندی کا ایک مستقل دستور اور ضابطہ یہ تھا کہ جب وہ رام پور تشریف لاتے (اور عموماً مہینہ میں ایک دو مرتبہ ضرور تشریف لایا کرتے تھے) تو اگر رات کا وقت نہیں ہے تو رام پور پہنچتے ہی پہلا حکم یہ ہوتا تھا کہ موٹر مراد آباد جائے اور "قاضی صاحب" کو لے کر آئے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا اور میرے لئے بھی ناممکن تھا کہ یہ حکم آئے اور میں اس کی تعمیل نہ کروں۔ رات کو میں رام پور میں نہ ٹھہرتا تھا لیکن صبح کو جانا اور شام کو واپس آنا یہ ایک ناگزیر معمول تھا اور اگر کوئی دن ناغہ ہو گیا تو اُن کی محبت کا وہ عتاب اور میری نیازمندی کا وہ حجاب اپنے اندر کچھ ایسی لذت رکھتا تھا جس کا ہر لمحہ آج تک مجھے یاد ہے!

۲۸ر دسمبر کی وہ صبح مجھے یاد ہے جب میں موٹر سے اُتر کر خاص باغ محل کے اُس کمرہ میں داخل ہوا جہاں وہ مقیم تھے۔ پہلی ہی نظر میں مُسکراتے ہوئے چہرہ کو پژمردہ پایا۔ معلوم ہوا کہ دو دن سے غذا نہیں ہوئی اور مزاج غیر معمولی طور پر مضمحل ہے۔ جس وقت میں کمرہ میں داخل ہوا تو برج ہو رہا تھا حسب معمول ڈپٹی صاحب کو ہرانے کی کوششیں جاری تھیں اور اُن پر محبت بھرے فقرے چست کئے جا رہے تھے۔ ۱۲ بجے کے بعد جب برج ختم ہوا اور احباب رخصت ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ اب کچھ کھانا ضرور کھا لیجئے فرمایا "قاضی صاحب" بالکل خواہش نہیں۔ جی چاہا تو سہ پہر میں چاء کے ساتھ کچھ کھا لوں گا۔ اس کے بعد کچھ مریض آ گئے اور وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر ایک گھنٹہ کے لئے آرام فرمایا۔ چار بجے اُٹھے تو میں نے چاء منگائی اور بہ اصرار ایک ٹوسٹ مکھن لگا کر دیا جو اُنھوں نے با دل ناخواستہ کھایا اور شاید یہ آخری غذا تھی۔

اس دن شام کو میرے مکان پر کسی کمیٹی کا کوئی جلسہ تھا اس لئے جب وہ ہوا خوری کے لئے اُٹھے تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں آج ذرا جلد واپس چلا جاؤں۔ وہ گفتگو آج تک مجھے حرف بحرف یاد ہے:-

اجازت ہو تو میں آج ذرا جلد واپس چلا جاؤں۔

جی نہیں!

حکیم صاحب ایک خاص ضرورت کے تحت ....

جی نہیں!

حکیم صاحب۔ میرے مکان پر شام کو ایک اجتماع ۔۔۔۔
جی نہیں! قاضی صاحب میں فضول باتیں سُنتا ہی نہیں کرتا!
مگر حکیم صاحب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
جی ہاں۔ میں سب سمجھتا ہوں اب آپ میری صحبت سے اُکتا گئے ہیں۔
نہیں تو حکیم صاحب مگر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
جی نہیں۔ جی نہیں۔ وہ دیکھئے ٹامس کک کا آدمی آرہا ہے میں نے اُسے بلایا تھا کہ ایران کے سفر کا پروگرام بنالیں ـــــ آپ کو بھی تو میرے ساتھ چلنا ہے!
حکیم صاحب میرے حالات آپ کو معلوم ہیں۔ اے کاشکہ میں آپ کے ساتھ چل سکتا۔
قاضی صاحب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اب مجھے کچھ زیادہ زندہ رہنا ہے۔ یہ تو ہماری آپ کی آخری ہمسفری ہوگی۔ پھر ہمارے بعد آپ آزاد ہوں گے!
میری آنکھوں میں آنسو تھے جن کو روک کر میں خاموش بیٹھ گیا اور وہ ٹامس کک کے نمایندے کی طرف متوجہ ہو گئے تقریباً ایک گھنٹہ تک افغانستان و ایران کے سفر کا پروگرام بنتا رہا۔ اُس شخص کے جاتے ہی میری طرف اس طرح مخاطب ہوئے کہ گویا مجھے روانگی کی اجازت مانگنے کا موقعہ ہی دینا نہیں چاہتے!
آئیے قاضی صاحب" آج ڈپٹی صاحب کو سخت شکست

دی جائے گی یہ فرما کر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور بلیرڈ کے کمرے کی طرف تشریف لے چلے۔

بلیرڈ کا کھیل لمبا تھا اور ڈپٹی صاحب کو شکست دینے کی کوشش میں مزاح و تفنن اور معنی خیز مسکراہٹوں کی آمیزش اس قدر تھی کہ میں اُن کے فقروں کا لطف اُٹھانے میں بار بار کھیل ہی کو بھول جاتا تھا۔ لیکن مجھے جب یاد آتا کہ جلد واپس جانا ضروری ہے اور اس ارادہ سے اُن کے قریب جاتا کہ اب پھر اجازت مانگوں تو وہ میرے ارادہ کو سمجھ کر میز کے دوسری طرف چلے جاتے اور وہاں کھڑے ہو کر مسکراتے میں اس طرف بڑھتا تھا تو وہ دوسری طرف ہٹ جاتے اور بلیرڈ کے علاوہ یہ ایک دوسرا کھیل تھا — محبت اور عقیدت کا — جو میرے اُن کے درمیان جاری تھا! ایک دفعہ قریب پہنچ گیا تو پہلے اس سے کہ کچھ کہوں ارشاد ہوا:-

جی نہیں! قاضی صاحب! جی نہیں!!

محبت کے اس آمرانہ انداز کا کبھی کوئی جواب — کوئی رد — مجھ سے بن نہ پڑتا تھا۔

آخر کھیل ختم ہوا اور میں اُن کے ساتھ ساتھ اُن کے کمرہ میں آیا۔ اب شام کے کوئی (۷) بج گئے تھے میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

قاضی صاحب! مہلت بہت مختصر ہے۔ ہم اور آپ

جس قدر زیادہ بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں غنیمت سمجھئے!!

میں اپنے آنسو روکے ہوئے خاموش تھا۔

پھر کچھ سوچ کر فرمایا۔

میں جانتا ہوں آپ کا ہرج ہوگا۔ اب اس وقت تو چلے جایئے لیکن شرط یہ ہے کہ صبح جلد سے جلد آجایئے آپ سو کر بہت دیر سے اُٹھتے ہیں!

عرض کیا۔

نہیں حکیم صاحب (۸) بجے صبح تک آجاؤں گا بشرطیکہ میرے لئے موٹر (۶) بجے یہاں سے روانہ ہو جائے!

اور یس! دیکھو ابھی ڈرائیور سے کہہ دو کہ صبح ۶ بجے یہاں سے روانہ ہو جائے اور ٹھیک (۸) بجے مراد آباد سے قاضی صاحب کو لے کر یہاں آجائے!

اُس شب میں ڈرائیور کو اس حکم کی چند گھنٹے پہلے ہی تعمیل کرنی پڑی اور مجھے اپنے وعدے سے پہلے ہی رام پور واپس آنا پڑا!

کم و بیش (۸) بجے مراد آباد پہنچا۔ (۱۱) بجے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر زنانہ مکان میں گیا۔ بستر پر لیٹا لیکن نیند کس طرح نہ آئی۔ ۲ بجے کے بعد تک کروٹیں لیتا رہا۔ میری لڑکی جس کا پلنگ میرے بستر کے پاس

تھا بار بار دریافت کرتی - ابا مزاج کیسا ہے آج آپ کو نیند نہیں آرہی ہے! اور میں کہتا سو رہو بیٹی! مجھے صبح ہی رام پور جانا ہے شاید اُس خیال میں نیند نہیں آرہی ہے۔

دو بج چکے تھے اور تین ابھی نہ بجے تھے کہ باہر سڑک پر کسی موٹر کے آنے اور ہارن بجنے کی آواز آئی - ہارن کی آواز سُن کر یہ تو میں سوچ ہی نہ سکا کہ یہ موٹر کس کی ہے اور کیوں اس سڑک پر ہارن بجا رہی ہے بلکہ ایک بے اختیاری کی حالت میں ویسے ہی بستر سے اٹھا کمبل اوڑھا اور سلیپر پہنے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ڈرائیور سے یہ بھی دریافت نہ کیا کہ اس وقت کیوں موٹر کار لایا دروازہ کھول کر اسی طرح کمبل اوڑھے ہوئے موٹر میں بیٹھ گیا۔ اُس وقت ڈرائیور کو کہتے ہوئے سُنا کہ حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا!! کچھ پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے!

———— (۵) ————

(۱۷) میل کا سفر (۱۷) ہی منٹ میں طے ہوا مجھے معلوم نہیں کہ کب میں خاص باغ محل میں پہنچا اور کب اُس کمرہ میں داخل ہوا جہاں میری عقیدت کی بہاروں میں اُن کی محبت کے پھول کھلا کرتے تھے!

———— بستر پر سفید کمبل سے ڈھکا ہوا وہ جسم پڑا ہوا

تھا جو روح کے رخصت ہو جانے کے بعد ایک بچہ کا
چھوٹا سا جسم معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنی دیر میں
اپنے عقیدتمند دل کی اس لٹی ہوئی بہار کو دیکھتا رہا۔
بس اتنا ہی یاد ہے کہ صبح کو جب غسل وکفن کے بعد
اجمل خاں کی حیات فانی کا یہ بے جان مجسمہ دہلی لے جانے
کے لئے موٹر پر رکھا گیا تو میں آخری دفعہ اُن کے قدموں
کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح ۲۵ دسمبر کی صبح کو
رام پور سے دہلی تک کا یہ سفر طے ہوا اور مجھے بار بار
گزشتہ صبح کی وہ بات یاد آرہی تھی جب اُنھوں نے
اپنے ساتھ ایک آخری سفر ۔ آخری ہمسفری ۔ کا
ذکر فرمایا تھا۔ یہ وہ آخری سفر تھا جس میں آخری دفعہ
اپنی زندگی کے بہترین دور کو میں نے اُس ایک مٹھی
بھر خاک کے ساتھ ختم کیا جو درگاہ رسول نما میں اُن کی
آخری آرام گاہ کے اندر میں نے ڈالی تھی !!

حکیم صاحب۔ایک انسان کی حیثیت سے

بتیس سال سے زیادہ گزر چکے جب اجمل خاں اس دُنیا سے رخصت ہوئے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گویا وہ ابھی ابھی گئے گئے ہیں۔اُن کی یاد کے نقوش اور اُن کی انسانیت کے آثار آج بھی اُن کے نیازمندوں کے لئے نظر افروز ہیں، زندگی کے نگارخانہ میں جب تک انسانیت کا وجود باقی ہے اور ہمارے دل انسانی فضائل سے آباد ہیں اُن کی تصویر دُھندلی نہیں ہوسکتی ؎

برزمینے کہ نشاں کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

مبالغہ آمیز مداحی سے قطع نظر اُن کے اخلاق و فضائل کی فہرست بہت طویل ہے۔ کاغذ پر جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں وہ عموماً ظاہری اعمال کی تصویریں ہوتی ہیں، روح کا عکس ان میں نظر نہیں آتا۔ آنکھ نے اجمل خاں کو دیکھا، دل نے پہچانا، مگر قلم اُن کی روحانیت کا خاکہ کھینچنے سے معذور رہا۔ اپنی معذوری کے اس اظہار کے بعد سوائے اس کے کیا کہوں کہ یہ داستان مکمل تو کیا کافی بھی نہیں ہے،

اجمل خاں کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے بہت سے پرتو تھے جن کو اصطلاحی زبان میں، ضبطِ نفس، استغنا، وسعت قلب متانت، دردمندی، اخلاقی عظمت، فراست، غیرت، عزت نفس، صبر و تحمل، خودداری، رواداری، دماغی ہمہ گیری، محبت، ہمدردی، اور شگفتہ مزاجی سے تعبیر کرسکتے ہیں، لیکن یہ اور ایسی ہی ہزاروں اصطلاحیں اجمل خاں کے نفسیات کی تشریح کے لئے ناکافی ہے۔

اجمل خاں یونہی بہت بڑے لیڈر، قوم پرست، ہندو مسلم اتحاد

کے داعی، بہت بلند پایہ طبیب اور اُستاد فن، بہت دوست نواز دوست، بڑے ہمدرد مصلح اور سب ہی کچھ تھے، لیکن اُن کی حقیقت ان تمام چیزوں سے بالا تر تھی اور بحیثیت ایک انسان کے جو اُن کا مرتبہ تھا وہ تمام دوسری حیثیتوں سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ دنیا کی مصروفیتوں میں دنیا کی ترغیبات سے بالکل مستغنی تھے، اُن کا استغنا، ایک فولاد کی چٹان تھا جس پر دنیوی ہوس اور مادی خواہشات و ترغیبات کے بڑے بڑے جہاز ٹکرا کر ٹوٹ جایا کرتے تھے۔ اُن کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ اگر دُنیا کی بڑی سے بڑی دولت اُن کو مل جاتی یا بڑی سے بڑی عزت اُن کو حاصل ہو جاتی تو یہ واقعہ اُن کی نظر میں پیش پا افتادہ ہوتا تھا۔ وہ فقیرانہ طبیعت رکھتے تھے اُن کے سر پر کوئی تاج بھی رکھ دیتا تو اُن کے قلب کے سکون اور استغنا پر اُس کا کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا۔ وہ کبھی حالات کے محتاج اور پابند نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اپنے ارادوں کی زنجیر میں گرد و پیش کے حالات کو باندھ لیا کرتے تھے۔ زندگی میں خصوصاً زندگی کے نصف آخر میں کامیابی اور ناکامیابی کا امتیاز اُن کی نظر میں فنا ہو چکا تھا۔ حصول زر کا جذبہ تو کبھی اُن کے اندر احتیاج کی حالت میں بھی پیدا نہ ہوتا تھا اور اسی طرح دولت کی محبت اُن کے دل میں کبھی جگہ نہ پا سکی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اپنے بعد اُنہوں نے اپنی اولاد کے لئے بمشکل تھوڑا سا اساسہ چھوڑا، حالانکہ اُن کی ذاتی آمدنی نان کو اپریشن سے پہلے بہت معقول تھی مگر ہندسوں کی کمی و بیشی اور چاندی سونے کا احساس اُن کے اندر کبھی پیدا نہ سکا۔ یہی اُن کے دل کی فقیرانہ کیفیت تھی جس نے اُن کی اخلاقی حیثیت کو

اس قدر بلند اور ارفع کردیا تھا۔ خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم ایک واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں :۔

"جس بات نے مجھے اُن کا گرویدہ کیا تھا وہ اُن کی سیرت تھی جس کا نمایاں پہلو بے ریائی۔ ایثار اور بے نفسی تھا۔ اُن کی اس خصلت کا ایک ورق میں یہاں لکھتا ہوں ۱۹۲۴ء میں حکیم صاحب مرحوم اور میں دونوں کشمیر میں تھے صبح کو سیر کرتے ہوئے ہمیشہ وہ میرے ہاں آتے اور وہیں چائے نوش فرماتے۔ ایک دن اچانک اُنہوں نے فرمایا کہ میں جوناگڑھ جاتا ہوں وہاں والئے جوناگڑھ کی ہمشیرہ علیل ہے اور وہ علاج کے لئے طلب کرتے ہیں۔

ضمناً آپ نے مجھ سے دریافت کیا کہ جوناگڑھ تک پہنچنے میں آسائش کس راستہ میں زیادہ ہوگی اور کم وقت کس لائن پر خرچ ہوگا۔ میں نے عرض کی کہ آسائش تو اجمیر لائن پر جانے میں ہے۔ مگر وقت کسی قدر زیادہ صرف ہوگا۔ بی بی۔ اینڈ سی۔ ای لائن سے سفر کرنے میں زحمت زیادہ ہے مگر وقت کم صرف ہوتا ہے اس لئے میں نے عرض کیا۔ چونکہ دہلی آپ کا گھر ہے اور عیال بھی آپ کے ہمراہ ہیں تو اجمیر لائن بہتر ہوگی جواب میں اُنہوں نے فرمایا کہ میں اُن کی تکلیف کا تو کوئی فکر نہ کروں میں اُنہیں یہ بتلاؤں کہ وقت کس

لائن پر کم خرچ ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو وقت
کا کیا خیال ہے۔ اس پر وہ ہنسے اور فرمایا کہ ریاست
مجھے یومیہ فیس اُس دن سے دیتی ہے جس دن سے
میں سری نگر سے چلوں اور فیس بھی ہزار روپیہ یومیہ
ہے۔ میں نہیں پسند کرتا کہ ریاست پر بے وجہ بوجھ پڑے۔
وکیل اور ڈاکٹروں کا پیشہ فیس کے معاملہ میں ملتا جلتا
ہے۔ میں خود وکیل رہ چکا ہوں اور میں خوب اندازہ
کر سکتا ہوں کہ مرحوم کا یہ ارشاد کس زبردست بے نفسی
کی دلیل تھا۔ یہاں یہ فقرہ میں نے ضرور کہا کہ اگر آپ
اجمیر لائن سے جاویں تو آپ فیس کے لئے کوئی حیلہ جوئی
نہیں کرتے البتہ آپ وہی کریں جس کا متقاضی حسن اخلاق
ہو۔ میں بھی لغرض ولایت دو چار دن کے بعد کشمیر سے
نکلنے والا تھا چنانچہ حکیم صاحب قبلہ کو روانہ کر کے
کوئی پانچویں دن میں بھی لاہور آ گیا دوسرے دن
بمبئی جانے کی فکر میں تھا کہ مرحوم کا ایک تار جوناگڈھ
سے آ گیا کہ میں جوناگڈھ کے راستہ آؤں اور
ان سے مل کر بمبئی جاؤں۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں
جوناگڈھ پہنچا۔ آپ سے بے تکلفی تو مجھے تھی ہی چنانچہ
آپ کی فرودگاہ پر قدم رکھتے ہی پہلا ارشاد یہ ہوا
کہ خواجہ کا اسباب ضبط کر لو اور وجہ کل بتلاؤں گا
میں نے عرض کیا کہ جہاز کی روانگی کا دن مقرر ہے

اور میں ٹکٹ خرید چکا ہوں کل تو مجھے روانہ ہو جانا
چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ دیکھا جائے گا اگلے دن
آپ نے فرمایا کہ فلاں کام ایک قومی اور مذہبی کام
ہے جو تمہارے سوائے سرانجام نہیں ہو سکتا اس لئے
اس ولایت کے سفر کو چھوڑ دو۔ میں نے عرض کی
کہ اگر میں ۱۰ - ۱۵ دن کے اندر بمبئی سے روانہ نہ
ہو جاؤں تو ویمبلے کی مذہبی کانفرنس میں شریک نہیں
ہو سکتا۔ وہاں مجھے اسلام کی نمائندگی کرنی ہے۔
آپ نے فرمایا کہ تمہارا نام تو چھپ چکا ہے اور وقت بھی مقرر
ہو چکا ہے۔ نذیر (میرا فرزند) وہاں موجود ہے وہ تمہاری
تحریر پڑھ دے گا۔ مجھے کچھ تامل تھا اس پر آپ نے فرمایا
تو اسباب تو ضبط ہو چکا ہے اب تم میری طرف سے
چلے جاؤ یہ میں جانتا ہوں کہ حکیم صاحب کا یہ اصرار
ایک قومی غرض پر مبنی تھا اور اس میں کوئی ذاتی غرض
نہیں تھی علاوہ ازیں ایسے مکرم کے ارشاد کے مقابل میں
کیا کر سکتا تھا لیکن جس بات کے لئے میں نے یہ رام کہانی
لکھی ہے وہ چوتھے دن واقع ہوئی۔ حسب معمول
آپ قصر شاہی میں تشریف لے گئے اور کچھ دیر کے
بعد واپس ہوئے۔ آتے ہی آپ نے حکم دیا کہ ان کا
اسباب باندھ دیا جائے اور وہ اسی شام کو روانہ
ہو جائیں گے۔ میرے استفسار پر آپ نے فرمایا میں

تین دن سے مریضہ کو بغور دیکھ رہا ہوں اور آج
میں اس نتیجہ پر آگیا ہوں کہ یہ غریب آج سے پندرہ
دن کے اندر فوت ہو جائے گی اور میرے علاج
سے اب اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ (مرحومہ تین ہفتہ
کے بعد فوت ہوگئی) لہٰذا آج کے بعد ریاست میں
ٹھیرنا ایک قسم کی حرام خوری ہے۔ میں نے بجواب
عرض کیا کہ آپ عالم الغیب تو نہیں اس پر آپ نے
کہا کہ یہ تو صحیح ہے لیکن جب میرے علم و یقین میں
ایک بات آچکی ہے تو میں اپنے ضمیر کے خلاف
کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ اسی رات جوناگڈھ سے
چلے گئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ ایکہزار
روپیہ یومیہ فیس پر گئے تھے۔ باتیں بنانے کو تو ہر
ایک قوم کا ریفارمر اور لیڈر بن جاتا ہے لیکن
غور کیجئے کہ حکیم صاحب کے خلق عظیم کا یہ رنگ ایثار کتنوں
میں موجود ہے۔ یہی ایک بھاری وجہ ہے جس نے
مرحوم کو اپنے مقاصد میں کامیاب کیا اور وہ ہندو
مسلمانوں میں ہر دلعزیز ہوئے۔"

اس واقعہ سے اُن کے استغنا اور بے نفسی کے کتنے پہلو ہویدا ہوتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی کے یہی نقوش ہیں جن کی نسبت میں نے شروع میں لکھا تھا کہ

سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

مرحوم میر اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی جو ایک زمانہ میں اکثر حکیم صاحب کے ہمسفر بھی ہوتے تھے اور سالہا اُن کی صحبت خاص میں شریک رہے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ریاست بوندی میں حکیم صاحب رئیس کا علاج کر رہے تھے اور اُن کو وہاں سے ایکہزار روپیہ روزانہ فیس ملتی تھی۔ پہلی دفعہ کے بعد جب دوبارہ وہاں بُلائے گئے تو اُسی علاج کے سلسلہ میں اس مرتبہ بوندی میں صرف دو دن ٹھیرے بوندی سے واپسی کے دن سفر خرچ اور فیس کا پرچہ میں نے بنا کر دیوان صاحب کو دیا۔ دیوان صاحب حکیم صاحب کے سوار ہونے سے دو گھنٹہ قبل کُل رقم لے کر تشریف لائے اور حکیم صاحب کے حکم سے وہ رقم مجھے دی گئی میں نے اُسی وقت حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کی حکیم صاحب مرحوم نے دیوان صاحب کو بلوایا (جو کوٹھی کے دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے تھے) دیوان صاحب کے آنے پر حکیم صاحب نے اپنی فیس کی رقم میں سے نصف رقم دیوان صاحب کو واپس دی اور یہ فرمایا کہ :۔

> مجھے معلوم ہوا ہے کہ ریاست مقروض ہے اس وجہ سے میں بجائے ہزار روپیہ یومیہ کے پانسو روپیہ یومیہ لوں گا۔ یہ سُن کر دیوان صاحب نے کچھ سکوت کے بعد عرض کیا کہ حکیم صاحب آپ کے نصف فیس لینے سے کیا ریاست قرض سے سبکدوش ہو جائے گی لاکھوں کا بار سیکڑوں یا ہزاروں کی کمی سے پورا نہیں ہو سکتا اور اس وقت تو یہ رقم خزانہ سے اسی مد میں برآمد ہو چکی

ہے۔ اس وقت تو قبول فرمالیجئے، حکیم صاحب مغفور نے فرمایا
کہ اگر آپ مجھے آئندہ بھی بلانا چاہتے ہیں تو یہ نصف رقم
خزانہ میں جمع کرا دیجئے۔ دیوان صاحب نے مجبور ہو کر یہ
رقم واپس لے لی۔ حکیم صاحب کے ایثار کی یہ ایک
روشن مثال تھی جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔
اس قسم کے بہت سے واقعات اُس وقت بیان ہو سکتے ہیں
جب حکیم صاحب کے مطب کی داستان لکھی جائے گی۔"

اجمل خاں کی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو اُن کی "خودداری" اور غیرتِ نفس تھی جو کسی حال میں کم نہ ہوتی تھی نہ کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو سکتی تھی۔ اُن کی زندگی کے ہر دن میں اُن کے عزتِ نفس کی بیسیوں مثالیں ملا کرتی تھیں۔ اور اگر کسی نے اُن کا روزنامچہ لکھا ہوتا تو اس جیسی ہزار سوانح عمریاں بھی اُس باوقار و باتمکین زندگی کے افسانوں کے لئے کافی نہ ہو سکتیں۔ شدید سے شدید اور سخت سے سخت حادثہ میں اُن کی متانت پر اضطراری جذبات حاوی نہ ہو سکتے تھے۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے موت کے مقابلہ میں بھی کبھی اپنے چہرہ پر شکن نہ آنے دیتے تھے۔ ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں ایک سخت زلزلہ شمالی ہندوستان میں آیا تھا۔ صبح کے وقت حکیم صاحب اپنے مطب میں مصروف تھے جب زلزلہ کے جھٹکے پے در پے محسوس ہوئے۔ مریض اور اطبا اور حاضرین سراسیمہ اُٹھ کر بھاگے، لیکن آدھے منٹ کے بعد لوگوں کو ہوش آیا تو اُنھوں نے دیکھا کہ حکیم صاحب بدستور اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں۔ اُن کے اس ضبط و تحمل نے بھاگنے والوں کو شرما دیا۔ اور مطب کا کام ایک منٹ میں اس طرح جاری

ہو گیا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جسمانی تکلیف اور بیماری میں بھی یہی شان تمکین اُن کے اندر اس درجہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی تکلیف کو کبھی زبان سے بیان کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ جرمنی کے مشہور سوانح نگار لڈوگ نے ایک موقعہ پر گوئٹے کی فطرت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

"اپنے قریب ترین دوست سے بھی وہ درحقیقت بے تکلف ہو کر نہ کھلتا تھا، مگر گفتگو کا کوئی مضمون ہو وہ کسی طرح بے تکان گفتگو کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت زیادہ اپنی خودی میں محدود ہو گیا ہے۔ مگر وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کا کمال رکھتا تھا۔ وہ معمولی خفیف اور بڑی بڑی عنایتوں سے اُن کے دلوں کو اپنے قبضہ میں کرنا جانتا تھا مگر ساتھ ہی خود اُن سے دور اور بلند رہتا تھا۔ اُس کی مہربانیاں زبان زد عام و خاص ہیں مگر وہ ایک دیوتا کی طرح سے اپنے کو کسی کے حوالہ نہ کر سکتا تھا"

اِن الفاظ میں جو گوئٹے کے لئے لکھے گئے تھے اجمل خاں کی ایک عجیب تصویر پوشیدہ ہے۔ اجمل خاں کی عظمت جس قدر اُن کے کاموں پر مبنی تھی اُتنی ہی اُن کی عجیب و غریب شخصیت میں مرکوز تھی۔ اُن کی قابلیت پُرشور نہ تھی، خاموش تھی۔ اُن کا اخلاق وسیع تھا مگر بے تکلف نہ تھا، اُن کی قوت جاذبہ قوی تھی مگر اضطراری نہ تھی، اُن کا بیان بہت با اثر تھا مگر اُن کی آواز آہستہ اور سُلجھی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان میں قدیم و جدید تہذیب کے درمیان ایک پل کی طرح تھے جو دونوں سے جُدا

ایک چیز تھا مگر دونوں کو آپس میں ملاتا تھا۔ اُن کی بے تکلف صحبتوں میں بھی آداب محفل کا قانون شکست نہ ہوسکتا تھا۔ معمولی چیزوں میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھی حدادب" قائم رہتی تھی۔ اناطول فرانس کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ:۔

"دل میں احساس فرائض کا جوش اور سطح پر ایک سکون مطلق تھا"

تلخ کلامی نہ خود کرتے تھے نہ سُن سکتے تھے۔ ہنگاموں میں اُلجھنا پسند نہ کرتے تھے اور اکثر پبلک کی ہنگامہ آرائی سے بے تعلق رہتے تھے۔ مگر اپنے دل میں ہنگاموں کی دُنیا آباد رکھتے تھے۔ لوگوں کی طرف دستِ کرم دراز تھا مگر دوسروں سے خود کوئی تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے ہوئے بہت گھبراتے تھے، یہ اُن کی فطری غیرت تھی جو احسان مند ہونا گوارا نہ کرتی تھی۔ گزشتہ سفر یورپ میں ایک دوست سے کچھ کپڑا خریدا، مگر اُنھوں نے قیمت نہ لی، پھر ایک جوتا اپنے فرانسیسی دوست کی بیوی کے لئے خریدنا چاہا اور پھر اُن دوست نے قیمت لینے سے انکار کیا۔ ایک دوسرے نیازمند کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"میدم گیآر کے لئے جو تحفہ آپ نے تجویز کیا ہے وہ مناسب تو ہے۔ لیکن .... کو اُس کی قیمت کس طرح ادا کروں۔ اُن کی دوکان سے پہلے کپڑا لے کر بالآخر مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ اُس کی قیمت ادا نہ کرسکا اب یہ جوتی کی قیمت کا اور بھی اضافہ ہوگیا"

غیرت کا یہ حال تھا کہ انتہائی انکسار کے باوجود جب عزت نفس

کا سوال آتا تو موم جیسی نرمی فولاد کی طرح سخت ہو جاتی۔ ایک دفعہ رام پور سے تشریف لا رہے تھے اور مراد آباد کے اسٹیشن پر دوسری ٹرین میں اول درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے، بستر بچھایا جا چکا تھا۔ ابھی لیٹے نہ تھے کہ اُسی درجہ میں ایک فرنگی تشریف لائے وہ اس کالے آدمی کو فرسٹ کلاس میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر بہت چیں بجبیں ہوئے جس برتھ پر حکیم صاحب کا بسترا لگا ہوا تھا اُس پر وہ خود قبضہ کرنا چاہتے تھے اس لئے آتے ہی دوسرے برتھ کی طرف اشارہ کر کے حکم ہوا کہ "ادھر جائیے گا" ایک دفعہ دو دفعہ، بار بار اُنگلی سے اشارے کے ساتھ یہ حکم جاری تھا۔ حکیم صاحب خاموش رہے اور متوجہ نہ ہوئے اتنے ہی میں اُس انگریز کا ملازم سامان لے کر داخل ہوا اُس نے حکیم صاحب کو پہچان لیا اور جب دیکھا کہ "صاحب" بگڑ رہے ہیں تو آہستہ سے اُن کو بتایا کہ یہ دہلی کے حکیم صاحب ہیں یہ سُن کر "صاحب" نے معاً اپنا رویہ بدل دیا اور کہنے لگا حکیم صاحب معاف فرمائیے ہم نے آپ کو پہچانا نہ تھا میں بیمار ہوں اور داہنی کروٹ سو نہیں سکتا اس لئے آپ کے برتھ پر سونا چاہتا تھا آپ دوسرے برتھ پر اپنا بستر لگا لیجئے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ آپ نے گفتگو کا یہ طریقہ پہلے ہی کیوں نہ اختیار کیا۔ اب تو میں یہ جگہ آپ کو ہرگز نہ دونگا۔ یہ معلوم کر کے کہ میں اجمل خاں ہوں آپ میرے ساتھ اخلاق کر رہے ہیں، مگر یہ دیکھ کر کہ میں ہندوستانی ہوں آپ نے اخلاق کے ساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت نہ سمجھی! یہ وہ زمانہ تھا

کہ اجمل خاں خاصانِ بارگاہِ حکومت میں سے ایک تھے، مگر اُس وقت بھی وہ انگریز کی انگریزیت سے بیزار رہا کرتے تھے۔اس کے بعد تو اُس زمانہ میں جب وہ حکومت سے قطع تعلق کرکے اپنی دولت اور صحت ملک کی خدمت میں بے دریغ صرف کر رہے تھے اس غیرتِ نفس کا اظہار اکثر موقعہ پر ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنی یادداشت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا ہے:۔

"سنہ ۱۹۱۷ء میں نواب سید حامد علی خاں صاحب رئیس رام پور کی علالت کے سلسلہ میں رام پور میرا آنا جانا اور قیام زیادہ ہوا اور حکیم صاحب کے ساتھ زیادہ یکجائی رہی میں نے حکیم صاحب سے اُس زمانہ میں بہت سبق سیکھے۔ حکیم صاحب کی جیسی اخلاقی جرأت اور دھ بھی بہت دشوار اور نازک حالات میں کم دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک روز نواب صاحب محرم کے زمانہ میں دسویں تاریخ کی شب کو تعزیوں کے دفن کے بعد کربلا میں کچھ انتظامات کے سلسلہ میں ریاست کے ایک بڑے عہدہ دار سے ناراض ہو گئے۔ نواب صاحب نے غصہ کی حالت میں بہت کچھ سخت وسُست کہا اور چھڑی سے اُن کو پبلک میں مارا۔ اس واقعہ سے حکیم صاحب کو اور ریاست کے تمام عہدہ داروں کو بہت دلی تکلیف پہنچی اور سب نواب صاحب سے برانگیختہ اور دل برداشتہ تھے۔ قلعہ کو واپس ہونے کے بعد

حکیم صاحب نے تمام عہدہ داروں کو بُلا کر ان کو سمجھایا کہ یہ حرکت جو نواب صاحب سے غصہ کی حالت میں سرزد ہوئی ہے یہ خود اُن کی ریاست کے لئے بہت بدنامی کا باعث ہے اور عہدہ داروں کی بھی اس سے بہت بے عزتی ہوتی ہے، لہذا آپ صاحبوں کا فرض ہے کہ بلحاظ ریاست کے ذمہ دار عہدہ دار ہونے کے ریاست اور رئیس کی خیر خواہی و نیک نامی کی غرض سے اور خود اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے لئے نواب صاحب سے اس معاملہ کے متعلق احتجاج کریں۔ ان کی غلطی اور ایک بڑے عہدہ دار کے ساتھ صریح ناانصافی اور بے عزتی کرنے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجئے اور اس غلطی کی مناسب تلافی کا مطالبہ کیجئے۔ میں اُس صحبت میں شریک تھا اور حکیم صاحب کا ہمخیال تھا لیکن رام پور کے ان عہدہ داروں کی جن سے حکیم صاحب نے یہ درخواست کی تھی عجب حالت تھی۔ حکیم صاحب کے خیالات کے درست اور بجا ہونے کا ایک طرف کامل اعتراف تھا لیکن دوسری طرف خوف کے باعث حوصلہ و ہمّت نہ تھی۔ یہ حضرات جب نواب صاحب کی طرف روانہ ہوئے تو بالکل ایسا ہی منظر تھا جیسے ایک قصاب بھیڑوں کے گلہ کو مذبح لے جاتا ہے۔ نواب صاحب کے کمرہ میں پہنچ کر یکے بعد دیگرے سلام کرکے

قاعدہ سے بیٹھ گئے اور حکیم صاحب اور میں بھی اخیر میں وہاں پہنچے۔ نواب صاحب نہایت دانشمند اور ذکی الحس تھے اور لوگوں کے تیور دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ سب اسی کربلا کے واقعہ کے متعلق کچھ کہنے آئے ہیں۔ فوراً اُنہوں نے قبل اس کے کہ کچھ کہا جائے یہ تذکرہ چھیڑ دیا کہ رئیس مثل ایک خاندانی باپ کے ہوتا ہے جس کو اپنی اولاد سے کبھی نرمی اور کبھی سختی کا برتاؤ کرنا پڑتا ہے۔ نہ تو اُس کی نرمی سے نہ اُس کی سختی سے متاثر ہونا چاہیئے کیونکہ یہ سب کچھ اپنی اولاد کی بہتری کی خاطر وہ کرتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ حکیم صاحب کی طرف رجوع ہوئے اور اُن سے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے۔ حکیم صاحب نے نہایت سنجیدہ اور صاف طور پر نواب صاحب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ تمثیل اولاد اور باپ کی بالکل صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد باپ اپنی اولاد کو نہ پبلک میں ذلیل کرتا ہے اور نہ زد و کوب کرنے کا اُس کو کوئی حق باقی رہتا ہے۔ اس خاص صورت میں تو رئیس رام پور نے پبلک میں اپنے ذمہ دار عہدہ دار کو ذلیل و رسوا کیا اس کی شہرت تمام قرب و جوار میں پھیل گئی ہوگی اور اس واقعہ سے عہدہ داران ریاست اور رئیس رام پور

کی بدنامی بہت ہوئی ہو گی اور اس واقعہ کے بعد اگر
اس کی تلافی نہ ہوئی تو کوئی ذی عزت اور باوقار
شخص ریاست رام پور میں ملازمت کرنے کے لئے
آمادہ نہ ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب
نے اُس عہدہ دار سے پبلک میں معافی مانگی، اپنی غلطی
کا اعتراف کیا اور بطور تلافی کے اس عہدہ دار کی
تنخواہ میں معقول اضافہ کیا!!

اجمل خاں کی خود داری کا ایک واقعہ ڈاکٹر انصاری صاحب
بیان فرماتے ہیں :-

"ایسے ہی ایک ایٹ ہوم میں حکیم صاحب کے مکان
پر ایک واقعہ ہوا جو قابل ذکر ہے۔ حکیم صاحب نے
ڈپٹی کمشنر دہلی سے میرا تعارف کرایا اور نہایت
اچھے اور میرے خیال میں اپنی محبت کے باعث کسی
قدر مبالغہ کے ساتھ میرے اوصاف بیان کئے،
ڈپٹی کمشنر کچھ زیادہ مخاطب نہ ہوئے اور نہ تلطف
کے ساتھ میرے ساتھ پیش آئے۔ حکیم صاحب جو بید
ذکی الحس تھے اس برتاؤ سے رنجیدہ خاطر ہوئے
اور اس برتاؤ کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر کو رخصت کرنے
دروازہ تک نہ گئے جیسی کہ اُن کی عادت تھی بلکہ
حکیم احمد سعید خاں کو اس کام کے لئے متعین کر کے
میری طرف ہمہ تن مخاطب ہو کر باتیں کرتے رہے جبتک

ڈپٹی کمشنر صاحب اس صحبت سے رخصت نہ ہوئے۔"

جس وقت حکیم صاحب کی شخصیت سیاسی زندگی میں ایک نمایاں درجہ حاصل کرچکی تھی اور اکثر والیان ریاست حکومت کی ناراضگی کے خوف سے اُن کو بغرض علاج بھی بُلانے کی ہمت نہ کرسکتے تھے، رام پور سے اُن کے تعلقات بدستور قائم تھے۔ ہز ہائنس خود ترک موالات کے سخت مخالف تھے۔ اور کھدر اور گاندھی ٹوپی کا گذر اُن کے محل میں ممکن نہ تھا، لیکن حکیم صاحب کا کھدر اور اُن کی ٹوپی محل کے قواعد سے بالاتر تھی اور خود ہز ہائنس کبھی اُن سے سیاسی معاملات پر اعتراضاً کوئی گفتگو نہ کرتے تھے اور اگر کبھی کرتے تھے تو صاف جواب پاتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک واقعہ اجمل خاں کی شخصیت کی بلندی اور ریاست کے تعلقات سے اُن کی بے پروائی کا بہت دلچسپ شاہد ہے۔ غالباً ۲۲ء میں حکیم صاحب گھوڑا کھال میں جو مینی تال کے قریب رئیس رام پور کی ایک بڑی جائداد تھی مقیم تھے، رات کو رام پور سے طلبی آئی، صبح کو بذریعہ موٹر حکیم صاحب روانہ ہوئے شام کو رام پور پہنچے خاص باغ میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے دیکھا کہ اسٹاف کے تمام ممبران خلاف معمول سر پر پگڑی باندھے ہوئے ہیں۔ اُن کو بتایا گیا کہ اب سرکار کا حکم یہ ہے کہ کوئی صاحب پگڑی باندھے بغیر اُن کے روبرو نہ جائیں۔ گویا یہ ایک اشارہ تھا کہ حکیم صاحب کو بھی پگڑی باندھنی چاہیئے۔ یہ سُن کر حکیم صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے اور اپنے ملازم کو حکم دیا کہ موٹر میں بازار جاؤ اور وہاں سے سفید کھدر کی گاندھی ٹوپی لے کر فوراً آؤ۔ اس

زمانہ میں عام طور پر حکیم صاحب استرخانی ٹوپی استعمال کیا کرتے تھے، تھوڑی دیر میں ملازم گاندھی کیپ لے کر آ گیا۔ اُس کو سر پر رکھ کر وہ "سرکار" میں تشریف لے گئے۔ ہز ہائنس نے آدھے منٹ اُن کی ٹوپی کی طرف دیکھا اور غالباً یہ سمجھ کر خاموش ہو گئے کہ "نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن"! اُن تعلقات کے باوجود جو رام پور سے حکیم صاحب کے تھے اور اُس محبت کے باوجود اُن کو نواب سید حامد علی خاں مغفور سے تھی۔ اُن کی عزت نفس رئیس کے ایسے احکام کی پابندی نہ کر سکتی تھی اور اُن کی شخصیت کا وزن اس قدر زیادہ تھا کہ اس باب میں کوئی اُن سے سوال بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ آن بان اجمل خاں ہی کے لئے مخصوص تھی۔

موجودہ نظام حیدر آباد نے ایک مرتبہ حکیم صاحب کو حیدر آباد طلب کیا۔ پہلی ملاقات کے لئے آداب شاہی کا یہ ضابطہ اُن کو بتایا گیا کہ کوئی شخص نظام کے سامنے بغیر کلاہ (جسے وہاں دستار کہتے ہیں) اور کمر کی پٹی (جسے وہاں بکلوس کہتے ہیں) کے جا نہیں سکتا، حکیم صاحب کے لئے بھی یہ دونوں چیزیں لائی گئیں لیکن مرحوم نے ان دونوں کو استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنی معمولی ترکی ٹوپی پہن کر گئے۔ واپسی سے ایک روز قبل نظام نے اُن کے لئے ایک خلعت بھیجا جس میں پانچ تھان اعلیٰ درجہ کے قیمتی جامہ وار کے تھے اور ۳۰ عدد چاندی کے برتن اور ایک سونے کی گھڑی۔ اس خلعت کے ساتھ طبیہ کالج کے لئے ۵۰ ہزار کے عطیہ کا وعدہ بھی تھا۔ حکیم صاحب اُس خلعت کا قبول کرنا پسند نہ کرتے تھے لیکن چونکہ

اس کے ساتھ طبیہ کالج کے لئے ۵۰ ہزار کے عطیہ کا وعدہ بھی تھا اس لئے اُسے مدد کرنا پسند نہ فرمایا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی خودداری پر یہ شاہی نوازش بہت گراں تھی۔ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب وہ سیاسی زندگی میں کوئی حصہ نہ لیتے تھے لیکن اُن کی خودداری کا تقاضا اُس وقت بھی یہی تھا۔

حکیم صاحب کی دوست نوازی کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اُن کی عادت تھی کہ اپنے احباب کے وقار و عزت کا خاص خیال رکھتے تھے اور اگر کہیں دیکھ لیتے کہ کسی شخص نے اُن کے کسی خاص دوست کی توہین کی ہے تو وہ خود اُس کا جواب سختی کے ساتھ دیتے تھے۔

اُن کے خاص دوست ریو رینڈ اینڈ روز نے اپنے ایک مضمون میں اُن کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ وہ بڑے بڑے موقعوں پر جب یہ محسوس کرتے تھے کہ حکام اور اکابر اُن کے ہمراہیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے تو پھر وہ اُسی طرح اُن حکام و اکابر کی طرف بے توجہی ظاہر کر کے اکثر اُن کو محسوس کرا دیتے تھے کہ اجمل خاں نہ اُن کی نظر عنایت کا منتظر ہے نہ متمنی۔ ریو اینڈ اینڈروز لکھتے ہیں کہ دہلی میں سیاسی زندگی کے شروع ہونے سے پہلے وہ سرکاری تقاریب میں اکثر جاتے تھے مگر عموماً چیف کمشنر اور وائسرائے کی پارٹیوں میں اس طرح شریک ہوتے تھے کہ اپنے چند احباب کے ساتھ ایک طرف جا بیٹھتے تھے اور کبھی مجمع میں چل پھر کر لوگوں سے ملنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے اور حکام اور اکابر خود اُن کی طرف آتے تھے یہ شان تمکین

اُن کی زندگی کا درخشاں طرۂ امتیاز تھا مگر یہ نہیں کہ اس خودداری کے پردہ میں غرور یا پندار پوشیدہ ہو۔ اُن کی خودداری عموماً بڑوں کے ساتھ ہوتی تھی اور چھوٹوں کے ساتھ وہ شریفانہ انکسار اور خلق کا اظہار فرماتے تھے۔ خواص کے لئے اونچے اور عوام کے لئے نیچے تھے۔ عوام اور غربا سے جس قدر قریب وہ ہوتے تھے اتنا ہی زیادہ بے نفسی اور بے غرضی کے ساتھ اُن کی فطرت غربا اور زیردستوں کی خدمت پر اُن کو ابھارتی تھی۔ یہ اُن کی انسانیت کا ایک اعلیٰ جوہر تھا۔ مطب کے علاوہ جو اُن کی غربا پروری کا بہت بڑا میدان تھا۔ اتنا بڑا میدان تھا کہ اُس میں اُن کے مقابل کوئی آ ہی نہ سکتا تھا۔ اُن کی شخصی زندگی "افضل الاشغال خدمت الناس" کے جذبہ اعلیٰ سے یکسر معمور تھی۔ اخلاق اور انکسار کے اُس چشمہ سے جو اجمل خاں کے دل میں ہمہ وقت جاری رہتا تھا۔ اُن کے احباب، شناسا، عام اہلِ غرض، مرضا، سب ہی سیراب ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُن کے انکسار و اخلاق اور وضعداری کے عجیب و غریب پہلو نظر آتے تھے۔

اس مقام پر اُن کے کردار کی ایک عجیب و غریب مثال قابل ذکر ہے۔ ایک شام کو مرحوم نواب صاحب رام پور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں نواب صاحب کچھ علیل تھے۔ اُٹھتے ہوئے حکیم صاحب نے نواب صاحب سے فرمایا کہ "میں رات کی گاڑی سے دہلی جا رہا ہوں کل واپس آجاؤں گا"۔ نواب صاحب اپنی صحت کے متعلق بہت ہی محتاط تھے۔ اُنہوں نے بار بار حکیم صاحب سے کہا کہ جب تک اُن کا بخار

نہ اُتر جائے وہ نہ جائیں۔ لیکن خلاف عادت اُس دن حکیم صاحب نے ایک بات نہ مانی۔ راقم الحروف اُس موقعہ پر موجود تھا۔ جب تنہائی میں حکیم صاحب سے سوال کیا کہ آخر دہلی جانے کی ایسی شدید ضرورت کیا پیش آگئی تو مُسکرائے اور فرمایا کہ ضرورت تھی مگر ایسی نہ تھی جو نواب صاحب کے سامنے بیان کی جاتی، وہاں تو اُس کا مذاق اُڑایا جاتا۔ فرمانے لگے کہ "والد مرحوم کا حجام جو ہر جمعہ کو میرے پاس آیا کرتا ہے اُسے تو تم جانتے ہو۔ کل اُس کی لڑکی کی شادی ہے اور میں نے شرکت کا وعدہ کر لیا ہے، اگر میں نہ گیا تو اُسے کتنی مایوسی ہوگی!"

چنانچہ حجام کی لڑکی کی شادی میں شرکت کے لئے نواب صاحب کو بیمار چھوڑا اور گئے۔ کردار کی یہ بلندی اور یہ قدیم وضعداری اس زمانہ میں تو خواب وخیال ہو گئی ہے اور ہماری سماجی زندگی کا یہ ایک المیہ ہے!

ایک طرف تو وہ خود داری اور غیرت نفس اور دوسری طرف زیر دستوں کے ساتھ انکسار و اخلاق اور پھر مخالفین اور معترضین کے ساتھ تحمل و ضبط نفس اور عفو؛ اجمل خاں کی ذات میں یہ ایک عجیب مرکب تھا۔

محمد علی اور حکیم صاحب کے تعلقات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے دونوں کے مزاجوں کا اختلاف بہت واضح تھا اور دونوں کے درمیان رام پور میں کچھ بے لطفی بھی ہو چکی تھی لیکن جب محمد علی نے دہلی آکر قومی کام شروع کیا تو ان دونوں کے برادرانہ تعلقات میں گزشتہ واقعات اور اختلاف طبائع کا کوئی اثر نظر نہ آتا تھا۔

جس طرح اپنے خاندان میں اجمل خاں اپنے بھائیوں کا عکس تھے یعنی

عبدالمجید خاں مرحوم اور واصل خاں مرحوم کے مزاج کی گرمی اور سختی اجمل خاں کے مزاج میں انکسار و حلم، عفو، بن کر آئی تھی اسی طرح سیاسی زندگی میں محمد علی کا شعلہ اجمل خاں کے نور میں جذب ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کا موازنہ اس طرح کیا تھا:۔

"محسن الملک تیل ہی تیل ہیں اور وقار الملک لوہا ہی لوہا
جب تک دونوں نہ ملیں مشین چل نہیں سکتی"

اسی طرح محمد علی لوہا ہی لوہا تھے اور اجمل خاں تیل ہی تیل اور دونوں مل کر ایک ناقابل انکار طاقت بن جاتے تھے۔ اس نکتہ کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم نے بھی خوب بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"اُس وقت بھی اُن کی متانت اور وقار اور اُسی کے ساتھ خلوص و اخلاق کا اثر قلب پر پڑتا تھا۔ اپنے سوا بھی میں نے ایک سے زیادہ ملنے والوں سے اس کا اعتراف سُنا اور یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو اُس فضا کے بالکل خلاف تھا جو نازک مزاجی استغنا اور رُعب کمال کی شریف منزل میں تھی۔ اوصاف بالا خاندان شریفی کے گویا طرۂ امتیاز تھے۔

حکیم محمود خاں اور عبدالمجید خاں کے یہاں سے اُٹھ کر جب اجمل خاں کے پاس آنا ہوتا تھا تو بے ساختہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منطقۂ حارہ سے منطقۂ معتدل میں نکل آئے"

محمد علی اور حکیم صاحب کے راہ و رسم کی رفتار بھی کچھ ایسی ہی تھی

کہ ایک منطقہ معتدل کی آب وہوا سے دوسرے منطقہ حارہ کے باشندہ کا مزاج معتدل ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دفعہ یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک صحبت میں حکیم صاحب کے ایک جلیس نے جو بہت کچھ ان کے رہین منت بھی تھے۔کسی بات پر برافروختہ رہ کر حکیم صاحب سے کہہ دیا کہ "حکیم صاحب آپ قابل اعتبار نہیں ہیں۔میری رائے آپ کے متعلق اچھی نہیں ہے"۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ "خانصاحب! میں آپ کی اس جرأت اخلاقی سے بہت خوش ہوا" اسی طرح خان بہادر عبدالرحمن صاحب وکیل نے اُن سے کہا کہ "حکیم صاحب، میری رائے آپ کے متعلق اچھی نہیں ہے"، تو فرمانے لگے "اس قوت اخلاقی کو مضبوط رکھئے اس کو ضائع نہ کیجئے گا یہ بہت بڑی چیز ہے"۔

مفتی کفایت اللہ صاحب اپنی یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> نہ صرف اپنے خدام کی لغزشوں سے در گزر کرنا ان کا خاصہ تھا بلکہ مخالفوں اور دشمنوں کی خطاؤں کو معاف کر دینے میں بھی اُن کو مزہ آتا تھا میں سمجھتا ہوں کہ دشمن سے انتقام لینے کا تو ان کے دل میں کبھی خطرہ نہ آیا ہو گا۔بعض ایسے دشمنوں کا حال تو مجھے خود معلوم ہے۔جن کے متعلق حکیم صاحب کو یقینی علم تھا کہ محض دشمنی کی وجہ سے ناحق حکیم صاحب کو اذیت پہنچاتے ہیں مگر جب اُن کے سامنے حاشیہ نشینوں نے کسی انتقامی صورت کا ذکر کیا تو ہنس کر ٹال دیا اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ

اگر دوسرے وقت وہی لوگ جو حکیم صاحب کو
روحانی اذیتیں پہنچا چکے تھے اپنی حاجت لے کر
ان کے پاس آجاتے تو اُن کی حاجت روائی میں
اس سے کم سعی نہ فرماتے تھے جتنی کہ اپنے دوستوں
کی حاجت روائی کے لئے کیا کرتے تھے''

میر اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی اُن کے عفو اور حلم کا ایک واقعہ یوں نقل کرتے ہیں :-

"ایک مرتبہ کئی ہزار روپیہ کی رقم غائب ہوگئی تحقیق
کرنے سے جن صاحب پر جرم عائد ہوا اُن کی نسبت
حکیم صاحب کے خاص نیازمندوں نے عرض کیا کہ
ایسے شخص کا آپ کی خدمت میں رہنا کسی طرح مناسب
نہیں اُن کو علیحدہ کر دیجئے کچھ سکوت کے بعد فرمایا کہ
اچھا آپ اُن کو علیحدہ کر دیجئے اور بابو سردار بہادر کو
بُلا کر حکم دیا کہ فلاں صاحب کی آج تک کی تنخواہ دیدی
جائے۔ اور اپنے ایک محب سے کہا کہ آپ یہ کہہ دیجئے
کہ وہ یہاں سے جانے کے وقت میرے سامنے نہ آئیں۔
ان صاحب کو جب اُن کو علیحدگی کا حکم سُنایا گیا تو
اُنھوں کہا بہتر ہے مگر جاتے وقت آخری سلام کرنے
ضرور حاضر ہوں گا ہر چند سب لوگوں نے اُن سے
کہا کہ آپ اتنی دلیری اور بیجا جرأت سے کام نہ لیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ حکیم صاحب کو آپ کی عدول حکمی

سے رنج ہو مگر وہ جاتے وقت حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آبدیدہ ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ مرحوم حکیم صاحب اُن کی اس حالت کو دیر تک نہ دیکھ سکے اور فرمایا کہ "جای جای اپنا کام کیجئے اور مجھے زیادہ محجوب نہ کیجئے" وہ سلام کرکے باہر آ گئے اور اس واقعہ کے بعد مدتوں اپنی جگہ پر کام کرتے رہے"

حکیم صاحب کو اُن کے ایسے احباب نے بھی جو اکثر اوقات قریب رہتے تھے کبھی غصہ کی حالت میں از خود رفتہ یا سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راقم الحروف نے اپنے تعلقات کے طویل زمانہ میں صرف ایک دفعہ حکیم صاحب کے چہرہ پر شدید غصہ کے آثار دیکھے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی کاغذ کے متعلق اُنہوں نے اپنے پرائیویٹ سکرٹیری کو ہدایت کی تھی کہ اس کاغذ پر جس وقت بھی (حکیم صاحب کو) فرصت ہو اُن کے دستخط کرائیے جائیں۔ اتفاقاً پرائیویٹ سکرٹیری اس حکم کو بھول گئے اور کئی دن تک اس کاغذ پر دستخط نہ ہو سکے۔ اس کے متعلق دو تین روز بعد ایک تار کہیں سے آیا اُس وقت حکیم صاحب نے بلا کر پرائیویٹ سکرٹیری سے دریافت کیا کہ تم نے اُس کاغذ پر دستخط کیوں نہیں کرائے۔ وہ بجائے اس کے اپنی غفلت کی معذرت کرتے، خود حکیم صاحب کی عدیم الفرصتی کا عذر پیش کرنے لگے اور بار بار ایک ہی بات کہے جاتے تھے، یعنی یہ کہ "آپ کو فرصت نہ تھی دستخط کیوں کر کراتا" آخر حکیم صاحب کا چہرہ

غصہ سے تمتما اُٹھا مگر ضبط نفس کا یہ عالم تھا کہ زبان سے پھر بھی اتنا ہی فرمایا "بہت اچھا کاغذ ادھر رکھ دیجئے میں بعد کو دستخط کر دوں گا، پہلے مجھے نسخہ کا کاغذ دیجئے، میں آپ کی دماغی صحت کے لئے ایک نسخہ لکھ دوں"! انتہائی غصہ کا اظہار کرنے کے لئے مندرجہ بالا الفاظ سے زیادہ سخت الفاظ اُن کی زبان پر نہ آنے پائے! ضبط نفس کی یہ فضیلت مشکل چیز ہے اور بہت کم حاصل ہوتی ہے!

مطب اور درس میں بھی اگر شاگرد کی غلطی پر ناراض ہوتے تو انتہا درجہ کی توبیخ صرف ان الفاظ تک محدود ہوتی تھی کہ "یہ کیا حماقت ہے"

اُن کا پورانا اور وفادار ملازم ادریس کسی قدر بے پروا بھی تھا اور ضعیف العمری کی وجہ سے غلطیاں بھی کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ تو اُس کی لغزشوں سے تنگ آجاتے تھے۔ لیکن کبھی کسی نے انہیں نا ملائم الفاظ استعمال کرتے ہوئے نہ سُنا۔ کبھی بہت ناراض ہوتے تو صرف اتنا فرماتے کہ تم احمق ہو، یا تم نہایت نالائق ہو یا تم پاگل ہو۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے :-

"ضبط بردباری اور حلم میں تو حکیم صاحب یکتائے زمانہ تھے بہت سے ایسے موقعے ہوتے تھے کہ اُن کے مخالفین اُن کی پس پشت اور اُن کے سامنے اُن کو بہت کچھ کہتے اور سخت کلامی کرتے۔ بُرائی سے پیش آتے مگر حکیم صاحب ان کے ساتھ لطف و کرم کے ساتھ سنجیدگی اور نرمی سے پیش آتے اور اُن کے ساتھ خلق و احسان کا برتاؤ کرتے۔

لکھنؤ کے مشہور حکیم شفاء الملک حکیم عبدالرشید صاحب حکیم اجمل خاں صاحب کے برابر کے طبیب تھے اور وہ اپنے آپ کو ان سے زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن علم طب سمجھتے تھے اور ہمیشہ اُن کی تحریکات کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک اہم جلسہ مشاہیر اطباء ملک کا حکیم صاحب کے ایما سے اس غرض سے کیا گیا کہ طب یونانی کی تعلیم کا ایک نصاب مقرر ہو اور اُس کی باقاعدہ تعلیم کے لئے ملک کے مختلف صوبوں میں طبی کالج قائم کئے جائیں اور ایک مستقل نظام کے ساتھ کام ہو۔ حکیم عبدالرشید صاحب نے لکھنؤ کے جلسہ میں اس کی مخالفت کی اور طب یونانی کو بالکل مکمل فن اور علم ظاہر کیا اور اس میں کسی مزید ترقی یا ترمیم کی ضرورت کو اس علم سے ناواقفیت پر مبنی قرار دیا۔ اور حکیم شریف خاں صاحب کی تجدید کو طب یونانی میں ایک سخت نقصان اور خرابی کا باعث ظاہر کیا اور بہت سخت اور ناشائستہ الفاظ میں اس خاندان کے افراد کی بُرائی کی۔ اس کے بعد بہت سی تقریریں ہوئیں اور سب مقررین نے حکیم عبدالرشید صاحب کی غلطیوں اُن کی علم طب سے ناواقفیت ان کی سخت بیانی پر اظہار افسوس کیا اور بتایا کہ خاندان شریفی کے طب یونانی پر کتنے احسانات ہیں

آخر میں حکیم اجمل خاں صاحب نے ایک عالمانہ تقریر
کی اور بہت صاف اور سلجھے ہوئے الفاظ میں طب یونانی
کی تاریخ اور اُس میں جو کھلے ہوئے اور صاف نقائص
اور کمیاں تھیں اُن کا اظہار کیا اور صحیح طور پر دلی اور
لکھنؤ کے اطبا نے جو طب یونانی کی خدمت کی ہے
اس کا منصفانہ اعتراف کیا اور آئندہ طب یونانی کی
خدمت کی جو ضرورت ہے اور خدمت الناس کے لئے
جو بہترین طریقے ہیں اُن کا راستہ بتایا۔ اپنی تقریر
ختم کر کے جب وہ بیٹھے تو بھرے جلسہ میں حکیم عبدالرشید
صاحب نے کھڑے ہو کر حکیم صاحب کی اعلیٰ علمی اور
دماغی قابلیت کا اعتراف کیا اور حکیم صاحب سے
اپنی تقریر کے اس حصہ کے متعلق معافی مانگی جو اُن کی
ذات اور ان کے خاندان کے متعلق کی تھی۔"

جس قدر غصہ کا اظہار مدہم اور معتدل تھا، اتنا ہی مسرت اور ظرافت کا طرز ادا بھی اعتدال کا پابند تھا۔ اندرونی جذبہ کتنا ہی قوی اور تیز ہو اس کا بیرونی مظاہرہ ہمیشہ معتدل ہوتا تھا۔ اجمل خاں کی طبیعت میں مزاح اور تفنن کا رنگ بہت زیادہ موجود تھا، لیکن وہ سب اُن کے ایک تبسم زیرِ لب تک ظاہر ہو کر ختم ہو جایا کرتا تھا۔ بقول قاری سرفراز حسین صاحب کے :-

"۱۹۰۰ء سے حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا ایک نیا
رُخ مجھے معلوم ہوا یہ وہ زمانہ ہے کہ پاکیزہ مذاق

کی وجہ سے حکیم صاحب میری طرف معمول سے زیادہ ملطفت ہونے لگتے تھے۔ حکیم صاحب کے سامنے سینکڑوں مرتبہ مجھے مذاق کرنے کا اتفاق ہوا مگر میں نے کبھی اُن کو قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا اور خندہ زیرلبی کے صحیح معنی حکیم صاحب کو مُسکراتا ہوا دیکھ کر سمجھ میں آتے تھے۔"

مفتی کفایت اللہ صاحب اُن کی خوش مزاجی کا ذکر یوں فرماتے ہیں کہ:۔

"حکیم صاحب نہایت خوش مزاج تھے اور اُن کے کلام میں ظرافت کی ایسی چاشنی ہوتی تھی کہ اُن کے ہم نشیں مدتوں تک اس کا لطف نہیں بھولتے تھے۔ بعض اوقات ظریفوں کے قصے بھی سنایا کرتے تھے۔ مگر اُن کی ظرافت نہایت ہی شریفانہ اور حکیمانہ ہوتی تھی۔ سوقیت اور ابتذال سے اس قدر دور رہتے تھے کہ کسی کو یہ وہم بھی پیدا نہ ہو سکے کہ آپ براہ ظرافت یہ کلام کر رہے ہیں۔ وہ تو اُن کے انداز تبسم اور الفاظ کے محل استعمال سے سمجھنے والے ہی سمجھتے تھے کہ مرحوم نے یہ کلمات مزاح کے طور پر استعمال فرمائے ہیں۔"

یہ عالم تھا کہ رات کی صحبت میں ان کے یاران قدیم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے تھے اور ہر قسم کی بے تکلف گفتگو ہوا کرتی تھی مگر جس بات پر تمام مجمع بے اختیار

قہقہے لگاتا تھا حکیم صاحب تبسم کی حد سے آگے نہ بڑھتے
تھے۔ چار پانچ سال کے طویل عرصہ میں باوجود ہر قسم کی مجلس
میں شریک ہونے کے میں نے حکیم صاحب کو کبھی قہقہہ
لگاتے نہیں دیکھا۔ بات خواہ کیسی ہی مذاق و مزاح
کی ہو مگر اس کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بیان کرنا
اور اسی طرح متانت و سنجیدگی کے ساتھ سننا ان کا وصف
لاینفک تھا جو کسی وقت بھی اُن سے جُدا نہ ہوتا تھا۔"

ڈاکٹر انصاری صاحب نے حکیم صاحب مغفور کی ظرافت کے بہت پُرلطف واقعات بیان فرمائے ہیں۔ اپنے ابتدائی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس زمانہ میں حکیم صاحب سے گو بہت شگفتہ تعلقات
تھے لیکن کچھ عمر کے فرق کے باعث اور کچھ اس وجہ
سے کہ حکیم صاحب اور خود میں بھی دیر آشنا طبیعت
رکھتے تھے ایک دوسرے سے بے تکلف نہ تھے اور
نہ حکیم صاحب مجھ کو اور نہ میں اُن کو اپنے خاص احباب
میں تصور کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ ہوا
جس سے کہ کسی قدر درمیانی تکلف دُور ہوا۔ ایک روز
سہ پہر کے وقت جب دھوپ کی شدت تھی حکیم صاحب
اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سائبان کی چکیں گری
ہوئی تھیں کمرہ کے دروازے بند تھے اور صرف
ایک کھلا ہوا تھا کمرہ میں کسی قدر اندھیرا تھا جبکہ

میں پہنچا، دھوپ سے یکایک اندر جانے کی وجہ سے
اندھیرے کمرہ میں پہنچکر صاف نظر نہ آتا تھا صرف اتنا
معلوم ہوا کہ حکیم صاحب وسط کمرہ میں ایک کرسی پر بیٹھے
ہوئے ہیں۔ اور دوسری جانب دیوار سے لگی ہوئی
کرسیوں پر کچھ سفید پوش بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں سلام کرکے
اور حکیم صاحب سے ہاتھ ملا کر اسی سمت کی ایک کرسی
خالی پاکر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جب آنکھ اندھیرے
کی عادی ہوئی تو دیکھا کہ دو عورتوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا
ہوں میری اس نادانستہ حرکت پر ایک قہقہہ پڑا اور
میں شرمندہ ہوکر وہاں سے اُٹھنے لگا۔ حکیم صاحب نے
تبسم فرماکر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں بہت اچھے بیٹھے ہیں
آپ کے ایک طرف بی موتی جان اور دوسری طرف
بی چونی دلّی کی مشہور گانے والیاں ہیں۔ جو آپ کے
قرب سے مستفید ہوں گی اور بہت خوش ہوں گی۔
۔ اسی صحبت میں ایک اور واقعہ ہوا جس سے حجاب
اور بھی دور ہوا۔ حکیم صاحب کے ہاں ایک جرآح
آیا کرتے تھے جو نہایت لحیم شحیم قد آور سفید ریش سفید
پوش نہایت مرد معقول تھے وہ آکر ایک طرف کرسی
پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بمبئی کے ایک سیٹھ صاحب
آئے اور میری طرح اندھیرے میں کسی کو پہچان نہ سکے اور
سلام کرکے بیٹھ گئے۔ خلیفہ جی کو مخاطب کرکے نہایت

منت سے کہنے لگے کہ میں بہت دور سے اپنی بیوی کو آپ
کے علاج کی غرض سے دلّی لایا ہوں جس وقت آپ
فرمائیں اُن کو آپ کے مطب میں لاکر دکھاؤں حکیم صاحب
اور ہم سب لوگ اس لطیفہ سے محظوظ ہو رہے تھے۔
خلیفہ جی نے اس غلطی کو دور نہ کیا اور سیٹھ صاحب
سے کہا کہ مطب کا وقت صبح ۷ بجے ہوتا ہے آپ
مریضہ کو اُسی وقت لائیں۔ سیٹھ صاحب شکریہ ادا کر کے
اور سلام کر کے چلے گئے اور خلیفہ جی کو حکیم اجمل خاں سمجھے۔
ان کے جانے پر ہم سب بہت ہنسے اور دوسرے روز
مطب کے وقت اس غلطی کے نتائج دیکھنے کے لئے حکیم صاحب
کے مطب میں پہنچے۔ سیٹھ صاحب مطب میں اپنی بیوی کو
باہر بند گاڑی میں چھوڑ کر دو چار مرتبہ آئے اور دیکھا کہ
حکیم اجمل خاں صاحب (خلیفہ جی) مطب میں نہیں ہیں
آخر مجبور ہو کر دریافت کیا کہ حکیم اجمل خاں صاحب آج
مطب میں تشریف نہ لائیں گے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب
وہ ہی ہیں جو مطب کر رہے ہیں تو ان کو بیحد حیرانی و
پریشانی ہوئی اور بہت تردد اور تامل کے بعد اپنی
بیوی کو لاکر حکیم صاحب کو دکھایا۔"

اُن کی صحبت خاص کے شرکا میں سے ایک صاحب میر اخلاق حسین
صاحب، اخلاق دہلوی مرحوم بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی یادداشت میں
ایک جگہ صحبت شب کا نقشہ کھینچا ہے۔ یوں تو احباب کی ان صحبتوں

کا حال لکھنے کے لئے بجائے خود ایک کتاب کی ضرورت ہے، لیکن ان صفحات میں اجمل خاں کی محفل آرائیوں کی ایک جھلک سے زیادہ پیش نہیں کی جاسکتی۔ دہلی کی یہ آخری صحبت ایک داستان ہے جس کو شاید کوئی بیان کرنے والا کبھی بیان کرے۔ یہ جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے یہ تو اس کا ایک صرف گوشہ ہے۔ میر اخلاق حسین صاحب بیان کرتے ہیں کہ :-

" نومبر ۱۹۱۶ء میں ایک سہ پہر کی چاء پر حکیم صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں شب کو آیئے تو مجھے یاد دلا دیجئے گا۔ میں حسب معمول حاضر ہوا تو جناب سائل صاحب مرزا محمد علی بیگ صاحب مرحوم اور قاری سرفراز حسین صاحب اور علاوہ ان حضرات کے دو تین مریض بھی موجود تھے۔ حکیم صاحب قبلہ محلسرا سے کھانا نوش فرما کر قریب ۸ بجے کے تشریف لائے چونکہ حکیم صاحب کی صحت اب خراب رہتی تھی اور ناتوانی روز بروز بڑھتی جاتی تھی اس وجہ سے حکیم صاحب قبلہ پلنگڑی پر آکر بیٹھے اور سب سے پہلے مریضوں کا حال سُنا اور حکیم سید نذر احمد صاحب کو جو مرحوم کے طبی پیشکار تھے بلوا کر نسخے لکھوائے اور مریضوں کو جو بمبئی کے تاجر معلوم ہوتے تھے دیدئے، وہ لوگ اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ اس کے بعد جناب سائل صاحب سے فرمایا کہ نواب صاحب آپ جو نورجہاں و جہانگیر کی مثنوی لکھ رہے ہیں کہیں سے اُس کا کوئی حصہ سُنایئے

حسب الحکم نواب صاحب نے اپنے ملازم سے بیاض لی اور کچھ ورق گردانی کے بعد اپنے خاص انداز میں مثنوی پڑھنی شروع کی۔ حکیم صاحب مغفور اور دیگر حاضرین صحبت شوق سے سُن رہے تھے اور سائلؔ صاحب کو دادِ سخن دے رہے تھے کہ حضرت تاباں مرحوم (سائل صاحب کے بڑے بھائی) جن کو حکیم صاحب مرحوم اُستاد کہتے تھے اور حکیم صاحب کے نیازمند بھی گالیوں سے بچنے کے لئے اُستاد کہا کرتے تھے تشریف لے آئے اور آتے ہی سائل صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ صاحبزادے یہ مثنوی جو آپ سُنا رہے ہیں اگر فارسی میں لکھتے تو خیر کچھ بات بھی تھی اور اُردو کی مثنوی تو آج کل لونڈیاں لکھ لیتی ہیں۔ سائل صاحب نے نہایت ادب سے کہا بھائی جان میں نے جس اُردو میں مثنوی لکھی ہے وہ لونڈیاں تو کیا آج کل کے اُستاد بھی نہیں لکھ سکتے اور سائلؔ صاحب کے فرمانے کی مرزا محمد علی خاں صاحب مرحوم نے بھی مسکرا کر تائید کی۔ اب جناب تاباںؔ صاحب کے غصہ کی انتہا نہ تھی سائل صاحب کے ساتھ مرزا محمد علی خاں صاحب کی بھی خبر لی گئی۔ اللہ بخشے حکیم صاحب مرحوم ہمیشہ ایسے موقعوں پر جناب تاباںؔ صاحب کے طرفدار ہوتے تھے۔ حسب عادت اس وقت بھی تاباں صاحب کی تائید میں فرمایا کہ سائل صاحب

درحقیقت سچ تو یہی ہے کہ فی زمانہ اُردو میں مثنوی لکھنا چنداں مشکل نہیں ہے ہاں آپ نے زبان خاصی لکھی ہے۔ اتنا سُن کر تاباںؔ صاحب خوش ہو گئے اور جیب سے ایک پرچہ نکال کر حکیم صاحب سے کہا آج خسروؔ کی غزل پر ایک تازہ غزل لکھی ہے اجازت ہو تو پڑھوں حکیم صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ضرور مستفید فرمائیے۔ تاباںؔ صاحب مرحوم نے حسب عادت آستینیں چڑھا کر غزل پڑھنی شروع کی۔ حکیم صاحب قبلہ ہر شعر پر فرماتے تھے کہ سائل صاحب سُنئیے شاعری اس کا نام ہے شعر یوں کہتے ہیں جب غزل تمام ہو گئی تو مرزا محمد علی خاں صاحب نے ہنس کر کہا کہ حکیم صاحب اگر نواب صاحب ناراض نہ ہوں تو کچھ عرض کروں۔ حکیم صاحب ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ تاباںؔ صاحب نے تیور بدل کر کہا فرمائیے۔ مرزا صاحب مرحوم نے جن کو اساتذہ کا فارسی کلام بہت زیادہ یاد تھا اسی ردیف و قافیہ اور اسی زمین میں اساتذہ قدیم کے کچھ شعر پڑھ کر کہا کہ نواب صاحب معاف فرمائیے مجھے تو ان اشعار کے مقابلہ میں آپ کے شعر بندش اور مضامین کے اعتبار سے سست معلوم ہوتے ہیں۔

تاباںؔ صاحب نے حسب عادت دو چار صلواتیں سُنا کر کہا کہ مرزا صاحب کسی کے شعر کو سست بتا دینا یا بے معنی کہہ دینا تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ آپ کو بھی

شاعری کا دعویٰ ہے تو اس زمین میں غزل لکھئے تب
حقیقت معلوم ہو۔ اسی پُر لطف چھیڑ چھاڑ میں ۱۱ بج
گئے اور محفل برخاست ہو گئی "

اس صحبت کا ایک اور منظر مرحوم کے شاگرد اور پرائیویٹ سکریٹری
حکیم رشید احمد صاحب سے ہم تک پہنچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔
"۱۳ ہ میں شدید علالت کے بعد احباب کے اصرار سے
تبدیل آب و ہوا کے لئے کالکا کا قیام پسند فرمایا۔ کالکا
دہلی کے نواح میں (داوکھلے) کے قریب ایک چھوٹا سا
گاؤں ہے۔ گاؤں سے باہر کھلی ہوئی پہاڑی پر حکیم صاحب
کے کسی دوست کے دو مکان تھے جو چند روز کے لئے حاصل
کئے گئے۔ ایک مکان میں زنانہ کی تمام ضروریات کو مہیا
کر کے اپنے متعلقین کو رکھا اور دوسرے مکان میں
خود قیام فرمایا۔ باہر کے دالان میں میرا دفتر تھا اور
اُسی میں میرے ساتھ حکیم عاقل خاں رہتے تھے۔ ایک
وسیع کمرہ مہمانوں کے لئے ریزرو رکھا گیا پہلو میں
ایک باورچی خانہ اور ملازمین کے لئے جگہ تھی غرضکہ
وہاں ہر قسم کا آرام تھا۔ دوران قیام میں نواب
سراج الدین احمد خاں صاحب سائل نواب شجاع الدین
احمد خاں صاحب تاباں مرحوم نواب فیض احمد خاں صاحب
نواب سر امیر الدین احمد خاں صاحب بہادر آف لوہارو
اسٹیٹ سید اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی وغیرہ

اُن کے مخصوص احباب کا زیادہ تر وقت اُن ہی کے پاس گزرتا تھا۔ جس وقت یہ سب حضرات جمع ہو جاتے تھے تو وہ ایک عجب پُر لطف صحبت ہوتی تھی۔ ان میں کا ہر شخص حکیم صاحب کا دوست ہی نہیں بلکہ اُن کا شیدائی اور عاشق تھا۔ حکیم صاحب قبلہ جناب تاباں صاحب کو اُستاد کہتے تھے اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ نواب صاحب لوہارو حکیم صاحب قبلہ کو بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس شمع خاندان شریفی کے پروانہ تھے۔ میں اکثر اُن کے جذبات اخلاص کو جو وہ حکیم صاحب سے رکھتے تھے برسوں تک بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا کرتا تھا باقی جملہ صاحبان کا بھی قریب یہی حال تھا کہ جب حکیم صاحب قبلہ کی صحبت میں پہنچ گئے تو دنیا و مافیہا کو بھول گئے۔ غرضکہ احباب کی یہ پارٹی بہت دلچسپ پارٹی تھی۔ دوران قیام کالکا میں دو شخص اور بھی ہمراہ تھے اور وہیں مقیم تھے ایک میر باقر علی صاحب داستان گو مرحوم اور ایک بوڑھے شخص شاطر جن کا نام احمد خاں تھا وہیں حاضر رہتے تھے اور کبھی کبھی اپنے کمال سے حکیم صاحب قبلہ اور اُن کی پارٹی کو محظوظ کیا کرتے تھے اس پارٹی کے صدہا تاریخی اور نہایت دلچسپ حالات حاذق الملک مرحوم کی لائف میں لکھے جا سکتے ہیں مگر

میں آج اٹھارہ سال کے بعد اس مختصر تحریر اور اتنے تنگ وقت میں اُن کو مفصل لکھنے سے قاصر ہوں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ جناب تاباں صاحب مرحوم اور جناب سائل صاحب دونوں حقیقی بھائی تھے۔ تاباں صاحب بڑے اور سائل صاحب چھوٹے۔ دونوں طویل القامت بھاری بھرکم اور خوبصورت تھے۔ سائل صاحب تاباں صاحب کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے اور بیحد احترام کرتے تھے۔ سائل صاحب حضرت داغ مرحوم کے شاگرد اُن کے جانشیں اُن کے داماد بھی تھے۔ تاباں صاحب مرحوم داغ مرحوم کے کلام کو سوقیانہ کلام کہتے تھے اور یہ اُن کی چڑ تھی کہ کوئی شخص اُن کے سامنے داغ کے کلام کی تعریف کرے۔ حکیم صاحب مرحوم گاہے گاہے اپنی مجلس میں یہ لطیف مذاق اس طرح کیا کرتے تھے کہ خود تو نہیں مگر کسی دوسرے شخص کو اشارہ کردیتے تھے جو جلسہ میں ضرورت سے زیادہ داغ کے کلام کی تعریف کرتا۔ وہ تاباں صاحب کو ناگوار ہوتی۔ حضرت تاباں جب تک مشتعل نہ ہوتے تھے حکیم صاحب کے سامنے کوئی لفظ آداب مجلس کے خلاف زبان سے نہیں نکالتے تھے لیکن زیادہ مشتعل ہو جانے کی صورت میں پھر وہ کسی کا احترام ملحوظ نہ رکھتے تھے اور جو منہ میں آتا تھا برملا کہتے تھے۔ لیکن

جس وقت یہ جنگ تاباںؔ صاحب اور سائلؔ صاحب دونوں حقیقی بھائیوں میں کرادی جاتی تھی تو بشری طاقت سے باہر تھا کہ سنجیدگی اور متانت کا دامن ہاتھ میں رہے۔ ایک روز کا لکا میں دونوں بھائی موجود تھے اتفاق سے پارٹی کے دوسرے اراکین بھی جمع ہو گئے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک مجلس مشاعرہ گرم رہی۔ احباب کو اُن کی جدت خیال اور معنوی نزاکت مفہوم و اعلیٰ زبان اور بہترین طرز بیان پر داد سخن دی جاتی رہی۔ نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے رہے اسی درمیان میں حکیم صاحب قبلہ نے جناب سائلؔ کو اشارہ کیا وہ حکیم صاحب کا منشار سمجھ گئے دوزانو ہو بیٹھے اور اپنے استاد داغؔ مرحوم کا کچھ کلام پڑھ کر اُن کی تعریف مافوق العادۃ الفاظ میں بیان کرنی شروع کر دی۔ اس پر جناب تاباںؔ صاحب کا مقیاس الحرارت تیز ہونا شروع ہوا پھر حضرت سائلؔ نے تاباںؔ کی طرف رُخ کر کے طنزاً عرض کیا کہ بھائی صاحب گستاخی معاف ہو شعر گوئی آسان نہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت داغؔ مرحوم نازک خیالی اور جدت آفرینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ قادر الکلام ایسے تھے کہ ایک گھنٹہ میں پچاس شعر بلا تکلف قلم برداشتہ لکھ لیتے تھے، اُن کے مقابلہ میں آج کل کی شعر گوئی لڑکوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے۔ بھلا جناب تاباںؔ مرحوم کو اتنی

تاباں کہاں بھی ترش رو ہو کر کہنے لگے کہ صاحبزادے تمہارے استاد کو اور تم کو شعر کہنے اور شعر سمجھنے کی لیاقت ہی کیا ہے کیا قلم برداشتہ اور برملا شعر کہنا ہی معیار اعلیٰ سخندانی ہے اگر یہی ہے تو کوئی مصرع طرح بتاؤ۔ جناب سائل نے ادب کے ساتھ ایک مصرع پڑھا جس کو سنکر ادنیٰ تامل کے بعد حضرت تاباں نے یہ شعر برجستہ جواب میں پڑھا ؎

عدو میرا نہ تو میرا نہ چرخ فتنہ جو میرا
شفق بنکر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

اس شعر کا سُننا تھا کہ مجلس میں ایک شور تحسین بلند ہوا حکیم صاحب قبلہ کھڑے ہو گئے اور فرط مسرت سے نواب صاحب تاباں کے گلے سے لپٹ گئے ہر شخص زیادہ سے زیادہ داد سخنوری دینے کے لئے مضطرب نظر آتا تھا۔ سائل صاحب حیران تھے کہ تمام اہل مجلس کو دفعتہً کیا ہو گیا۔ اور تاباں صاحب کا یہ حال تھا کہ فرط غضب سے آنکھیں سُرخ تھیں منہ سے کف جاری دست و پا میں تشنج آنکھیں اشکبار غرضکہ وہ اپنے ہوش میں نہ تھے۔ پنکھا جھلا گیا۔ ٹھنڈا پانی پلا یا گیا تب کہیں اُن کے حواس خمسہ درست ہوئے اور زبان قابو میں آتے ہی جو کچھ سائل صاحب اور سائل صاحب کے طرفداروں کے متعلق کہا اُس کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا

یاران صحبت فرط لطف سے بیتاب اور بے اختیار تھے
حکیم صاحب قبلہ بھی اس مشہور زمانہ متانت کے باوجود
اُس وقت کی لطف اندوزی میں کافی حصہ لے رہے تھے
سائل صاحب ہاتھ باندھے ہوئے سر جھکائے ہوئے وہ
سب کچھ سُن رہے تھے جو تاباں صاحب اُن کو سُنا رہے
تھے۔ آخر کار جب اہل محفل کا ہنستے ہنستے سانس پھول گیا
اور تھک گئے تو تاباں صاحب فرمانے لگے کہ اس سے
زیادہ گالیاں دینے کی مجھ میں تاب نہیں لہذا آخری
ایک گالی اور دیتا ہوں اور وہ یہ کہ شہاب الدین خاں
کا بیٹا یا تو نہیں یا میں نہیں (شہاب الدین خاں اُن کے
والد کا نام تھا) ہنستے ہنستے ہر شخص کے پیٹ میں بل پڑ گئے
تھے'' یہ بھی ایک خاص رنگ تھا مرحوم کی صحبتوں کا۔

اپنے احباب کے جلسہ اور اپنی پرائیویٹ صحبت میں جب وہ کبھی کبھی اپنی معمولی متانت اور سنجیدگی کے دائرہ سے کسی قدر باہر آتے تھے تو گویا ایک تازہ بہار چمن آراستہ ہو جاتا تھا۔ درحقیقت اُن کی طبیعت کی شوخی پر متانت اور ضبط کے اتنے پردے پڑے ہوئے تھے کہ دنیا اُس کو نہ دیکھ سکی۔ لیکن خاص خاص احباب کی صحبت میں جب کبھی ان پردوں کا کوئی گوشہ اُٹھ جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر گوشۂ بساط

داماں باغباں و کف گلفروش ہے!

ہندوستان میں تہذیب قدیم کی یہ آخری محفل تھی۔

صبحدم وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک!

اِس پردے کے پیچھے

بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ درحقیقت دو چار خاص نیازمندوں کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ کہ اجمل خاں کی لازوال مسکراہٹ اور دلنواز بذلہ سنجی میں ایک گہرے غم کی تلخی شامل تھی۔ جو لوگ اُن کو ہر وقت مُسکراتے اور ہمہ وقت احباب سے "چھیڑ" کرتے دیکھتے تھے اُن کو خبر نہ تھی کہ علم و عمل کے اس محشرستان میں اجمل خاں کا دل ایک خاموش مزار تھا جس میں زندگی کی لاکھوں جراحتیں بھری ہوئی تھیں، ساری عمر کے ناسور پوشیدہ تھے، جوانی کے آغاز سے قبر کے گوشہ تک اُن کا وجود معنوی آتش غم میں جھلستا ہوا اور جلتا ہوا گزرا۔ فلسفۂ حیات و ممات کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی محض ایک دورِ امتحان و تربیت ہے۔

وہ ناتیار صورت میں، انسانی جسد کے اندر ایک تیز آگ میں تپایا جاتا ہے۔ پھر اس کا جوہر اصلی کسی دوسرے عالم میں لباس زندگی پہن کر نمودار ہوتا ہے۔ اجمل خاں کا جوہر معنوی بہت تپایا گیا، مگر اُن کے گرد و پیش کسی کو خبر نہ تھی کہ علم و فضل و کمال، شہرت و عزت، دولت و ناموری اور کامیابی کے پردوں میں ان کے زخم دل سے ہر وقت خون کے قطرے کس طرح پر ٹپکتے رہتے تھے۔ یہ اُن کی زندگی کا ایک راز تھا جو چند ہی نیازمندوں کو معلوم تھا اور وہ بھی اس کو زبان پر لا نہیں سکتے۔ جو چند نیازمند اس راز سے یک گونہ واقف تھے وہ بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اجمل خاں کو بظاہر اپنی کامیاب اور مطمئن زندگی میں حقیقی مسرت کے شاید چند دن بھی بمشکل میسر آئے ہوں گے۔ اپنے روحانی کرب اور دماغی اُلجھنوں کو اُنہوں نے ہمیشہ لاعلاج اور

ناقابلِ علاج پایا، اس لئے وہ اُن افکار کو بہلانے کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کیا کرتے تھے۔ احباب کی محفل، سیاست کے ہنگامے، مطب کی مصروفیتیں، سفر، مطالعہ کتب، اور اسی طرح کے مشاغل وہ اپنے لئے پیدا کرتے رہتے تھے، حتیٰ کہ وہ مشاغل اُن کی قوت برداشت سے بہت زیادہ ہو جاتے تھے لیکن وہ اپنی جسمانی صحت کی قربانی بخوشی گوارا کرتے تھے تاکہ روحانی زندگی کی تلخی کچھ کم ہو سکے! لوگ کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب پتھر یا فولاد کے بنے ہوئے ہیں، کسی طرح تھکتے ہی نہیں، آسائش اور راحت جسمانی کا تو خیال ہی اُن کے دل میں نہیں آتا، ایک لوہے کی مشین ہیں جو صبح سے شام تک چلے جاتی ہے لیکن ان لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جسم کی تھکن اور ماندگی ان کو گوارا تھی مگر تنہائی میں اس روحانی عذاب کو وہ برداشت کرنے سے گھبراتے تھے جو اُن کی معنوی زندگی پر حاوی تھا۔ وہ اپنی قوت جسمانی کی کمان کو جہاں تک وہ کھینچ سکتی تھی کھینچتے رہتے تھے تا آنکہ اُس کا چلّہ ایک شب کو رام پور میں ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ وہ یہ سب اسی لئے کرتے تھے کہ اندرونی زندگی میں اپنی فطرت کے منافی مجبوریوں اور معذوریوں کا خیال دل میں نہ آنے پائے اور ظاہری زندگی کی مصروفیت اُن کو اتنا دم ہی نہ لینے دے کہ وہ اپنے وجود معنوی کی جراحتوں کو دیکھ سکیں۔ جرمنی کے مشہور سوانح نگار لڈوگ نے گاٹیے کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے جو الفاظ لکھے ہیں وہ بالکل اجمل خاں کی زندگی پر صادق آتے ہیں۔ اُس نے لکھا ہے کہ :۔

"قسمت کے خلاف سب سے موثر الہ حرب اس کے پاس صرف ایک ہی تھا ــــــ مصروفیت ـ مصروفیت کے

سایہ میں وہ آزمودہ کار اپنے لئے پناہ ڈھونڈتا تھا
. . . . وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو دیتا
تھا، صرف اس کوشش میں کہ اس کو کوئی چیز، کوئی
بہانا، دل کی تسکین کا مل جائے، محبت، دوستوں کی
صحبت، دوسروں پر مہربانیاں، دوسروں کی خطاؤں
پر نگاہ کرم، اس سب کے درمیان اُس کی روح بالکل
تنہا اور بے یار و مددگار تھی اور زندگی کی خزاں کا موسم
قریب آچکا تھا۔"

جس طرح ایک پتھر کہ جس قدر زیادہ بلندی سے وہ گرتا ہے اُتنی ہی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ زمین کی طرف آتا ہے، اسی طرح اجمل خاں کی زندگی کا انحطاط آخر زمانہ میں بہت تیز ہو گیا تھا۔ اُن کی روح، باوجود ظاہری سکون و اطمینان کے، اپنی منزل کی طرف بہت تیزی کے ساتھ جا رہی تھی۔ اور اب وہ خوب جانتے تھے کہ یہ "افسانہ از افسانہ می خیزد" کا سلسلہ جس کو مصروف زندگی کہتے ہیں کس طرح ایک دن کسی کہانی کے ادھ بھر میں ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ زندگی کی ہزاروں منزلوں پر اس تھکے ہوئے مسافر کی گاڑی کو تازہ گھوڑے ملتے رہے مگر ایک دن ایک منزل ایسی آئی کہ وہاں کوئی تازہ دم گھوڑا موجود نہ تھا جو اُس تھکے ہوئے مسافر کو آگے لے جاتا اور وہی اُس کی آخری منزل تھی ـــــ وہ اپنے سفر کی ان تفصیلات سے بے خبر نہ تھے اور اُن کو اس منزل کے قریب آجانے کی خبر تھی جہاں اُن کی گاڑی کے لئے تازہ دم گھوڑے موجود نہ تھے!

اجمل خاں کی اس غم نصیبی میں اُن کی روحانی عظمت پوشیدہ تھی۔

دنیا میں غم سے زیادہ باطن کا پاک کرنے والا کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہے۔ اُن کے دل میں فقیرانہ احساس اسی جذبہ نے پیدا کر دیا تھا، وہ اپنے سخت سے سخت دشمنوں کے ساتھ اس طرح احسان کرتے تھے کہ گویا انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ نیکیاں کرتے تھے، احسانات کرتے تھے، اور واقعی بھول جاتے تھے۔ آخری زمانہ میں جب سیاسیات کے ہنگاموں میں اُن کی آمدنی کے ذرائع بہت محدود ہو گئے تھے۔ وہ اپنی صاحبزادی کی کمزور صحت کی وجہ سے ہر سال گرمیوں میں اہل و عیال کو کسی پہاڑی مقام پر لے جاتے تھے، خود تو بہت کم رہ سکتے تھے لیکن اہل و عیال پورا موسم گرما پہاڑوں میں گزارتے تھے۔ شاید ۱۹۲۱ء کا موسم گرما تھا اور وہ سولن میں مقیم تھے۔ اُن کی مالی حالت اُس زمانہ میں بہت کمزور ہو رہی تھی اور چونکہ ہمیشہ جتنے سفر قومی کاموں کے سلسلہ میں کرتے تھے اُن کا خرچ خود برداشت کرتے تھے اور کبھی کسی قومی سرمایہ سے وصول نہ کرتے تھے اس لئے سفر کے اخراجات کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اُن کے خاص نیازمندوں کو معلوم تھا کہ اُس زمانہ میں گھر کے معمولی اخراجات کے لئے روپیہ قرض لینا پڑ رہا تھا لیکن یہ تو کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی صورت سے مالی امداد پیش کر سکتا۔ البتہ ایک دن، ایک نیازمند نے اُن سے عرض کیا کہ آپ کی سیاسی مصروفیت نے آمدنی کا سلسلہ بند کر دیا ہے ریاستوں میں آپ بلائے جاتے ہیں تو جاتے نہیں آخر گھر کے اخراجات کیونکر چلیں گے۔ فرمایا کہ مجبور ہوں، میرے پاس وقت نہیں کہ میں ریاستوں میں جاؤں جس شب یہ گفتگو ہوئی اُس کی صبح ہی کو وسط ہند کی ایک ریاست سے بلانے کا تار آیا بہ دشواری آمادہ کیا گیا کہ تشریف

لے جائیں، اُسی زمانہ میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا ایک اہم اجلاس ہونے والا تھا۔ اس لئے وہ کسی طرح اُس اجلاس سے غیر حاضر نہ ہونا چاہتے تھے بہزار مشکل ریاست کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا گیا اور خدا خدا کرکے تشریف لے گئے۔ ۱۰ روز کے بعد تشریف لائے، سہ پہر کو سولن پہنچے، کوٹھی پر آتے ہی اسی نیازمند کو الگ لے جاکر فرمایا "بھائی"۔ ۱۰ ہزار لے آیا یہ ۶ ہزار تم اپنے پاس رکھ لو ایک کام ہے جو بعد کو بتاؤں گا اور ۴ ہزار روپیہ میں بیگم صاحب کو دے آتا ہوں" یہ فرما کر اور ہزار ہزار روپیہ کے ۶ نوٹ دے کر باقی روپیہ گھر میں لے گئے صبح کو جب دریافت کیا گیا کہ وہ ۶ ہزار کس غرض کے لئے رکھے ہیں تو فرمایا کہ "بھائی کئی مہینے ہوئے ہیں خلافت کمیٹی سے چندہ کا وعدہ کر چکا تھا، اُس زمانہ میں روپیہ پاس نہ تھا اس لئے اب تک وہ وعدہ پورا نہ کر سکا اب اتفاقاً تمہاری زبردستیوں سے یہ رقم آگئی ہے تو اس میں سے ۶ ہزار آج ہی خلافت کمیٹی کو بھیج دو تاکہ میرا بوجھ ہلکا ہو جائے،، عملی دنیا میں جب اپنے گھر کھانے کو نہ ہو، بہت کم ہمت والے داد دہش کر سکتے ہیں۔ یہ اولوالعزمی اجمل خاں ہی کے لئے مخصوص تھی۔

اسی قسم کا ایک واقعہ میر اخلاق حسین صاحب بیان فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن شام کو حکیم صاحب نے مجھے یاد فرمایا اور علیحدہ لے جاکر کہنے لگے کہ:۔

"دو مہینہ سے جامعہ ملیہ کے اساتذہ کی تنخواہیں نہیں دی گئیں میرے پاس ایک الماس کی انگشتری اور ایک زمرد کی ہے یہ دونوں چیزیں لے جاؤ اور ان کو بازار میں یا جہاں مناسب سمجھو جاکر فروخت کردو تاکہ مجھے کچھ

سبکدوشی ہو اور جہاں تک ممکن ہو کوشش کرکے ان
چیزوں کو جلد علیحدہ کردو میں نے دونوں انگوٹھیوں کو
لے کر عرض کیا کہ میں آٹھ سات دن میں ان کو بازار
میں دکھا کر جو قیمت لگے گی اُس سے اطلاع دوں گا۔
کہا اچھا مگر تساہل نہ کرنا مجھے جامعہ کے اساتذہ سے
بیحد ندامت ہے۔اس کے بعد حکیم صاحب مرحوم محلسرا
میں تشریف لے گئے اور میں حکیم صاحب کی ہمت عالی
اور ایثار کی دل ہی دل میں قدر کرتا ہوا گھر پہنچا اور
دوسرے دن حکیم صاحب قبلہ سے اجازت لے کر اکبرآباد
گیا اور وہاں کے ایک بڑے جوہری کو دونوں انگوٹھیاں
دکھائیں اُنھوں نے حسب قاعدہ فرمایا کہ آج کل ہیرے
کا بازار کچھ نرم ہے اور زمرد میں دو ایک جرم ہیں اس
وجہ سے خاطرخواہ دام نہیں مل سکتے۔ میں نے کہا کہ آجکل
کے نرخ سے آپ قیمت لگائیں مالک اگر آپ کے ادفر
کو منظور کریں گے تو آپ کو دونوں چیزیں دے دی
جائیں گی۔ جوہری صاحب نے دونوں انگوٹھیوں پر
اِس وقت تو اپنی مہر کردی اور کہا کہ کل آیئے دیکھ کر
اوفر دیں گے۔ میں دوسرے دن وقت مقررہ پر جوہری
صاحب کے ہاں گیا اور اُنھوں نے اچھی طرح دیکھ بھالکر
الماس کی انگوٹھی کے چار ہزار اور زمرد کی انگوٹھی
کے ڈیڑھ ہزار روپیہ لگائے چونکہ میری رائے میں

یہ قیمت بہت کم تھی اس لئے میں نے اُن کا وقر نہیں
لیا اور اسی دن آگرہ سے دہلی چلا آیا۔ دہلی پہنچنے پر
معلوم ہوا کہ حکیم صاحب رام پور تشریف لے گئے ہیں
آگرہ سے آکر یہ دونوں چیزیں دہلی کے
دو ایک بڑے جوہریوں کو دکھائیں، یہاں بھی قریب
قریب وہی دام لگے جو آگرہ میں لگے تھے۔ دو
دن کے بعد حکیم صاحب قبلہ رام پور سے واپس آگئے
میں نے حاضر ہو کر مزاج پُرسی کے بعد حقیقت سے
اطلاع دی فرمایا تمہاری رائے میں یہ قیمت مناسب
ہو تو علیحدہ کردو۔ میں نے عرض کیا کہ الماس کی انگشتری
کم سے کم ۶ ہزار کی فروخت ہونی چاہیئے اور زمرد
کی انگوٹھی ڈھائی ہزار کی فروخت ہو سکتی ہے، مگر
عجلت میں یہ قیمت نہیں ملنے کی، فرمایا جو کچھ روپیہ رام پور
سے لایا ہوں یہ تو میں آج جامعہ کو دے دیتا ہوں
اور تم اور کوشش کرو، اس کے بعد جو آخری قیمت
لگے مجھ سے کہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان چیزوں کا
فروخت ہونا کسی طرح گوارا نہ تھا لیکن حکیم صاحب کے
اصرار سے مجبور تھا اور اِدھر اُدھر دونوں انگوٹھیوں
کو دکھا رہا تھا اور بہ نسبت پہلے کے قیمت زیادہ
مل رہی تھی اور ہر دوسرے تیسرے دن حکیم صاحب
کو قیمت کی رپورٹ سُنا دیتا تھا اور مرحوم ہر مرتبہ

یہی فرماتے تھے کہ مناسب سمجھئے تو علیحدہ کر دیجئے"

اس زمانہ میں مہاراجہ بونڈی بیمار ہوئے اور حکیم صاحب کو کئی مرتبہ اُن کے علاج کے لئے بونڈی جا کر قیام فرمانا پڑا۔ اور جامعہ کی قسمت سے ایک معقول رقم مل گئی۔ میر اخلاق حسین کا بیان ہے کہ :-

کوٹہ سے دہلی کو واپس تشریف لاتے ہی میں نے عرض کیا کہ اب تو خدا کے فضل سے جامعہ کے لیے انتظام ہو گیا، اب غالباً انگشتریوں کے فروخت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر حکم ہو تو وہ جمیل خاں کو دیدی جائیں۔ فرمانے لگے۔ خدا کا شکر ہے، اُس نے مجھے جامعہ کے قرض سے سبکدوش کر دیا۔ اب خداوند کریم کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ طبیہ کالج کی طرح جامعہ کی مالی حالت بھی مضبوط ہو جائے۔ مجھے ذرا فرصت ملے تو میں جامعہ کے لئے دو چار سفر کروں مجھے خدا سے امید ہے کہ اب جلد جامعہ کی حالت درست ہو جائے گی۔ یہی باتیں کرتے کرتے سو گئے اور ۲۸ ر دسمبر ۲۶ء کی صبح کو ۷ بجے بخیر و عافیت دہلی پہنچے"

غربا اور ضرورتمندوں کا خیال اُن کو ہمیشہ رہتا تھا، ابتدائی زندگی میں جب سیاسی مشاغل سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا، وہ سیکڑوں ضرورتمندوں کی حاجت روائی کیا کرتے تھے، رمضان میں اُن کے دسترخوان پہ سیکڑوں بھوکے روزانہ کھانا کھاتے تھے، محمد اکرام صاحب مرحوم نے جو عرصہ تک اُن کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے، بیان کیا کہ ایک دفعہ

بلی ماراں کے غریب اور ضرورتمند باشندوں کی ایک فہرست تیار کرائی گئی جو خود محمد اکرام صاحب نے تیار کی تھی اور وہ حکیم صاحب کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "مجھے یہ دیکھنا ہے کہ میں تو دو وقت روٹی کھا لیتا ہوں مگر میرے محلہ کے کتنے ایسے انسان ہیں جن کو ایک وقت بھی مل جاتی ہو"

مولوی کفایت اللہ صاحب نے ایک موقعہ پر تحریر فرمایا کہ :-

مجھے تفصیلی حالات تو معلوم نہیں کیونکہ مرحوم تمام داد و دہش بیحد خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ کیا کرتے تھے تاہم جہاں تک ان کے معتمد کارکنوں سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کتنی ہی بیواؤں اور یتیموں کے ماہانہ وظائف اور کتنے ہی غریبوں اور حاجتمندوں کی یکمشت عطیات سے دستگیری ہمیشہ جاری رہتی تھی اور اس میں ماہانہ بڑی گرانقدر رقم خرچ ہو جاتی تھی مگر سوائے اُن کے معتمد کارکنوں یا اُن لوگوں کے جو مستفید ہوتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ بیش قیمت دواؤں کی تقسیم اور غربا کے ساتھ اُن کی ہمدردی معروف و مشہور ہے"

لیکن جو لوگ زیادہ خدمت میں حاضر رہتے تھے وہ داد و دہش کی ان خفیہ ترکیبوں سے کچھ کچھ روشناس ہو گئے تھے۔ مثلاً، دوپہر کو ۲ بجے دس پانچ احباب بیٹھے ہیں، کوئی صاحب آئے حکیم صاحب نے سرو قد اُٹھ کر تعظیم دی۔ دیکھنے والے سمجھے کہ کوئی پرانے دوست آئے ہیں۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو ارشاد ہوا "ذرا بعد مغرب مجھ سے

بل لیجئے گا، وہ بہت خوب کہہ کر چلے گئے۔ شام کو بعد مغرب خاص صحبت احباب ہے کہ وہ حسب الطلب تشریف لائے۔ حکیم صاحب نے اُٹھ کر فرمایا ذرا دوسرے کمرے میں تشریف لایئے، مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، اُن کو لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ واپس آئے تو وہ صاحب اُدھر ہی سے رخصت ہو چکے تھے! دیکھنے والے کچھ نہ سمجھے کہ کون تھے اور کیوں آئے تھے۔ پھر یہ داد دہش روپیہ دو روپیہ یا دس پانچ روپیہ تک محدود نہ تھی، بعض اوقات سیکڑوں اور ہزاروں کی رقمیں اجمل خاں کے ہاتھ سے بہ یک وقت اہل غرض کی جیب میں جاتی تھیں۔ عموماً سفید لفافہ دیا جاتا تھا، آخر زمانہ میں جب بہت عدیم الفرصت ہوتے تھے اور تنہائی اور تخلیہ کے اوقات باقی نہ رہے تھے تو کبھی کبھی کسی ہمرازدار کے ہاتھ سے جو کچھ دینا ہوتا تھا دلوا دیتے تھے۔ اور دل بھر کے دیتے تھے اور دے کر خود ہی شرماتے تھے!! مہینہ کے مہینہ کچھ منی آرڈر بھی بھیجے جایا کرتے تھے، لیکن حسابات میں اُن رقوم کا اندراج نہ ہوتا تھا۔ قرض لینے کی عادت اُن کو کبھی نہ تھی، بلکہ قرض سے بیحد متنفر رہتے تھے، تاہم داد دہش کے لئے قرض لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو قرض بھی لے لیتے تھے!

حکیم صاحب کے محب صادق مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم نے اپنی یادداشت میں اُن کی محبتوں اور وضع داریوں کا یوں ماتم کیا ہے کہ:۔

"دنیا میں آدھی صدی کے زمانے میں کیا کیا تغیرات نہ ہوئے۔ اختلافات وہ پیش آئے جو خرمن محبت کے پھونک دینے کے لئے کافی تھے۔ پہلے ترک موالات کے

زمانہ میں اجمل خاں ایک میدان میں تھے اور میں دوسرے
میں۔ بعض انتہائی نازک موقعوں پر مقابلہ ہو گیا۔ مگر
اجمل خاں! تجھ پر خدا کی رحمت! ان تلخ تجربوں میں
کبھی تیری نگاہ میں تیزی، تیرے لب و لہجہ میں گرمی نہ
پائی، جب ملاقات ہوئی تو وہی اکڈرے والا ایکرنگ
مہربان تھا۔ وہی شیریں کلامی - وہی نگاہ میں موہنی
تھی۔ کاش اس عہد کے لوگوں سے کوئی کہہ دے کہ
سیاسی اختلاف کیسا ہی شدید رہا ہو ہماری نج کی ملاقاتوں
میں سوائے علمی اور محبت کی باتوں کے کبھی کوئی تذکرہ نہ
آیا اس لئے جب ملے انس اور ربط کی فضا میں

اخلاق انسانی کی اس دولت کے ساتھ، اُن کی دماغی فضیلتیں اتنی تھیں کہ بیان نہیں ہوسکتیں ان اوراق میں جا بجا پڑھنے والے اجمل خاں کو اندر سے اور باہر سے دیکھ چکے ہیں اب اُن کے دماغی فضائل پر تبصرہ بالکل فضول اور دور از کار ہے۔

کون نہیں جانتا کہ وہ کس قدر فہم عامہ رکھتے تھے اور کس قدر جلد طویل معاملہ کے اصلی نکتہ کو پا جاتے تھے۔ کتنا ہی اُلجھا ہوا معاملہ ہو تھوڑی سی گفتگو کے بعد حقیقت حال اُن کی گرفت میں آجاتی تھی اور جب وہ نکتہ کو پکڑ لیتے تھے تو پھر اُس کو چھوڑتے نہ تھے۔ صحیح چیز کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ معاملات میں صحیح اُصول سے ہٹ کر کدھر ہی جائیے باقی سب راستے ٹیڑھے ہوں گے۔ ہر لفظ اور ہر رائے جو اُن کی زبان سے

ادا ہوتی تھی اُس پر ہمیشہ فہم عامہ کی مُہر ہوتی تھی اور فہم عامہ ہی اجمل خاں کی دماغی شخصیت کا بہت بڑا وصف تھا۔

چند دوستوں اور بعض نیازمندوں کی زباں سے اُن کی زندگی پر ایک عام تبصرہ پڑھ لیجئے کہ اس کے آگے حد بیان ہے۔

مولانا کفایت اللہ صاحب :۔

اجتماع عقل و حواسس و قوت ممیزہ ایسی تھی کہ تھوڑے سے وقت میں اس قدر مختلف النوع مسائل بہم میں آپ کو غور کرنے اور فیصلہ دینے کی نوبت آتی تھی کہ کوئی اور ہوتا تو وہ ان مشکل اور پیچ در پیچ مسائل کے سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتا جن کے متعلق حکیم صاحب ایسے دانشمندانہ فیصلے صادر فرماتے تھے کہ ان کے فیصلوں سے بہتر کوئی دوسرا فیصلہ نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے بسا اوقات خود دیکھا ہے کہ بعض قومی مسائل کا تذکرہ ہو رہا ہے اور اس میں حاضرین مجلس کے ساتھ خود جناب حکیم صاحب غور و فکر بحث و نظر میں گھنٹوں مشغول رہے ہیں اور تمام حاضرین اس قدر تھک گئے ہیں کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد جب اسی قسم کا کوئی دوسرا غور طلب مضمون پیش ہوا تو حاضرین کے دماغوں نے جواب دے دیا مگر حکیم صاحب مرحوم و مغفور نے اس مضمون کے گوشوں پر بھی اُسی طرح روشنی ڈالی جس طرح شروع کے مضمون پر ڈالی تھی اور

اُن کے اندر گفتگو اور طرز استدلال اور اظہار رائے میں ذرہ بھر تکان یا قلت توجہ کا اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی کئی مضمون سامنے آتے تھے اور حکیم صاحب اُن کو اسی طرح حل فرماتے تھے جس طرح ایک ذی رائے ہوشمند پہلے مضمون کو حل کیا کرتا ہے۔ . . . .

. . . .

حکیم صاحب کے علمی کمالات و فضائل کا نہایت نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ مرتبہ شناس تھے اور ہنر شناسی سے کام لیتے تھے۔ ان کے ہاں یہ بات خاص طور پر نمایاں تھی کہ ان کی نظر بصیرت افروز میں کون شخص کتنی توقیر کا مستحق ہے۔ مجھے بہت سے واقعات کا تجربہ ہے جہاں مسیح الملک مرحوم کی قدر شناسی نے ایسا کام کیا ہے کہ لوگوں کو حیرت ہو گئی۔ خلافت کمیٹی کے آخری وفد حجاز کا جس جلسہ میں انتخاب ہوا تھا اس میں ابتدا سے حکیم صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ارکان کے نام منتخب ہوئے اور صدر وفد کے انتخاب پر غور ہو رہا تھا ایک صاحب نے مولانا شوکت علی کا نام صدارت کے لئے پیش کیا کسی جانب سے مخالفت نہیں ہوئی اور قریب تھا کہ یہ نام منتخب ہو جائے کہ حکیم صاحب جلسہ میں تشریف لائے اُن کے سامنے معاملہ پیش ہوا اور ارکان

کے نام بتائے گئے اور صدارت کا مجوزہ نام بھی لیا گیا
حکیم صاحب نے فرمایا کہ مولانا شوکت علی کی خدمات
کا مجھے صدق دل سے اعتراف ہے اور جب کبھی
مورخ ہندوستان کی تاریخ میں تحریک آزادی
اور جزیرۃ العرب و خلافت اسلامیہ کے لئے ہندوستانی
مسلمانوں کی خدمات لکھے گا تو مولانا شوکت علی کا نام
اس میں نہایت ممتاز اور روشن ہوگا۔ اور اس وفد
کی نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم وفد کی صدارت کے
بھی وہ اہل ہیں مگر میرا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ جس
وفد میں مولانا سلیمان ندوی موجود ہوں اُس کی
صدارت کوئی غیر عالم کرے اس لئے میں تو مولانا
سید سلیمان ندوی کی صدارت پیش کرتا ہوں۔ اس کے
بعد رائے لی گئی اور مولانا سید سلیمان ندوی صدر
منتخب ہوگئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم

آج سے ۴۰ برس پہلے ہندوستان کا قدیمی دارالسلطنت
اپنی ہی گزشتہ عظمت کے خمار میں سرگراں تھا۔ دوسروں
کی داستان کیا سُنتا۔ نئے دور کی چیزیں۔ نئے فیشن
کی باتیں معیوب قرار پاکر قابل رد تھیں۔ مثلاً چائے پینے
والے قدیم شرفا شہر میں شاید ہی دو چار ہوں۔ اخبار
بینی بھی اسی زمرے میں تھی۔ نہ معلوم کیا اسباب تھے

کہ حکیم محمود خاں کے دیوان خانہ سے ایک اخبار
"اکمل الاخبار" کے نام سے جاری تھا۔ اس نام میں
مورث خاندان حکیم اکمل خاں کے نام کی رعایت مستتر
تھی۔ میر فخر الدین مرحوم اس کے مہتمم تھے۔ دارالسلطنت
کی پرانی صحبتوں کی یادگار کے طور پر والد مرحوم کے
نام یہ اخبار آیا کرتا تھا۔ اور میں بچپن سے اس کو پڑھا
کرتا تھا۔ اس لئے اکدرے کے اجمل خاں سے ملنے کے وقت
اکمل الاخبار سے اجنبی نہ تھا۔ اس زمانہ میں مسیح الملک
مرحوم نے اکمل الاخبار اپنے اہتمام میں لے لیا تھا۔
"اکمل الاخبار اجلہا" اس کا ماٹو ٹھیرا۔ اور اس فکر
میں تھے کہ یہ پرچہ اخبار ہو جائے۔ غالباً یہ پہلی مشق
اس سیاسی اکھاڑے کی تھی جس میں مسیح الملک مرحوم
شہ زور بننے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اُس وقت
بھی باوجود گرد وپیش کی نامساعدت کے اخباری مذاق
میرے مرحوم دوست کا مقتضائے وقت کے مطابق
تھا . . . .

. . . . . ابتداہی سے گاندھی جی کے "حکیم جی" میں
وہ اوصاف موجود تھے جن کو آگے چل کر عرب و عجم
نے اور مشرق و مغرب نے دیکھا اور مانا۔ اور چونکہ
یہ اوصاف اس وقت کے ماحول کے بالکل خلاف
تھے اس لئے ماننا پڑے گا کہ فطری جوہر تھے۔ وہ جوہر

کیا تھے (۱) صداقت پروری۔ (۲) ماحول سے متاثر نہ ہونے کی جرأت (۳) بے لاگ صداقت۔ (۴) استقلال و سلامت روی (۵) محبت و ہمدردی۔ یہ بیش بہا اوصاف جس انسان میں جمع ہوں وہ ہر ملک اور ہر قوم کا سرمایہ ناز ہو سکتا ہے۔ اور تمام ملک نے بلا استثنا یہ شہادت دی ہے کہ حکیم اجمل خاں ایسے ہی تھے۔ اللہ پاک اُن کو جوار رحمت میں مقام بخشے''

ریورینڈ اینڈ روز

''منکسر، خاموش، اور باوقار، جیسے کہ ہمیشہ اعلیٰ شخصیت علم اور مذہبی صداقت رکھنے والے لوگ ہوتے تھے، وہ آج شہر دہلی میں ایک مسلمہ اخلاقی سردار کی حیثیت سے نمایاں ہیں جن کے سامنے محض اُن کی شخصیت کی وجہ سے ہر شخص کا سر جھکتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی کے زمانہ میں اور اسی طرح خوشی اور شادمانی کے زمانہ میں، شہر کے غربا ہزاروں کی تعداد میں اُن کے گھر پر جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنے غم اور اپنی خوشی میں ''حکیم صاحب'' کو بھی شریک کر سکیں۔ ۲۲ء سنہ میں یہ افواہ اُڑی کہ وہ گرفتار کئے جانے والے ہیں تو شہر دہلی کے عوام الناس اپنی حد برداشت سے زیادہ مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔ مگر حکیم صاحب غریبوں کے معالجہ اور مفلسوں کی خدمت

میں ہرروز حسب معمول، خاموش اور سنجیدہ اور بے خوف مشغول تھے۔ ان کے دل کے اندر خدا پر بھروسہ اور حق کی فتح کا عقیدہ تھا، سوائے اس کے کچھ نہ تھا۔ میرے لئے ایک ایسے شخص کے متعلق جس سے میں سالہا سال بحیثیت ایک بے تکلف دوست کے محبت کرتا رہا ہوں غیر جانب دارانہ اور بغیر جوش کے کچھ لکھنا بہت مشکل تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اُس زمانہ میں جب مہاتما گاندھی گرفتار ہو چکے تھے ملک نے اُن کا ایسا سچا اور پاک نفس قائم مقام پا لیا۔ اس وقت کوئی شخص (اجمل خاں سے زیادہ) مہاتما کی اسپرٹ کا نمائندہ نہ ہو سکتا تھا۔"

مندرجہ بالا عبارت تین سال ہوئے جب میں نے لکھی تھی۔ مگر حکیم صاحب کی شخصیت اس قدر مضبوط اور پاک ہے کہ آج تین سال بعد بھی میں نے اُن کے متعلق اپنے ایک لفظ کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں صرف اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ ان تین سالوں میں اپنے ملک اور مذہب کی عزت کے تحفظ کے لئے اُن کی استقامت کا وہی حال رہا جو تھا۔ بہت سے موقعوں پر میں اور مہاتما اور وہ ساتھ ساتھ رہے خصوصاً ستمبر ۱۹۲۴ء میں مہاتما کی سخت علالت کے زمانہ میں، پونا اور جوہو کے مقام پر۔ ان دونوں کے درمیان تعلقات

کا زمانہ جس قدر گزرتا گیا محبت بڑھتی گئی۔ یہ دوستی
اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق زیادہ
لکھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک دن مجھے خوب
یاد ہے جب ہمارے دل غم سے مغموم تھے اس لئے
کہ موت کا ہاتھ مہاتما جی کے بہت نزدیک معلوم ہوتا
تھا ان کے دونوں ڈاکٹر۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر
عبدالرحمن نے مہاتما جی سے بہت منت سماجت کی کہ
وہ ۲۱ دن کا فاقہ ترک کر دیں اور بظاہر یہ معلوم
ہوتا تھا کہ اگر فاقہ ترک نہ کیا گیا تو اُس کا نتیجہ مہلک
ہوگا۔ لیکن مہاتما جی کی خاموشی کا دن تھا اس لئے
اُنہوں نے پنسل سے یہ جواب لکھا کہ "خدا پر بھروسہ
کرو تم دعا کی طاقت کو بھول گئے ہو" میں اس موقعہ
پر ڈاکٹروں کے ساتھ موجود تھا اور مہاتما جی کو سمجھا
رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حکیم اجمل خاں بھی آگئے۔ وہ
مہاتما جی کو دیکھنے تنہا اوپر گئے۔ مہاتما جی کی خاموشی کا
دن ختم ہو چکا تھا اور حکیم صاحب اور وہ باتیں کرتے
رہے۔ جب وہ واپس آئے تو حکیم صاحب کا چہرہ
پرسکون اور اطمینان قلب ظاہر ہو رہا تھا۔ یہ معلوم
ہوتا تھا کہ مہاتما جی سے گفتگو کرنے کے بعد اُن کو یقین
ہو گیا ہے کہ مہاتما فاقہ کے اثرات سے زندہ بچ جائیں گے۔
اسی لئے اُنہوں نے مہاتما جی کو فاقہ شکنی پر مجبور نہیں کیا۔

اُس دن شام کو جب میں نے حکیم صاحب کے سکون
و اطمینان کی یہ حالت دیکھی تو مجھے محسوس ہوا کہ خدا
کے فضل پر وہ مجھ سے زیادہ عقیدہ اور بھروسہ رکھتے
ہیں، چنانچہ اُنہوں نے سب سے یہی کہا کہ مہاتما جی سے
روزہ شکنی پر اصرار نہ کیا جائے، اس وقت میرے دل
میں یہ اثر پیدا ہوا کہ حکیم صاحب ٹھیک کہتے ہیں، خدا
پر بھروسہ کرنا چاہیئے"۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کن الفاظ میں حکیم صاحب کی شخصیت
کا خاکہ کھینچوں۔ جس نے میری ہندوستانی تعلیم پر اتنا
گہرا اثر ڈالا۔ حکیم صاحب کی ذات میں میں نے ایک
بڑی شخصیت کا نمونہ دیکھا اس ذات سے مجھے معلوم
ہوا کہ ہندوستان کا دنیا کی قوموں میں کیا مطمح نظر ہے۔
حکیم صاحب مرحوم عالیشان روایات اسلامی کے حامل
تھے۔ میری مراد مغل روایات سے ہے وہ روایات
جنہیں بڑی شخصیتیں پیدا کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔
دہلی میں آکر اُن اسلامی روایات کا امتزاج ہندو
تخیلات سے ہوا اور اس امتزاج نے ایک مفید نتیجہ کی
صورت اختیار کی۔ اس سے اتحاد زندگی کے اس جوہر
کا پتہ چلتا ہے جو تمام قوم کی روح میں سرایت کر گیا
تھا۔ میں عہد مغلیہ کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتا ہوں اتنی
ہی زیادہ مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہ

زمانہ کس طرح ہندو اور مسلم تخیلات کے اتحاد سے دونوں مذاہب کو پاکیزہ تر بنا رہا تھا اور میں نے یہ نظریہ صرف تاریخی کتب کے دیکھنے کی بنا پر قائم نہیں کرلیا ہے۔ بلکہ مجھے اسے دہلی کے چند احباب میں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جن میں حکیم صاحب سب سے بڑے بزرگ تھے لیکن ابھی روایات ختم نہیں ہوئی ہیں بلکہ ڈاکٹر انصاری کی ذات میں قوم نے اپنا قائد ایک ایسے شخص کو مقرر کیا ہے جو ہمیں واقعی آزادی کے اس مامن میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے لئے شاعر (ٹیگور) دست بدعا ہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے اپنے بچپن سے لے کر برابر اس پرانی دہلی کی فضا میں تربیت پائی تھی جس میں ملنساری بھی تھی اور رواداری بھی۔ شان بھی تھی اور شانتی بھی تھی۔ یہی فضا ان کی ابتدائی تربیت کی بنیاد تھی۔ اور اسی نے ان کی سیرت میں عجیب شاندار کیفیت پیدا کردی۔ اس نے انہیں کامل شریف انسان بنایا۔ جسے آگے چل کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر اپنا درماں اور شافی سمجھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں گیا ہوں اور حکیم صاحب مسلسل گھنٹوں تک بیماروں کی نبض دیکھتے رہے ہیں۔ جن میں ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی کی کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ سب سے اپنے عزیزوں کی

طرح پیش آتے تھے، ان میں بعض ہندوستانی عیسائی ہیں جو نیچ ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے انہیں حکیم اجمل خاں کے پاس اس یقین کے ساتھ آتے دیکھا ہے کہ وہ ان کی طرف بھی اسی قدر توجہ کریں گے جتنی وہ اپنے شاہی مریضوں پر کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کو دیکھ کر میرے ذہن میں وہ تصویر آ جاتی تھی جس کے متعلق انجیل میں ذکر ہے۔ "جب شام ہوئی تو اس کے پاس شہر کے تمام مریضوں اور کمزوروں اور ایسے بیماروں کو لایا گیا جو مرض الموت میں گرفتار ہو چکے تھے اور اس نے ان سب کو شفا بخشی"، جب میں حکیم صاحب کے گرد غربا اور مساکین کا ہجوم دیکھتا تھا تو حضرت مسیح علیہ السلام میری نظروں میں پھر جاتے تھے۔

حکیم صاحب کی ہر بات اور ہر ادا میں ایک شان تھی اور کیوں نہ ہوتی یہ ان کے لئے ایک فطرتی امر تھا کیونکہ ان کی زندگی ان کا مذہب اور اُن کی سوسائٹی سب ایک ہی طرح بنے تھے۔ زمانہ کی ہر ہوا اُنہیں اپنے ساتھ نہیں اُڑا لے جا سکتی تھی۔ ان کی زندگی اس شجر کے مانند تھی جس کی جڑیں زمین میں بہت گہری چلی جاتی ہیں ان کے تخیلات کی بنیادیں اپنے ملک کی تہذیب و تمدن کی گہرائیوں میں تھیں۔ وہ سب کچھ جو اسلام اور ہندوستان دے سکتا تھا اُنہوں نے لیا اور یہی نہیں کہ اُنہوں نے اسے اختیار

کرلیا ہو۔ بلکہ اُسے ان کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب :-

وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہو جائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے۔ جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اُس کے کسی ایک شعبہ کا بھی کمال اگر اُس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لئے باعث فخر ہوتا ہے لیکن یہ ایک ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبہ کا کامل نمونہ موجود تھا اور یہ ہی نہیں کہ جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور جدید کی بیداری اس ایک ذات میں آکر مل گئیں تھیں اور افسوس کہ دوسروں میں اس اتحاد کو آنکھیں بے سود تلاش کرتی ہیں کہ پرانوں میں قدامت بے حسی و موت بن گئی ہے۔ نیوں میں جدت نے سطحیت اور اتھلے پن کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پرانے تمدن کی جڑیں ہماری زندگیوں میں اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت چٹان پر پہنچ گئی ہیں جس سے وہ غذا حاصل نہیں کر سکتیں اور جدید تمدن کی مثال ان پھولوں کی سی ہے جو درخت سے توڑے گئے ہیں اور اگرچہ ابھی بہت شاداب نظر آتے ہیں لیکن ان میں

جڑیں نہیں ہیں اس لئے انہیں ثبات بھی نہیں۔
ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی جڑیں تمدن اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر سنے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے تھے۔ ہر شعبہ تمدن میں طب ہو کہ علم سیاست ہو کہ معاشرت۔ مذہب ہو یا فنون لطیفہ ہوں وہ سب میں مقلد بھی تھا اور مجتہد بھی۔ پچھلے جو دے سکتے تھے وہ سب اس نے لے لیا لیکن یہ خیال کبھی ذہن سے نہ ہٹا کہ اگلوں کو کچھ اور دے بھی جائے۔ اُس کی غیور طبیعت کو کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ ماضی کا قرض بلا معاوضہ حال کی گردن پر رہے اس لئے اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر تھی طبیہ کالج کو دیکھو۔ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اُس کے خطبۂ صدارت کو پڑھو، جامعہ ملیہ کے تخیل سے آگاہی پیدا کرو جو مرحوم کے پیش نظر تھا اور جس کی تکمیل کی سعی میں اُن کی آخری سانسیں گزریں تو معلوم ہو گا کہ یہ دماغ محض کسی بڑے طبیب، یا عالم، یا سیاسی آدمی کا دماغ نہ تھا بلکہ ایسا دماغ تھا جو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن سے قدرت مستقبل کی تعمیر کراتی ہے آج اجمل خاں ہم سے جدا نہیں ہوئے ہندوستان اور مسلمانوں کے مستقبل کا سب سے بڑا معمار ہم میں سے اُٹھ گیا۔ پرانی نسل اجمل خاں میں اپنے آخری کامل نمونہ کو رو رہی ہے اور نئی نسل اپنی دنیا کے خلاق اور اپنی ممکنات مضمر کے

ایک تشکیل دینے والے کے لئے نوحہ کناں ہے۔

دنیا میں بڑے بڑے مرنے والے واقعی مرجاتے ہیں، جب ان کا رشتہ صرف ایک نسل سے ہو لیکن ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتہ رکھنے والے نہیں مرتے اور اجمل خاں بھی نہ مرنے والی ہستیوں میں ہے۔

جب موجودہ زمانہ کے فن طب کا بڑا حصہ نامکمل اور ناقص ثابت ہو چکا ہوگا (اور کونسا فن ہے کہ جس کا نقص زمانہ ثابت نہیں کرتا) تو دہلی کے ایک دور افتادہ گوشہ میں ایک طبیہ کالج کے طلبا اور اساتذہ ایک نئے فن طب کی تدوین و تخلیق میں مصروف ہوں گے اور ان کے کالج کے در و دیوار اور خود ان کی زبان پر حکیم اجمل خاں کا نام ہوگا جب "تعلیم جدید" کے حامی اپنی کوششوں کی مضرت سے واقف ہو چکے ہوں گے تو ملک میں متعدد تعلیم گاہیں اور ادارے ایسے ملیں گے جو اپنی کوششوں میں قدیم و جدید کا وہی امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں گے۔ جو اجمل خاں کی زندگی میں نمونہ کے طور پر موجود تھا ملک کے بہت سے خود غرض لیڈر جب قوم کی خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر اور اپنی جیبیں بھر کر اس دنیا سے گزر چکے ہوں گے اور دنیا جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے ان مصلحوں کو بھول چکی ہوگی تو اجمل خاں ہی کے نام لیواؤں میں ایسی جماعت ملے گی جو مسلمانوں میں گھر گھر صحیح تعلیم کی روشنی پہنچائے گی جب

مسلمانوں کو ان کی تعدادی نسبت سے ملازمتیں دلوانے والے
خود بڑی کرسی پر پہنچ کر اپنی اس جد و جہد کو بھول جائیں گے
تو حکیم اجمل خاں کے یاد کرنے والے بھی اس بد نصیب
قوم کو "انکا سب حبیب اللہ" کی بھولی ہوئی یاد دلا کر
ان کی معاشی حالت کو درست کرنے میں ساعی نظر آئیں گے۔
کیوں ؟ اس لئے کہ اجمل خاں کی تحصیل جس قدر وسیع تھی
تعمیر و تخلیق کا جذبہ بھی اتنا ہی ہمہ گیر تھا۔ اور یہی نہیں کہ ان
کی تعمیری جد و جہد محض خیالات کی دنیا میں ہو، انہوں نے
اپنے تمام کاموں کا پورا نقشہ بنیاد کے لئے بھی بنا دیا ہے،
سب کاموں کی بنیادیں وہ اپنے ہاتھ سے رکھ گئے ہیں۔
اور اس کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ نئے معار کمزور ہاتھوں
ہی سے رُک رُک کر اور آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ان بنیادوں
پر وہ عمارت ضرور کھڑی کر دیں گے جو اس معار قومی کی نظروں
میں ہر وقت رہتی تھی اس لئے کہ وہ اپنی زندگی کے نمونہ سے
اپنی محنت سے۔ اپنی نظر کے فیض سے ان معاروں کے دل
میں یقین و ایمان کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے۔
جو لوگ مرحوم سے اپنے کسی جسمانی مرض کا نسخہ لینا چاہتے تھے،
جو کسی ملازمت کے لئے سفارش کے خواہاں تھے، جنہیں اپنے
کسی عزیز کی شادی کے لئے روپیہ درکار تھا، جس بیوہ کی روٹی
مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی، جس یتیم کی تعلیم کے لئے
اس کے خزانہ سے روپیہ آتا تھا، اور ان کی تعداد سینکڑوں

ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی تو افسوس ہزار افسوس کہ ان سے اجمل خاں ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے لیکن طب قدیم کا مجدد اور مسیحا معاشرتی اصلاح و مذہبی رواداری کا علمبردار، قومی تعلیم کا رہنما" اجمل خاں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اس کی مثال پیدا کر سکے گا، لیکن جو اجمل خاں زندہ ہے وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔"

اشاریہ

تصحیح کتابت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ج	۲۱	قبضنہ	قرضہ
۴۵	۱	نشخل	نشخیل
۷۸	۳	آغاخاں پرنس آف ارکاٹ	آغاخاں اور پرنس آف ارکاٹ
۸۴	۲۱	پھر وہ بھی	پھر بھی وہ
۹۱	۴	نسبگی	نسبکی
۱۰۳	۱۸	۱۳سو	۳سو
۱۱۴	۱۲	ال	آل
۱۱۵	۱	طل الکبیر	تل الکبیر
۱۲۴	۲۱	دہشت انگیزیوں	دہشت انگیزوں
۱۲۶	۱۸	لارڈنگ	لارڈ ہارڈنگ
۱۳۲	۱	اوس	اُس
〃	۴	بھینگی	پھینکی
۱۳۴	۱۵	سہے	رہے
۱۳۵	۱۲	باوخود	باوجود
۱۳۶	۱۷	خرب	خوب
۱۴۱	۲۰	اوس	اس
۱۴۵	۱۷	تارگاں	تارکاں
۱۴۷	۹	ہوگئی	ہوگی
۱۵۲	۱۸	ان ہی	ان ہی کی
۱۵۳	۳	جیسے	جسے
۱۶۴	۳	نسمجھ	نسبجھ
۱۶۷	۱۳	محمود حسن	محمود الحسن
۱۷۴	۱۶	سے	سکی
〃	۱۸	غیض	غیظ
۱۸۰	۴	بغیر	تغیر
۱۸۲	۱۳	روڈائر	اوڈائر
۱۸۶	۱۴	ان پر	ان پران
۲۰۰	۱	۵۰۰۰	۵۰۰
۲۰۶	۱۲	نباتات	بیانات
۲۱۱	۱۱	ساعی	حامی
۲۱۱	۱۸	چیز	چیزیں
۲۱۹	۱۹	سکو	سکے
۲۲۱	۱۸	اقتصا	اقتضا
۲۲۸	۱۹	با آزمودہ	نا آزمودہ
۲۲۹	۲۱	کمیٹی بنایا جاتا	کمیٹی کا بنایا جانا
۲۳۳	۱۸	اکتوبر نومبر دسمبر	دسمبر میں
۲۳۷	۱۹	کوسکے گا	کرسکے گا
۲۴۵	۱۸	یہ اعلان	بہ اعلان
۲۵۱	۴	نہ وہ	کہ وہ
〃	۱۰	انتہا	تنہا
۲۵۷	۱۳	کی	سکے
۲۶۸	۲۰	لائیڈ جارج	جارج لائیڈ
۲۷۵	۱۲	شرچشمہ	سرچشمہ
۲۷۸	۱۶	بات ستی	بات سنتی
۲۸۳	۱۴	جاتی تھی	جارہی تھی
۲۹۰	۳	ودھاں	ودھوان
۲۹۲	۵	کم لوگوں یہ	کم لوگوں کو یہ
۳۰۷	۹	سنہ ۲۲	سنہ ۲۴ء
۳۲۰	۹	داتوں	دائوں
۳۲۷	۴	آہنگی	ہم آہنگی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲۷	۲۱	کہ	×
۳۳۶	۸	التحضریہ	التحضیریہ
۳۳۹	۴	نہادرشاہ	نہاد رشاد
۳۴۴	۹	تجرہ	تجربہ
〃	۱۸	ڈنر	ڈنّر
۳۴۸	۷	ناشتر	ناشتہ
〃	۲۰	ہم" دوکا "کا	ہم دوکا
۳۵۳	۱۲	سئے	کے
〃	۱۷	دوسرے	دوسری
۳۵۷	۳	بیں	ہیں
۳۵۹	۷	سلامی	اسلامی
〃	۷	سلام	اسلام
۳۶۳	۷	ہیں ہیں	ہیں
〃	۱۶	ولیٰ	الیٰ
۳۶۶	۳	تین طرح کے نمائندے	تین نمائندے
۳۶۶	۸	شان شایاں	شایان شان
۳۷۱	۱۷	طور	طور پر
۳۷۵	۱۵	جسے	جس سے
۳۸۹	۱۸	خیر	چیز
۳۹۰	۱۳	جاری تھا جوری	جاری تھا کہ جوری
۳۹۱	۷	طیارہ	تیارہ
۳۹۲	۱۸	مقدمہ	مقدسہ
۳۹۳	۱۰	انلیر	انگیز
۳۹۴	۵	ہزہائنس مہارانی	ہرہائنس مہارانی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۹۵	۱۷	ہمیں	میں
۳۹۷	۷	اسے	اس سے
۳۹۸	۱۱	ہندو اتحاد	ہندو مسلم اتحاد
۴۰۴	۱۷	نوچینجر	نوچینجرس
۴۰۵	۲۱	سوراجیوں	سوراجیوں کی
۴۰۶	۲	ہوجانے کے بھی	ہوجانے کے بعد بھی
۴۱۰	۲۱	مرہون منت ہوتا	مرہون منت ہوگا
۴۱۶	۷	دور کے	دور کی
۴۱۸	۷	ناپند دیدہ	ناپسندیدہ
۴۲۹	۸	عبدالمجید	عبدالحمید
۴۳۲	۳	بنیا	بینیا
۴۳۴	۸	غیض	غیظ
۴۳۹	۵	ڈالیں گے	ڈالیں گی
۴۵۳	۲	نم	تم
۴۵۴	۸	اوالعزم	اولوالعزم
۴۶۱	۲۰	کس	کسی
۴۶۳	۷	۲۵ دسمبر	۲۹ دسمبر
۴۶۹	۱۰	ہے	ہیں
۴۸۳	۱۴	بکلولس	بکلوس
۴۸۴	۱۵	بتنظر	منتظر
۴۹۴	۲	ملطفت	ملتفت
۴۹۵	۴	مزاج	مزاح
۴۹۹	۱۶	مرحوم نے بھی نے	مرحوم نے بھی
۵۰۹	۱۴	الوالعزمی	اولوالعزمی
۵۱۶	۱۰	ہتے تھے	رہتے تھے

DUE DATE